زندگی بے بندگی شرمندگی

(۴)

نفس کا تزکیہ

بنتُ الاسلام

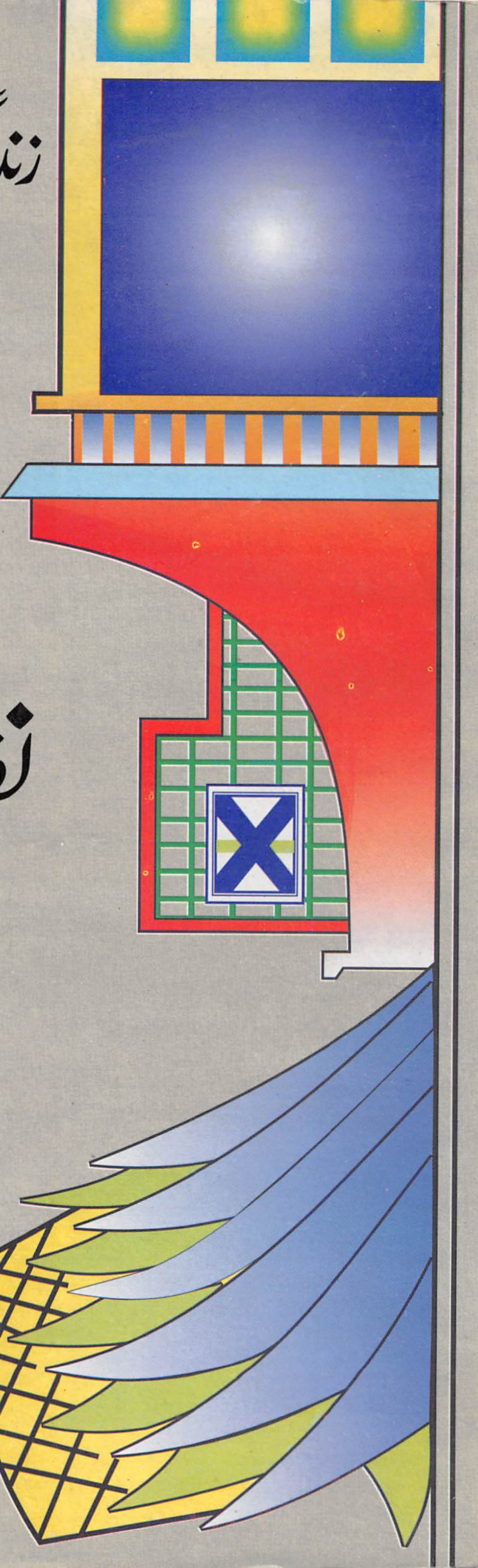

زندگی بے بندگی شرمندگی

حصہ چہارم

نفس کا تزکیہ

بنت الاسلام

ادارہ بتول

سید پلازہ، 30 فیروز پور روڈ، لاہور

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

ناشر .... ادارہ بتول، لاہور
نام کتاب .... نفس کا تزکیہ
مطبع .... کیووائی پریس
باراوّل ۱۹۷۶ء
بائیسویں ۲۰۰۹ء

قیمت-/۱۰۰ روپے

ترتیب

پیش لفظ 5

تزکیہ نفس کا مفہوم، اہمیت اور تاکید 8

تزکیہِ نفس کا مفہوم 9

اعمالِ بد کی دنیوی سزائیں 16

نیک اعمال کی دنیوی جزا 32

تزکیہِ نفس کی تاکید 45

خرابیِ نفس کے اسباب 53

غفلت 54

حبِ دنیا اور حبِ خواہشات 71

عبرت پذیری کا فقدان 85

برا ماحول 110

تزکیہِ نفس کے لیے عملی جدوجہد 124

محاسبہِ نفس 125

ندامت، توبہ اور استغفار 147

ضبطِ نفس 169

زبان کی حفاظت 189

دُ حرص دنیا کی محبت

نیک صحبت 215

احساسِ جوابدہی 223

تبلیغِ دین 240

متفرقات 245

احتیاطیں 246

مومن 262

حرفِ آخر 269

تزکیۂ نفس کے لیے دعائیں 277

* * *

پیش لفظ

یہ کتاب ''نفس کا تزکیہ'' اپنے سلسلے کی چوتھی کتاب ہے۔ اس سے پہلے اس سلسلے کی تین کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن کے موضوعات حسبِ ذیل ہیں۔

1- آخرت

2- حبِ الٰہی

3- داعی کے اوصاف

موجودہ کتاب کے بعد پانچویں تصنیف ''اسلامی عبادات'' کے بارے میں ہوگی اور اس کے بعد یہ سلسلہ انشاءاللہ اور آگے چلے گا۔

اس سلسلہ کتب کے لیے جتنے موضوعات چنے گئے ہیں، ان میں شاید کوئی موضوع بھی ایسا نہیں جس پر اعلیٰ پائے کی کتب لکھی نہ جا چکی ہوں۔ اس کے باوجود ان کتابوں کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ عام فہم انداز میں ایک ایسا سلسلہِ کتب درکار تھا جنہیں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہی نہیں بلکہ کم تعلیم یافتہ بھی اچھی طرح سمجھ سکیں۔ پھر یہ ضرورت صرف کم تعلیم یافتہ لوگوں ہی کے لیے نہیں بلکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں میں بھی بے شمار ایسے ہیں جن کا عربی زبان اور اسلامیات کا علم بس واجبی سا ہی ہے۔ لہٰذا اگر انہیں اسلام سے تعلق رکھنے والی کوئی ایسی

کتاب دی جائے جس میں عربی' فارسی الفاظ اور تراکیب بہت زیادہ ہوں' مختلف اسلامی علوم سے تعلق رکھنے والی اصطلاحات کی بھرمار ہو اور پیرایہ بیان بہت زیادہ عالمانہ اور مشکل ہو تو نہ وہ اسے پورے طور پر سمجھ پاتے ہیں نہ انہیں اس میں دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ پھر وہ کتاب سے پورا اثر بھی نہیں لیتے' نہ ان کے دل میں یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ دین اسلام سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے مزید مطالعہ کریں۔

لہٰذا کم تعلیم یافتہ لوگ ہوں یا وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ' جن کی دینی علوم کی معلومات کم ہیں۔ دونوں کو ایسی دینی کتب کی ضرورت ہے جن میں زبان اور پیرایہ بیان صاف' واضح' عام فہم اور دلچسپ ہو' جو انہیں دینی احکام ہی نہ بہم پہنچائیں بلکہ ان کے دل میں دین کی محبت بھی پیدا کریں اور اس کی سربلندی کے لیے کچھ کر گزرنے کا جذبہ بھی ابھاریں۔

اسی مقصد کے حصول کی خاطر اس سلسلہ کتب کو شروع کیا گیا ہے اور اسی کی خاطر اس میں چند اصولوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ ان میں پہلا اصول تو یہی ہے کہ ہر موضوع پر تبصرہ کرتے وقت اس بنیادی مقصد کو نگاہ میں رکھا جائے کہ پڑھنے والوں کے دل میں خدائے بزرگ و برتر' اس کے برگزیدہ رسولؐ اس کے مکرم دین اور اپنے مسلمان بہن بھائیوں کی سچی الفت اور آخرت کی جواب دہی کا احساس پیدا ہو اور وہ ان جاہلی اثرات سے بچیں جو تہہ بہ تہہ اندھیروں کی طرح چھائے جا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ بیان کی وضاحت کا بھی دھیان رکھا گیا ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ لمبی چوڑی فلسفیانہ بحثوں اور تقریروں سے بچا جائے اور جو کچھ بھی کہا جائے قرآن' حدیث اور سلف صالحین کی زبان میں کہا جائے اور اپنی زبان حتی الامکان کم استعمال کی جائے۔

اس وقت عالم اسلام جس ابتلاء کے دور میں سے گزر رہا ہے اس نے دلوں کے چین کو ختم کر دیا ہے۔ چین اگر ہے تو صرف دو چیزوں میں۔ ایک خدائے رؤف و رحیم کے

آئے دعا و التجا اور دوسرے کوئی ایسا کام جس سے خدا کے دین کو خدا کی مخلوق میں زیادہ سے زیادہ پھیلانے میں مدد ملے اور اپنا ایمان یہی ہے کہ یہی دو چیزیں اس ابتلاء کو دور بھی کر سکتی ہیں جس میں سے ہم گزر رہے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ کوئی انسان بھی کسی دوسرے انسان کا دل نہیں بدلا سکتا۔ دل بدلانا تو اللہ رب العلمین کا کام ہے۔ ہاں اس نے انسان کو حکم دیا ہے کہ وہ کوشش کرے اور یہ سلسلہ کتب بھی ایک کوشش ہے۔ جس برتر ہستی نے کوشش کرنے کا حکم دیا ہے اسی سے التجا ہے کہ وہ اس کو قبول بھی فرمائے۔ آمین۔

بنت الاسلام

* * *

تزکیہِ نفس کا مفہوم

اھمیت

اور

تاکید

تزکیہِ نفس کا مفہوم

حضرت ابوذر غفاریؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خدائے بزرگ وبرتر ارشاد فرماتا ہے:

اے میرے بندو! میں نے ظلم کو اپنے اوپر حرام کیا ہے اور اسے تمہارے درمیان بھی حرام کر دیا ہے، پس ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔

اے میرے بندو! تم سب بے راہ ہو مگر جس کو میں سیدھی راہ پر چلاؤں، پس مجھ سے ہدایت مانگو، میں تمہیں ہدایت دوں گا۔

اے میرے بندو! تم سب بھوکے ہو مگر جس کو میں کھانا کھلاؤں۔ پس تم مجھ سے کھانا مانگو، میں تمہیں کھلاؤں گا۔

اے میرے بندو! تم سب عریاں ہو، مگر جس کو میں پہناؤں۔ تم مجھ سے لباس مانگو، میں تمہیں پہناؤں گا۔

اے میرے بندو! تم سب رات دن خطائیں کرتے ہو اور میں سب کے گناہ بخشنے والا ہوں۔ تم سب مجھ سے بخشش مانگو، میں تمہیں بخش دوں گا۔

اے میرے بندو! تم مجھے کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتے کہ مجھے ضرر پہنچاؤ، نہ تم مجھے کوئی نفع پہنچا سکتے ہو کہ مجھے نفع پہنچاؤ۔

اے میرے بندو! اگر اول سے آخر تک سب انسان اور جن تم میں سے سب سے

زیادہ متقی دل والے آدمی کی طرح ہو جائیں تو اس سے میری بادشاہت میں کچھ بڑھ نہیں جائے گا۔

اے میرے بندو! اگر اول سے آخر تک سب انسان اور جن تم میں سے سب سے زیادہ بدکار دل والے آدمی کی طرح بن جائیں تو اس سے میرے ملک میں کوئی نقص واقع نہیں ہوگا۔

اے میرے بندو! اگر اول سے آخر تک سب انسان اور جن ایک میدان میں جمع ہو جائیں اور مجھ سے (اپنی مرادیں) مانگیں اور میں ہر ایک کی مرادیں پوری کر دوں تو اس سے میرے خزانوں میں سے اس سے زیادہ کم نہیں، ہو سکتا جتنا کہ سوئی کو دریا میں داخل کر کے نکال لینے سے (دریا کا پانی کم ہوتا ہے)

اے میرے بندو! یہ تمہارے اعمال ہیں جنہیں میں تمہارے ہی لیے گن گن کر رکھتا ہوں اور پھر تمہیں وہ پورے پورے دوں گا۔ پس جو بھلائی پائے وہ خدا کی حمد کرے اور جو اس کے سوا پائے وہ اپنے آپ ہی کو ملامت کرے۔ (مسلم)

اس حدیثِ قدسی کے آخر میں جس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ لوگوں کے نیک بن جانے سے اللہ تعالیٰ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا اور لوگوں کے بد بن جانے سے اس کی سلطنت میں کوئی نقص واقع نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود جو وہ انسان کو بار بار حکم دیتا ہے کہ گناہوں سے بچو اور نیکیاں اختیار کرو، تو یہ خود انسان ہی کے فائدے کی خاطر ہے تاکہ انسان ہلاکت اور خسارے سے بچ جائے اور اپنے لیے زیادہ سے زیادہ اچھے اجر کو حاصل کر لینے کا بندوبست کر لے۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

”یہ تمہارے اعمال ہیں جنہیں میں تمہارے ہی لیے گن گن کر رکھتا ہوں اور پھر وہ تمہیں پورے پورے دوں گا۔“

عربی زبان میں تزکیہ کا لغوی مفہوم یہ ہے کہ کسی شے کو صاف ستھرا بنایا جائے اور اس کو نشو ونما دے کر پروان چڑھایا جائے اور اصطلاح میں تزکیہ کا مطلب یہ ہے کہ اپنے آپ کو غلط رجحانات، میلانات اور اعمال سے ہٹا کر نیکی اور خدا ترسی کی راہ پر ڈالا جائے۔ اس تعریف کی رو سے تزکیۂ نفس کی مہم قدرتی طور پر دو حصوں میں بٹ جاتی ہے۔

1- اپنا محاسبہ کر کے دیکھنا کہ ہم میں کیا کیا برائیاں ہیں اور پھر انہیں دور کرنے کی کوشش کرنا۔

2- اپنا محاسبہ کر کے دیکھنا کہ ہم میں کیا کیا اچھائیاں نہیں ہیں اور پھر انہیں اپنے اندر پیدا کرنے کے لیے جدوجہد کرنا۔

جو عقل مند شخص اس مہم کا بیڑا اٹھالے کہ اپنے نفس سے برائیاں دور کروں اور اس میں اچھائیاں پیدا کروں، اس کے لیے سب سے زیادہ غور طلب امر یہی ہو جاتا ہے کہ وہ کون کون سے اعمال ہیں جو مجھے اس مہم میں کامیاب ہونے میں امداد دے سکتے ہیں اور وہ کون کون سے افعال ہیں جن کو اگر چھوڑا نہ گیا تو یہ مہم کبھی بھی سر نہ ہو سکے گی۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہہ لیجئے کہ جو شخص اپنے نفس کا تزکیہ کرنے کا خواہشمند ہو گا، اس کی سب سے بڑی سوچ یہی ہو گی کہ کیا کروں کہ گنہگار نفس گناہوں کے بے پناہ نقصانات کا صحیح احساس کر کے اس سے متنفر ہو جائے۔

اور کیا کیا قدم اٹھاؤں کہ غافل دل نیکیوں کے لامحدود فوائد اور برکات کو بچشمِ سر دیکھ کر اس کی طرف بے باکانہ لپکے۔

واضح رہے کہ انسانی نفس ان اعمال کو ہمیشہ بے فائدہ اور لاحاصل سمجھتا ہے۔ جن کے فوائد اس کے ذہن نشین نہ ہوں۔ اس لیے تزکیہ نفس کا خیال بھی صرف اسی شخص کے دل میں آ سکتا ہے، جسے اچھی طرح پتہ چل چکا ہو کہ برائیاں میرے لیے ہلاکت خیز اور اچھائیاں

میرے لیے فائدہ مند ہیں۔ اس لیے انسان کے لیے پہلی ضروری بات تو یہی ہے کہ اسے قلبی یقین حاصل ہو جائے کہ خدا نے مجھے جن باتوں سے روکا ہے، ان سے اسی لیے روکا ہے کہ وہ مجھے ہلاک کرنے والی ہیں اور جن کے کرنے کا حکم دیا ہے، وہ ہیں ہی ایسی کہ مجھے دنیوی اور اخروی دونوں سعادتوں سے ہمکنار کرنے والی ہیں --- یعنی اسے اپنے خالق و مالک کی شفقت و محبت پر پورا سچا قلبی یقین ہو چکا ہو اور اس کا ایمان ہو کہ وہ رؤف و رحیم ہادی صرف میرے ہی فائدے کی خاطر مجھے زہر کھانے سے رکے رہنے اور آبِ حیات پینے کا حکم دے رہا ہے۔

علامہ اقبالؒ اپنے ایک خط میں، جو انہوں نے خان محمد نیاز الدین خاں کو لکھا، تزکیہ نفس کے بارے میں فرماتے ہیں:

”...... اسلامی نقطہ خیال سے تزکیہ نفس کا مقصد محض ازدیادِ یقین واستقامت ہے ......“

حضرت علیؓ فرماتے ہیں: ”خدا تعالیٰ نے اطاعت پر ثواب اور گناہ پر عذاب قرار دیا ہے تاکہ اپنے بندے کو قہر و غضب سے بچا کر جنت کی طرف بھیج سکے۔“

ذرا غور کیجئے کہ انسان کو اپنی معمولی سی تخلیق بھی کتنی پیاری ہوتی ہے۔ کجا اس خالق اکبر کی اتنی نادر تخلیق یعنی انسان --- اس موجدِ اعظم کو تو اپنی یہ ایجاد اتنی پیاری ہے کہ وہ خود فرماتا ہے:

مَنْ جآء بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ خَيْرٌ مِّنْهَا	”جو کوئی بھلائی لے کر آئے گا اس کے لیے اس سے بہتر بھلائی ہے۔
وَمَنْ جَآء بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ (القصص : ۸۴)	اور جو برائی لے کر آئے گا، تو برائیاں کرنے والوں کو ویسا ہی بدلہ ملے گا جیسے عمل وہ کرتے تھے۔“

حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بزرگ و برتر رب کے بارے میں بیان فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نیکیاں اور بدیاں لکھ دی ہیں اور پھر اس طرح ان کی وضاحت فرمادی ہے کہ جس شخص نے کسی نیکی کا ارادہ کیا، مگر ابھی اس پر عمل نہیں کیا تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے ایک پوری نیکی لکھ دیتا ہے اور اگر اس نے نیکی کا ارادہ کیا اور پھر اسے عملاً کر بھی لیا تو اللہ اس کے لیے دس نیکیوں سے لے کر سات سو گنا تک بلکہ مزید بہت گنا لکھ لیتا ہے اور جس نے کسی برائی کا ارادہ کیا، پھر اس پر عمل نہ کیا تو اللہ تعالیٰ اس کو بھی اس شخص کے لیے اپنے ہاں ایک پوری نیکی لکھ لیتا ہے اور اگر اس نے برائی کا ارادہ کیا اور پھر اسے عملاً کر بھی لیا تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے صرف ایک ہی برائی لکھتا ہے۔ (بخاری)

جس رحیم و کریم کو اپنی مخلوق اتنی پیاری ہے کہ وہ اس کی ایک نیکی کا سات سو گنا اجر دیتا ہے اور برائی کا قصد کر کے اس پر عمل نہ کرنے کو بھی اس کے حق میں نیکی قرار دیتا ہے، وہ کیسے برداشت کر سکتا ہے کہ اس کے بندے دنیوی اذیتوں اور اخروی عذاب کا شکار ہوں۔

پھر ہم یہ بھی مانتے ہیں کہ کسی مشین کا ماہر ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کے کل پرزوں کو درست رکھنے کے لیے کون سا تیل مفید ہوگا اور کون سا انہیں درست رکھنے کے بجائے ان کا ستیاناس کر دے گا۔ لہٰذا انسان کو خلق کرنے والے ہی کو ٹھیک معلوم ہے کہ انسان کے لیے کون کون سے اعتقادات، نظریات، جذبات، میلانات اور اعمال مفید ہیں اور کون کون سے اسے تباہی کے گڑھے میں گرانے والے ہیں۔ چنانچہ رحمت و رافت کے باعث اس نے انسان کے لیے مفید ثابت ہونے والے اعتقادات و اعمال کا نام ''نیکی'' رکھ دیا اور اسے اختیار کرنے کا حکم دیا اور مضر ثابت ہونے والے اعتقادات و اعمال کو ''بدی'' سے موسوم کیا۔

اور انہیں حرام قرار دے دیا۔

پھر اپنی شفقت و محبت کی انتہا ہی کے باعث اس نے ترغیب و ترہیب سے بھی کام لیا اور بار بار انسان کو یاد دلایا کہ اگر وہ نیکی کی راہ اختیار کرے گا، تو اسے وہ راحت و سکون، آرام و آسائش اور شان و شکوہ کے سامان عطا کیے جائیں گے، جنہیں:

”......نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سنا، نہ کسی بشر کے دل میں (ان کا) خیال گزرا۔“ (بخاری)

اور اگر وہ بدی کی راہ پر چلے گا، تو سب سے زیادہ ہلکا عذاب جو اسے ملے گا، وہ یہ ہوگا کہ اس کی:

”......چپلیں اور ان چپلوں کے تسمے آگ کے ہوں گے۔ ان کی گرمی سے اس کا دماغ اس طرح کھولے گا اور جوش مارے گا، جس طرح چولہے پر دیگ کھولتی ہے......“ (مسلم)

ایک دفعہ کلام پاک کو شروع سے لے کر آخر تک پڑھ جائیے اور دیکھئے کہ کس طرح ان گنت بار اللہ تعالیٰ نے انسان کو نیک اعمال کا شیریں انجام بتایا ہے اور برے اعمال کے انجامِ بد سے ڈرایا ہے حالانکہ انسان کے نیک بن جانے سے اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا اور اس کے بد بن جانے سے اسے کسی نقصان کا خدشہ نہیں۔ جیسے کہ اس نے خود ہی فرما دیا ہے:

”......اگر اول سے آخر تک سب انسان اور جن تم میں سے سب سے زیادہ متقی دل والے آدمی کی طرح ہو جائیں تو اس سے میری بادشاہت میں کچھ بڑھ نہیں جائے گا۔

اگر اول سے آخر تک سب انسان اور جن تم میں سے سب سے زیادہ بدکار دل والے آدمی کی طرح بن جائیں تو اس سے میرے ملک میں کوئی نقص واقع نہیں ہوگا......“

لہٰذا اللہ تعالیٰ کا انسان کو بار بار نیکی کے شیریں اور برائی کے تلخ انجام کی خبر دینا

اسی لیے ہے کہ انسان دنیا کی اذیتوں سے بھی بچے اور آخرت کے عذاب سے بھی اور دنیا میں بھی سکونِ قلب، عزت واحترام، خوشحالی و کامرانی حاصل کرے اور آخرت میں بھی ابدی فوز و فلاح کا مستحق ہو۔

حضرت علیؓ کا فرمان ہے: ''جو شخص برائی کا نقصان نہیں جانتا، وہ اس کے واقع ہونے سے نہیں بچ سکتا اور جو بھلائی کا فائدہ معلوم نہیں کرتا، وہ اس کے کرنے پر قادر نہیں ہوتا۔''

واضح رہے کہ کلامِ الٰہی، احادیثِ نبویؐ اور سلف صالحین کے اعمال و اقوال ہمارے لیے ہمہ وقت یہ بندوبست کیے رہتے ہیں کہ ہم برائی کے نقصانات کو جان لیں اور بھلائی کے فوائد معلوم کر لیں۔ بشرطیکہ ہم تزکیہ نفس کے ان ماخذوں کی طرف طلبِ صادق کے ساتھ رجوع ہوں اور عزمِ صادق کے ساتھ ان پر عمل پیرا ہونے کی جدوجہد کریں۔

جہاں تک برائی کے اخروی عذاب اور نیکی کے اخروی ثواب کا تعلق ہے کوئی عام انسان دوسری دنیا میں جا کر واپس نہیں آیا کہ آ کر وہاں کے چشم دید حالات بتاتا۔ لہٰذا ہمیں انہیں معلومات پر بھروسہ کرنا ہوگا، جو خدا کے انبیاءؑ نے ہم تک پہنچائیں اور خدا کے انبیاءؑ تاریخِ انسانی میں سب سے زیادہ سچ بولنے والا گروہ تھے، مگر جہاں تک برائی اور نیکی کے دنیوی عذاب و ثواب کا تعلق ہے وہ تو ہم خود بھی دیکھ سکتے ہیں، بشرطیکہ چشم عبرت حاصل ہو قوموں، جماعتوں اور افراد کی زندگی کا عروج و زوال اور نیک نامی اور رسوائی کی تاریخ پکار پکار کر بتا رہی ہے کہ بداعمالیوں نے انسان کو اس دنیا میں بھی جان لیوا مشکلات اور اذیتوں کا شکار بنا دیا اور نیکوکاری اور خدا ترسی نے انسان کو اس عالم آب و گل میں بھی عروج، نیک نامی، رزق کی فراوانی اور سکونِ قلب کی دولتوں سے نوازا۔

* * *

اعمالِ بد کی دنیوی سزائیں

انسان کی نہ ختم ہونے والی زندگی تو اس کی اخروی زندگی ہی ہے اور کامیابی درحقیقت وہی ہے جو اس زندگی میں ملے۔ تاہم موجود دنیوی زندگی عارضی ہونے کے باوجود محسوس ہے اور آخرت دائمی ہونے کے باوصف غیر محسوس ہے اور انسان جب تک اس عالمِ آب وگل میں محصور ہے اس کا محسوس سے زیادہ متاثر ہونا ایک لازمی امر ہے۔ لہٰذا یہ دیکھنا ضروری ہے کہ نیکوکاری اور بداعمالی اس محسوس زندگی میں کیا نتائج پیدا کرتی ہیں۔

انسانی تاریخ میں ان گنت قوموں نے عروج حاصل کیا اور پھر ایک عرصے کے بعد زوال سے ہمکنار ہوگئیں اور کوئی قوم ایسی نہیں گزری جس کے زوال میں خود اس قوم کے اپنے افراد کی بدکرداریوں کا ہاتھ نہ ہو۔ کبھی ایسے نہیں ہوا کہ کسی قوم کا ایمان اخلاق اور معاملات درست حالت میں ہوں اور پھر بھی وہ آسمانی یا زمینی عذابوں کی لپیٹ میں آجائے۔ بلکہ کسی اچھی قوم کے تھوڑے سے لوگوں کی بدکرداریاں بھی اس قوم کو تباہی کا شکار نہیں بناتیں۔ تباہی جب بھی آتی ہے، اسی وقت آتی ہے جب اس قوم کی اکثریت بدکردار ہوچکی ہو۔ سورۃ الانفال آیت 53 میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔

ذَالِکَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ یَکُ	"یہ اس لیے ہے کہ اللہ کسی نعمت کو جو اس نے
مُغَیِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰی قَوْمٍ	قوم کو عطا کی ہو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک
حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ......	کہ وہ قوم خود اپنے طرزِ عمل کو نہیں بدل دیتی۔"

ایسے ہی سورۃ الروم، آیات ۹ تا ۱۰ میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

''اور کیا یہ لوگ کبھی زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ انہیں ان لوگوں کا انجام نظر آتا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں۔ وہ ان سے زیادہ طاقت رکھتے تھے۔ انہوں نے زمین کو خوب ادھیڑا تھا اور اسے اتنا آباد کیا تھا جتنا ان لوگوں نے نہیں کیا ہے۔ ان کے پاس ان کے رسول روشن نشانیاں لے کر آئے۔ پھر اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہ تھا بلکہ وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے۔''

سورۂ الروم' آیت ۴۱ میں انسانوں کی بد اعمالیوں کے باعث دنیا میں فساد پھیل جانے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

''خشکی اور تری میں فساد برپا ہو گیا ہے' بہ سبب اس کمائی کے جو لوگوں کے اپنے ہاتھوں نے کی ہے (ایسا اس لیے ہوا ہے) تا کہ اللہ انہیں ان کے بعض اعمال (کی سزا) کا مزا چکھائے شاید کہ یہ لوگ (نیکی کی طرف) لوٹ آئیں۔''

سورۂ یونس' آیت ۱۳' ۱۴ میں بھی ایسے ہی تنبیہ کی گئی ہے:

''لوگو' تم سے پہلے کی قوموں کو (جو اپنے اپنے زمانے میں برسرِ عروج تھیں) ہم نے ہلاک کر دیا (اور ایسا اس وقت ہوا) جب انہوں نے ظلم کی روش اختیار کی ان کے رسول ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے مگر انہوں نے ایمان لا کر ہی نہ دیا۔ اس طرح ہم مجرموں کو ان کے جرائم کا بدلہ دیا کرتے ہیں۔ اب ان کے بعد ہم نے تم کو زمین میں ان کی جگہ دی ہے تا کہ دیکھیں کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔''

سورہ الانفال' آیت ۳۸ میں بیان ہوا ہے:

''(اے نبیؐ) ان کافروں سے کہہ دیں کہ اگر اب بھی باز آ جائیں تو جو کچھ پہلے ہو چکا ہے اس سے درگذر کر لیا جائے گا۔ لیکن اگر یہ اسی پچھلی روش کا اعادہ کریں گے تو گزشتہ قوموں کے ساتھ جو کچھ ہو چکا ہے' وہ سب کو معلوم ہے (ویسا ہی سلوک ان کے ساتھ بھی ہو گا)''

کلام پاک میں کئی جگہ پرانی بدکردار قوموں پر آنے والے عذاب کا ذکر موجود ہے۔ جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ برے اعمال آخرت کی سزا تو لاتے ہی ہیں۔ خود اس دنیا میں بھی تباہی اور بربادی لانے کا سبب بن جاتے ہیں۔

یہاں ایک بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ بداعمالیوں کی سزا صرف ان عذابوں ہی کی شکل میں نہیں ملتی جن کا عذاب ہونا صاف نظر آ رہا ہوتا ہے بلکہ اس کی ایک شکل وہ انواع واقسام کی کمزوریاں بھی ہوتی ہیں جو کسی بدعمل قوم میں بتدریج پھیلتی چلی جاتی ہیں اور انجام کار اسے خِزیٌ فِی الدُّنیا کا شکار بنا دیتی ہیں۔

جب کسی قوم کے لوگ فسق وفجور کے عادی ہو جاتے ہیں تو ان کے گھروں کا امن چین رخصت ہو جاتا ہے۔ باہمی اعتماد کی فضا ختم ہو جاتی ہے' وہ جان لیوا اور اذیت دہ بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں اور ان کا پیسہ اور ان کا وقت ملک وملت اور حقدار متعلقین پر صرف ہونے کے بجائے خواہشاتِ نفس کو پورا کرنے پر ضائع ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ پھر انفرادی طور پر وہ سچی خوشیوں سے محروم ہو جاتے ہیں اور اجتماعی طور پر وہ قوم کی ترقی کا باعث بننے کے بجائے اس کے تنزل اور بربادی کا سبب بن جاتے ہیں۔

کتنے ہی نفسانی خواہشات کے غلام ایسے ہوئے جنہوں نے دوسری قوموں کے سامنے اپنا کردار اتنا گھناؤنا پیش کیا کہ اپنی قوم کو اہلِ دنیا کی نگاہوں میں ذلیل ورسوا کر کے رکھ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کے دلوں سے اس قوم کا احترام بھی نکل گیا اور رعب بھی۔ اور پھر چونکہ وہ خود بھی اسی قوم کے افراد تھے۔ قوم کے رسوا ہو جانے کے باعث وہ خود انفرادی طور پر بھی حقارت و ذلت کا نشانہ بنے۔

کئی دولت کے بندے ایسے گزرے کہ دنیاوی مال ومتاع حاصل کرنے کی حرص میں ملک وقوم کو بیچ دینے سے بھی دریغ نہ کیا اور پھر جب ملک وقوم بک گئے تو پھر یہ صرف ملک وقوم ہی کی غلامی نہ تھی بلکہ ملک وقوم کو غلامی میں دینے والے یہ غدار بھی غلام تھے

کہلائے اور اکثر و بیشتر ایسے ہوا کہ یا تو ان کے آقانِ ولی نعمت نے، جن سے ساز باز کر کے انہوں نے ملک و قوم سے غداری کی تھی، انہیں کیفرِ کردار تک پہنچا دیا، یا پھر وہ اپنے مظلوم ہم وطنوں کے غیظ و غضب کا شکار ہو گئے اور اگر ان میں سے کوئی زندگی میں اس انجام سے بچ بھی گیا تو پھر بھی آخر کار موت کا شکار ہو کر قبر میں مدفون ہوا اور پھر جو دعائیں اسے پیچھے سے بھیجی گئیں، وہ یہ تھیں کہ تاریخ نے ہمیشہ اسے غدار کا خطاب دیا، عوام نے ہمیشہ اس پر لعنتیں بھیجیں اور وہ ابدالآباد تک کے لیے ذلت و رسوائی کا شکار ہو گیا۔

کئی جاہ کے حریصوں کو حب جاہ نے ایسا بے قرار کیا کہ اپنی لیڈری کی دکان چمکانے کے لیے ملت میں طرح طرح کے جاہلانہ تعصّبات کی آگیں بھڑکا کر رکھ دیں۔ ان تعصّبات نے ملت کو ان گنت ٹکڑوں میں بانٹ کر ان ٹکڑوں کو خود ایک دوسرے ہی کے خلاف لڑایا اور پھر جب ان احمقانہ آویزشوں نے ملت کو نحیف و نزار کر دیا تو پھر اس پر وہ تمام بیماریاں حملہ آور ہو گئیں جو کمزور جسموں پر حملہ آور ہوا ہی کرتی ہیں۔ یہ جسد جب مریض ہو گیا تو اس کے ایک ایک جوڑ اور ایک ایک پور سے درد کی ٹیسیں اٹھنے لگیں اور پھر اُسے اس حالت تک پہنچانے والے بھی اس اذیت سے محفوظ نہ رہ سکے!

یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اخلاق اور کردار کی خرابیاں قوم میں بتدریج کمزوریاں پیدا کرتی چلی جاتی ہیں اور اس کی غیرت، شجاعت، علوہمتی، دانش مندی اور عزم و استقلال ایسی خوبیوں کو گھن کی طرح چاٹ جاتی ہیں۔ پھر دوسری قومیں اس بیمار قوم کو حریصانہ نگاہوں سے دیکھنا شروع کر دیتی ہیں اور آخر ایک دن وہ قوم کسی زیادہ طاقتور قوم کے حملوں کا شکار ہو کر غلامی کا طوق گلے میں ڈال لیتی ہے۔

پھر یہ غلامی اس میں مزید برائیوں کو جنم دیتی ہے اور اسے پست فطرتی، بزدلی، مجبوری، مقہوری، افلاس، حرص اور احساسِ کمتری کی زنجیروں میں باندھ کر گوناگوں اذیتوں کا شکار بنا دیتی ہے۔!

اور یہ سب کچھ اس قوم کے افراد کے اپنے کرتوت ہوتے ہیں!

سورۂ یونس، آیت 44 میں ارشاد ہوا ہے:

انَّ اللّٰہ لا یظْلِمُ النَّاسَ شَیْئًا ''حقیقت یہ ہے کہ اللہ لوگوں پر ظلم نہیں کیا کرتا
وَّلٰکِنَّ النَّاس اَنْفُسَھُمْ یَظْلِمُوْنَ o بلکہ لوگ خود ہی اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔''

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے ایک بار، نظر مفسر بیان کرتے ہیں کہ:

''یعنی اللہ نے تو انہیں کان بھی دیئے ہیں اور آنکھیں بھی اور دل بھی اس نے اپنی طرف سے کوئی ایسی چیز انہیں دینے میں بخل نہیں کیا ہے، جو حق و باطل کا فرق دیکھنے اور سمجھنے کے لیے ضروری تھی، مگر لوگوں نے خواہشات کی بندگی اور دنیا کے عشق میں مبتلا ہو کر آپ ہی اپنی آنکھیں پھوڑ لی ہیں اور اپنے کان بہرے کر لیے ہیں اور اپنے دلوں کو اتنا مسخ کر لیا ہے کہ ان میں بھلے برے کی تمیز، صحیح و غلط کا فہم اور ضمیر کی زندگی کا کوئی اثر باقی نہیں رہا۔''

(تفہیم القرآن، جلد دوم، صفحہ ۲۸۹)

سورۃ النحل، آیات ۱۱۲، ۱۱۳ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

''اللہ تعالیٰ ایک بستی کی مثال دیتا ہے۔ وہ امن و اطمینان کی زندگی بسر کر رہی تھی اور ہر طرف سے اس کو بہ فراغت رزق پہنچ رہا تھا کہ اس نے اللہ کی نعمتوں کا کفران شروع کر دیا۔ تب اللہ نے اس کے باشندوں کو ان کے کرتوتوں کا یہ مزا چکھایا کہ بھوک اور خوف کی مصیبتیں ان پر چھا گئیں۔ ان کے پاس ان کی اپنی قوم میں سے ایک رسول آیا، مگر انہوں نے اسے جھٹلا دیا۔ آخر کار عذاب نے انہیں آلیا، جب کہ وہ ظالم ہو چکے تھے۔''

یہاں ایک امن اور اطمینان سے زندگی گزارنے والی قوم کی حالت امن و اطمینان سے نکل کر فقر و فاقہ اور خوف میں مبتلا ہو جانے کی جو وجوہ بتائی گئی ہیں، وہ یہ ہیں:

انہوں نے خدا کی نعمتوں کا کفران کیا،

انہوں نے خدا کے نبی کو جھٹلایا،

انہوں نے ظلم کا رویہ اختیار کیا۔

عربی زبان میں لفظ ظلم کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ وَضْعُ الشَّیْئِی فِیْ غَیْرِ مَحَلِّہٖ ۔ جس کا مطلب ہے کسی شے کو بے محل رکھنا۔ شے کو بے محل رکھنے سے مراد یہ ہے کہ اس شے کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا جائے جس کے لیے وہ بنائی نہیں گئی تھی۔ مثال کے طور پر کرسی اس لیے بنائی جاتی ہے کہ اس پر بیٹھا جائے اور میز اس لیے بنائی جاتی ہے کہ اس پر کتابیں یا کھانے کے برتن یا اور ضرورت کی چیزیں رکھی جائیں۔ اب اگر کوئی شخص میز پر چڑھ کر بیٹھ جائے اور کرسی پر پاؤں رکھ دے تو اس نے دونوں چیزوں کو غلط طور پر استعمال کیا۔ اسی کو عربی میں ظلم کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو زندگی کی مہلت، دولت، اعضاء و جوارح، ذہن و دل اور مختلف اقسام کی قوتیں اور صلاحیتیں بخشی ہوئی ہیں تاکہ وہ ان سے کام لے کر خدا کے حقوق بھی ادا کرے اور خدا کے بندوں کے بھی۔ مگر جب وہ خدا کی ان نعمتوں سے کام لے کر ایسی راہوں پر چل نکلتا ہے جن پر چلنے سے خدا کے حقوق بھی تلف ہوتے ہیں اور خدا کے بندوں کے بھی، تو پھر وہ ان قوتوں اور صلاحیتوں پر ظلم کرتا ہے کیونکہ یہ اسے اس لیے عطا نہیں کی گئی تھیں کہ وہ ان سے کام لے کر خدا اور خدا کی مخلوق کے حقوق تلف کرے۔

خدا نے اسے دولت دی، وہ اس دولت کو بیوی بچوں، والدین اور دوسرے مستحقین پر تو صرف کرتا نہیں اور اسے شراب اور جوئے کی نذر کر دیتا ہے۔

خدا نے اسے دماغ دیا، ذہانت دی۔ وہ اس ذہانت سے علم حاصل کرنے کے بجائے اسے عیارانہ اور مکارانہ پروگرام بنانے پر صرف کر دیتا ہے۔

خدا نے اسے صحت دی، وہ اس صحت سے کام لے کر کمزوروں، بیماروں کی امداد کرنے کے بجائے اسے فسق و فجور میں تباہ کرنا شروع کر دیتا ہے۔ ایسی صورت میں وہ اپنی دولت، اپنی ذہانت، اپنی صحت تینوں پر ظلم کرتا ہے کہ ان سے وہ کام لیتا ہے جن کے لیے وہ

عطا نہیں کی گئی تھیں۔ لہٰذا کلام پاک اور احادیث نبویؐ میں گناہ کے لیے لفظ ظلم اور گنہگار کے لیے لفظ ظالم عام استعمال ہوا ہے اور جو لوگ اپنی ملکیتوں، اپنی قوتوں، اپنی صلاحیتوں پر اس طرح ظلم کرتے ہیں، وہ بالآخر عذاب کا نشانہ بنتے ہیں اور یہ بدلہ موت سے پہلے اس دنیا میں بھی مل جایا کرتا ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا فرمان ہے کہ "گناہ دشمن کی تدبیروں سے بھی زیادہ انسان کے لیے خطرناک ہے۔"

امام جعفر صادقؒ نے ایک دفعہ حضرت سفیان ثوریؒ کو کچھ نصیحتیں فرمائیں:

"سفیان، جب خدا تم کو کوئی نعمت عطا کرے اور تم اس کو ہمیشہ باقی رکھنا چاہو تو زیادہ سے زیادہ شکر ادا کرو کیونکہ خدا تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے کہ "اگر تم شکر ادا کرو گے، تو میں تم کو زیادہ دوں گا۔"

جب تمہیں رزق ملنے میں تاخیر ہو رہی ہو تو استغفار زیادہ کرو۔ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتا ہے کہ "اپنے رب سے مغفرت چاہو، وہ بڑا مغفرت کرنے والا ہے۔ تم پر آسمان سے موسلا دھار بارش برسائے گا اور دنیا میں مال اور اولاد سے تمہاری مدد کرے گا اور آخرت میں تمہارے لیے جنت اور نہریں بنائے گا۔"

جب تمہارے پاس وقت کے سلطان یا اور کسی کا کوئی حکم پہنچے تو **لا حول ولا قوۃ الا باللہ** زیادہ پڑھو، وہ کشادگی کی کنجی ہے۔

جو شخص اپنی قسمت کے حصے پر قناعت کرتا ہے، وہ مستغنی رہتا ہے اور جو دوسرے کے مال کی طرف نظر اٹھاتا ہے، وہ فقیر مرتا ہے۔

جو شخص خدا کی تقسیم پر راضی نہیں ہوتا، وہ خدا کو اس کے فیصلے پر متہم کرتا ہے۔

جو شخص دوسرے کی پردہ دری کرتا ہے، خدا اس کے گھر کے خفیہ حالات کی پردہ دری کر دیتا ہے۔

جو بغاوت کے لیے تلوار کھینچتا ہے، وہ اسی سے قتل کیا جاتا ہے۔

جو اپنے بھائی کے لیے گڑھا کھودتا ہے، وہ خود اس میں گرتا ہے۔

جو بیوقوفوں کے پاس بیٹھتا ہے، وہ حقیر ہو جاتا ہے۔

جو علماء سے ملتا جلتا ہے، وہ معزز ہو جاتا ہے۔

جو برے مقامات پر جاتا ہے، وہ بدنام ہو جاتا ہے۔

مفتی محمد حسن فرماتے ہیں کہ:

"گناہ سے بچنا چاہیے۔ گناہ کرنا ایسا ہے جیسے سنکھیا کھانا۔ ایک شخص پلاؤ بھی کھاتا ہے مرغ بھی، اور دوسرے عمدہ عمدہ کھانے بھی۔ لیکن ساتھ ہی سنکھیا بھی کھاتا ہے۔ دوسرا ہے کہ وہ صرف مکی کی خشک روٹی کھاتا ہے بغیر سالن کے۔ مگر سنکھیا نہیں کھاتا، تو یہ دوسرا شخص پہلے سے بہت اچھا ہے۔"

اسی سلسلے میں آپ نے یہ بھی فرمایا کہ:

"انسان چاہے اعمالِ حسنہ کم ہی کرے یعنی فرائض اور واجبات کے علاوہ کچھ نہ کرے لیکن سنکھیا نہ کھائے یعنی گناہ نہ کرے۔ یہ اس سے اچھا ہے کہ تہجد بھی پڑھے، تلاوت بھی بہت کرے، ذکر وغیرہ بھی کرے، لیکن ساتھ ہی سنکھیا بھی کھائے، جو کہ ان تمام اعمال کو ضائع کر دیتا ہے۔"

مفتی مولانا محمد شفیع صاحب اپنی ایک تصنیف "انسانی اعضاء کی پیوند کاری شریعتِ اسلامی کی روشنی میں" فرماتے ہیں:

"حق تعالیٰ نے جن چیزوں کو حرام و ممنوع قرار دیا ہے، وہ پوری انسانیت کے مفاد کی خاطر اور بڑی حکمت پر مبنی ہے۔ اس کی وجہ بخل یا اللہ تعالیٰ کا اپنا کوئی فائدہ تو ہو نہیں سکتا کہ ان چیزوں کو وہ اپنے کسی نفع کی خاطر روکنا چاہتے ہوں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ علیم و خبیر اور حکیم ہیں۔ ان کا کوئی حکم فضول اور بے فائدہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اس کے

سوا کوئی احتمال نہیں کہ جن چیزوں کو ہم پر حرام کیا گیا ہے، وہ انسان اور انسانیت کے لیے ضرر رساں ہیں اور اگر ان میں کوئی نفع محسوس بھی ہو تو ان میں مضرت کا پہلو بہر حال غالب ہے۔

پھر بعض مضرتیں تو ایسی ہوتی ہیں جو انسان کے جسم کو بیمار یا کمزور کر دیتی ہیں اور بعض وہ بھی ہیں جن سے جسم کو کوئی ظاہری مضرت نہیں پہنچتی، مگر وہ روحِ انسانی کے لیے مضر ہوتی ہیں۔ اخلاق و کردار پر ان کا برا اثر پڑتا ہے۔ پہلی قسم کی مضرتوں کو تو ساری دنیا جانتی اور مانتی ہے۔ جسمِ انسانی کی صحت اور علاج کے متعلق جتنی قسم کے معالجات اور علوم و فنون دنیا میں رائج ہیں۔ طبِ یونانی، ایلوپیتھی، ہومیوپیتھی، ویدک وغیرہ سبھی ان چیزوں کی مضرت کے قائل ہیں اور اسی لیے انسان کو ایسی چیزوں کے استعمال سے پرہیز کی تاکید کرتے ہیں، جیسے مردار کا گوشت وغیرہ کہ سبھی جانتے ہیں کہ اس کا کھانا انسانی صحت کو برباد کرتا ہے۔

لیکن باطنی اور روحانی صحت و مرض آنکھوں سے نظر نہیں آتے۔ کسی میٹر یا ایکس رے وغیرہ آلات سے بھی ان کو نہیں دیکھا جا سکتا۔ اس لیے طب جسمانی کے حکماء اس کا ادراک نہیں کر سکتے۔ ان کا انکشاف صرف ان لوگوں پر ہوتا ہے، جو روح انسانی کے طبیب ہیں۔ اس کی صحت و مرض کو پہچانتے ہیں اور جن کی نظر میں انسان کے جسم سے زیادہ اس کی روح کی صحت اور کردار کی درستی قابلِ اہتمام ہے۔

خلاصہ یہ کہ شریعت اسلامی نے جن چیزوں یا کاموں کو حرام قرار دیا ہے انہیں صرف انسان کی فلاح اور بہبود کی خاطر حرام کیا ہے۔ یہ چیزیں کبھی اس کے جسم کے لیے مضر ہوتی ہیں، کبھی روح کے لیے کبھی دونوں کے لیے۔"

(انسانی اعضاء کی پیوندکاری)

اب بسا اوقات ہم اپنے اردگرد دیکھتے ہیں کہ بعض بدعمل افراد اور گروہ بڑے دھڑلے سے اپنے فاسقانہ اعمال کو نہ صرف خود جاری رکھے ہیں بلکہ ان کا پرچار کر کے دوسروں کو بھی فسق و فجور کی طرف کھینچ رہے ہیں اور اس کے باوجود وہ بڑے مزے سے

زندگی کے لطف حاصل کر رہے ہیں اور بظاہر انہیں کچھ بھی ضرر نہیں پہنچ رہا۔ لیکن یہ جو کچھ ہمیں نظر آتا ہے، یہ درحقیقت ہماری کوتاہ بینی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ہماری نگاہیں اعمال و افعال کے دوررس نتائج کو دیکھنے کے بجائے ان کے فوری نتائج ہی میں الجھ کر رہ جاتی ہیں۔ ورنہ افراد ہوں یا اقوام فسق و فجور اور بداعمالیاں وہ زہر ہے جو ایسے لوگوں کو بتدریج مسموم کرتا کرتا انہیں مصائب، رسوائی، اذیت، تنزل اور غلامی کے مراحل سے گزارتا گزارتا بالآخر فنا کی موت سلا کر رہتا ہے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بے شک خدا ظالم کو مہلت دیتا ہے یہاں تک کہ پھر جب اسے پکڑتا ہے تو پھر نہیں چھوڑتا۔ (بخاری)

سورۃ النحل، آیت ۲۶ میں اللہ تعالیٰ نے حق کو نیچا دکھانے کے لیے چالیں چلنے والے مکاروں کا انجام بتاتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

قَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ	”ان سے پہلے بھی (بہت سے) لوگ (حق کو نیچا
فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ	دکھانے کے لیے) ایسی ہی مکاریاں کر چکے ہیں، تو
الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ	دیکھ لو کہ اللہ نے ان کے مکر کی عمارت جڑ سے اکھاڑ
السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ	پھینکی اور اس کی چھت اوپر سے ان کے سر پر آ رہی
وَاَتٰهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ	اور ایسی طرف سے ان پر عذاب آیا جدھر سے اس
لَا يَشْعُرُوْنَ ○	کے آنے کا انہیں گمان تک نہ تھا۔“

یہ بات خاص طور پر غور کیے جانے کے قابل ہے کہ:

جب قوموں کی بداعمالیوں کے باعث ان پر عذاب آتے ہیں، تو وہی عام چیزیں جو عام نارمل حالات میں فوائد کا سبب ہوتی ہیں، اب ذریعۂ عذاب بن جاتی ہیں۔

سید ابوبکر غزنوی فرماتے ہیں:

"جیسے اللہ تعالیٰ کی نوازشیں بے حد وحساب ہیں (ویسے ہی) اس کے عذاب کی قسمیں بھی بے شمار ہیں۔ وہ بڑا لطیف و حکیم ہے۔ وہ اس کائنات کی جس شے کو چاہے عذاب میں بدل دے۔ یہ ہوا، جس سے انسان کے سانس کی آمد و شد جاری ہے، وہ جب چاہتا ہے اس ہوا کو طوفان اور آندھی بنا دیتا ہے۔"

وَاَمَّا عَادٌ فَاُهۡلِكُوۡا بِرِيۡحٍ صَرۡصَرٍ عَاتِيَةٍ. (الحاقة ٦)

"قوم عاد کو زناٹے کی آندھی سے ہلاک کر دیا گیا۔"

...... یہ پانی جو بقائے حیات کے لیے ناگزیر ہے، وہ جب چاہتے ہیں اسے طغیانیوں میں بدل دیتے ہیں۔

لَا عَاصِمَ الۡيَوۡمَ مِنۡ اَمۡرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنۡ رَّحِمَ. (هود: ۴۳)

"(حضرت نوحؑ نے کہا) آج کوئی چیز اللہ کے حکم (یعنی آنے والے طوفان) سے بچانے والی نہیں ہے، سوائے اس کے کہ اللہ ہی کسی پر رحم کرے۔"

یہ آواز جو مطالب کے اظہار کے لیے ازبس ضروری ہے، وہ جب چاہتے ہیں اس آواز کو عذاب میں بدل دیتے ہیں۔

وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ اَخَذَتۡهُ الصَّيۡحَةُ. (العنكبوت ۴۰)

"ان میں سے کوئی ایسا تھا، جو چنگھاڑ کی گرفت میں آ گیا۔"

یہ زمین جس پر ہم چلتے ہیں، جب ان کی مشیت ہوتی ہے تو زمین انکار کر دیتی ہے کہ ہم اس پر چل سکیں۔

وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ خَسَفۡنَا بِهِ الۡاَرۡضَ. (العِنكبوت ۴۰)

"ان میں سے کوئی ایسا تھا جسے ہم نے زمین میں دھنسا دیا۔"

...... وہ خدائے لطیف و حکیم جب چاہتے ہیں نعمت کو عذاب میں بدل دیتے ہیں۔ مال اگر اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے تو اللہ کی نعمت ہے اور یہی مال اگر خدا سے عزیز تر

ہو جائے، اندیشہ و غم کا باعث ہو اور بخل، خست اور دنائت پر آمادہ کرے تو وہ عذابِ الٰہی بن جاتا ہے۔ اسی طرح اولاد اگر صالح ہو تو خدا کی دین ہے اور یہی اولاد اگر خدا سے دور ہٹا دے اور حجاب بن جائے، تو عذاب الٰہی ہے۔ ہاں اللہ کا عذاب کبھی مال اور اولاد کی صورت میں بھی ہوتا ہے۔

فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا...... (التوبہ : ۵۵)

"ان کا مال و منال اور ان کی اولاد آپ کو حیرت میں نہ ڈالے۔ یہ تو محض اس لیے ہے کہ اللہ اس دنیا کی زندگی میں انہیں عذاب میں مبتلا کرے۔"

طغیانیاں اب بھی آتی ہیں، طوفان اب بھی اٹھتے ہیں، زلزلوں سے بستیاں اب بھی ویران ہوتی ہیں۔ زمین میں بستیوں کے دھنس جانے کی خبریں اب بھی ہم اخباروں میں پڑھتے ہیں، مگر ایک ایسی غفلت ہم پر چھا گئی ہے، ایک ایسی قساوت دلوں پر طاری ہے کہ ان تباہیوں اور بربادیوں کو دیکھتے ہیں، تو کہتے ہیں یہ محض اتفاقات ہیں جو اس دنیا میں رونما ہوتے ہیں--- خدا کہتا ہے کہ یہ محض اتفاقات نہیں ہیں بلکہ:

دلوں کا
سخت ہو جانا
آنسو نہ آئے

فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ. (الاعراف : ۹۶)

"ہم نے انہیں ان (بداعمالیوں) کی سزا میں پکڑ لیا جو انہوں نے کمائیں۔"

(اسی دنیا میں اللہ کا قانونِ جزا و سزا، از ابوبکر غزنوی)

یہ سب بیانات جس حقیقت کو واضح کر رہے ہیں، وہ یہی ہے کہ جن اعمال کو گناہ کہا گیا ہے اور جن سے روکا گیا ہے، وہ صرف اخروی عذاب ہی نہیں لاتے بلکہ انسان کو اس دنیا میں بھی مصائب اور رسوائی کا شکار بناتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا۔ اے گروہ مہاجرین! پانچ باتیں ایسی ہیں کہ جب تم ان میں مبتلا ہو (تو

تکالیف میں مبتلا ہو گے) اور میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ تم ان میں مبتلا ہو (وہ پانچ باتیں یہ ہیں) کہ جب کسی قوم میں علانیہ فسق و فجور ہوتا ہے تو اس میں طاعون (یعنی وبا) اور ایسی ایسی بیماریاں پھیل جاتی ہیں جو ان کے گذشتہ آباؤ اجداد میں نہیں پائی جاتی تھیں۔

اور جب لوگ ناپ تول میں بد دیانتی کرتے ہیں تو ان پر قحط نازل ہوتا ہے اور سخت مصیبت پڑتی ہے اور بادشاہِ وقت ان پر ظلم کرتا ہے۔

اور جب وہ اپنے مالوں کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتے تو آسمان سے آنے والی بارش کو ان سے روک لیا جاتا ہے، اور اگر دنیا میں چار پائے نہ ہوتے تو بالکل پانی نہ پڑتا۔

اور جب وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے عہد کو توڑتے ہیں تو اللہ ان پر کسی ایسے دشمن کو مسلط کر دیتا ہے جو ان میں سے نہیں ہوتا اور وہ ان کے مالوں کا ایک حصہ ان سے چھین لیتا ہے۔

اور جب ان کے حاکم اللہ کی کتاب کی رو سے فیصلے نہیں کرتے اور جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے اسے اختیار نہیں کرتے تو اللہ ان کے درمیان لڑائی ڈال دیتا ہے۔ (ابوداؤد)

حضرت ثوبانؓ سے روایت کہ رسول خدا صلی علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”عمر کو نیکی ہی بڑھاتی ہے اور تقدیر دعا ہی سے ٹلتی ہے اور ایسے بھی ہوتا ہے کہ انسان کسی گناہ کے باعث، جس کا اس نے ارتکاب کیا ہوتا ہے، رزق سے محروم ہو جاتا ہے۔“ (ابوداؤد)

حقیقت یہ ہے کہ برائی سے نہ بچنا تباہی کا شکار ہونا ہے۔ صلحائے امت نے اس حقیقت کو لوگوں کے ذہن نشین کرنے کے لیے بہت کچھ نصائح بیان فرمائی ہیں۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد جو پہلی تقریر کی اس میں فرمایا:

”مسلمانو! جو قوم جہاد فی سبیل اللہ ترک کر دیتی ہے، وہ ذلت کے تنگ و تاریک گڑھے میں گر جاتی ہے اور جو قوم بدکاری میں مبتلا ہو جاتی ہے خدائے قدوس اس پر مصائب نازل کر دیتا ہے۔“

حضرت علیؓ کا فرمان ہے۔ ''جو برے راستے پر جاتا ہے، اس پر تہمتیں لگائی جاتی ہیں، جو بھنور میں گھستا ہے وہ ڈوب جاتا ہے۔''

آپؓ ہی کا یہ ارشاد ہے کہ: ''جو شخص گناہوں سے پاک اور بری ہو، وہ دلیر ہوتا ہے اور جس میں کچھ عیب ہوں، وہ بزدل ہو جاتا ہے۔''

حضرت عثمانؓ نے فرمایا ہے: ''گناہ کسی نہ کسی صورت دل کو بے قرار رکھتا ہے۔''

حضرت علیؓ کا مقولہ ہے: ''جو عمل میں کوتاہی کرتا ہے خدا اسے مصیبت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ خدا کو اس شخص کی کیا ضرورت ہے جس کی جان اور مال میں اس کا حصہ نہیں۔''

نیز آپ نے فرمایا:

''جو شخص اپنے لوگوں کی امداد کرنے سے ہاتھ کھینچ لیتا ہے اس کا ایک ہاتھ رکتا ہے تو عزیزوں کے بہت سے ہاتھ رک جاتے ہیں اور جو اپنے لوگوں کے ساتھ تواضع اور مہربانی سے پیش آتا ہے، وہ ان کی دائمی اور مستقل دوستی حاصل کر لیتا ہے۔''

بغض اور حسد کی جسمانی اور مالی مضرت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو، کیونکہ بغض خیر و برکت کے زوال کا باعث ہے۔''

''حاسدوں کی اس حالت پر تعجب ہے کہ وہ تندرست کیسے ہیں۔''

حضرت عمر فاروقؓ بد زبانی اور فرض ناشناسی کے نقصانات واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''آپس میں ایک دوسرے کو لعن طعن کرنے سے اجتماعی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔''

''فرائض کی کوتاہی سے دنیا کی بے آرامی بھی حاصل ہوتی ہے اور آخرت کی بھی۔''

تاریخ اسلام کے فاتح جرنیلوں میں سے حضرت خالدؓ بن ولید کا نام نامی امر

نیز بڑی شان کا مالک ہے۔ جس طرف بھی آپؓ رخ کرتے عموماً اللہ تعالیٰ کی فتح و نصرت بڑھ کر ہاتھوں ہاتھ لیتی۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے عہد میں ان کے نام ایک حکم نامہ بھیجا، جس میں فرمایا ہوا تھا کہ:

”دیکھو، غرور تمہارے دل میں بالکل نہ آنے پائے ورنہ جو کچھ کیا ہے سب خاک میں مل جائے گا اور خدا تمہاری مدد سے ہاتھ اٹھا لے گا۔“

امام غزالیؒ بد خلقی کی مضرت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”بد خلقی سے دشمنی پیدا ہوتی ہے اور دشمنی سے جفا کاری۔“

نیز آپ حسد کے دنیوی نقصانات کی مضرت ان مؤثر الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

”حاسد اس شخص کی مانند ہے جو اپنے دشمن کو مارنے کے لیے پتھر پھینکے اور پتھر دشمن کو لگنے کے بجائے اس کی اپنی دائیں آنکھ کو لگے اور وہ پھوٹ جائے۔ اس سے اس شخص کو اور غصہ آئے اور وہ پھر زور سے پتھر مارے اور وہ اسی طرح اس کی دوسری آنکھ پھوڑے۔ وہ پھر پتھر مارے اور وہ پتھر اس کا سر توڑ ڈالے۔ اسی طرح وہ دشمن کی طرف پتھر پھینک پھینک کر آپ مجروح ہوتا چلا جائے اور دشمن صحیح سالم رہے اور مخالفین دیکھ دیکھ کر ہنسیں۔“

کتاب کے آغاز میں بیان کی جانے والی حدیث قدسی میں فرمایا گیا ہے کہ:

”پس جو بھلائی پائے، وہ خدا کی حمد کرے اور جو اس کے سوا پائے (یعنی مصیبت) وہ اپنے آپ ہی کو ملامت کرے۔“

حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے وہ دکھ جو ہمارے کسی اپنے عمل کا نتیجہ نہیں ہوتے۔ مثلاً عزیز پیاروں کی موت کے صدمات، یا کسی لا علاج مرض میں مبتلا ہو جانا، یا کوشش کے باوجود روزگار نہ ملنا وغیرہ۔ ان کی تعداد بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ ہمارے مصائب اور پریشانیوں میں زیادہ تعداد انہیں بلاؤں کی ہے جن کا نزول قدرتی نتیجہ ہوتا ہے۔ ہمارے اپنے ناپسندیدہ اعمال کا، جو لوگ حرص و آز کے باعث حقداروں کے حقوق چھینتے ہیں، ان

سے دشمنی کرنے والے بڑھ جاتے ہیں اور ہمدردی کرنے والے کم ہو جاتے ہیں۔

جو لوگ اپنے والدین کے آگے گستاخیاں کرتے ہیں وہ خود اپنی اولاد کو گستاخی کا سبق پڑھاتے ہیں اور بہت جلد وہ وقت آجاتا ہے، جب وہ اولاد اس سبق کو خود انہیں کے آگے دہرانا شروع کر دیتی ہے۔

جو حسد اور کینے کے باعث دوسروں کی راہوں میں کانٹے بکھیرتے ہیں، انہیں زندگی کے ہر موڑ پر ایسے لوگ مل جاتے ہیں جو ان کی راہوں میں کانٹے بکھیرنے میں لگے ہوتے ہیں اور بارہا ایسے بھی ہوتا ہے کہ وہ ٹھیک انہیں کانٹوں میں الجھ کر رہ جاتے ہیں جو انہوں نے خود دوسروں کے لیے بکھیرے تھے۔

تفکرات اور آلام میں گھرا ہوا انسان اپنی پریشانیوں کے اسباب پر جتنا بھی غور کرے گا، وہ اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ اس کے غموں کا غالب حصہ انہیں مآخذ سے نکلا ہے، جنہیں خدا اور خدا کے رسولؐ نے گناہ کہا ہے۔ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت علیؓ فرماتے ہیں:

"اگر خدائے پاک نے حرام اور ناجائز کاموں سے منع نہ بھی فرمایا ہوتا، تو بھی عقل والے کے لیے ضروری تھا کہ ان سے پرہیز کرتا۔"

* * *

نیک اعمال کی دنیوی جزا

جس طرح بد اعمالیاں اور رذائل اخلاق دنیوی زندگی میں مصائب اور آفات کے نزول کا ذریعہ بنتے ہیں اسی طرح پرہیزگاری' نیکوکاری اور فضائلِ اخلاق زندگی میں امن وسکون اور خیر و برکت کا سبب ثابت ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ. (الاعراف: ۹۶)

”اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور پرہیزگاری اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔“

ایمانداری اور پرہیزگاری کے باعث آسمانی اور زمینی برکتوں سے مالا مال ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جو ہر اس شخص کے مشاہدے میں آ سکتی ہے جو زندگی میں آنکھیں کھول کر چلنے والا ہو اور دور بین نگاہ رکھتا ہو۔

حضرت عبداللہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ جو شخص سب فکروں کو چھوڑ کر ایک ہی فکر لگا لے یعنی آخرت کی فکر' تو اللہ تعالیٰ اس کی دنیا کی فکروں کے لیے اس کے لیے کافی ہو جائے گا اور جس کو طرح طرح کی دنیوی فکروں نے پریشان کر دیا ہو تو اللہ پروا نہیں کرے گا کہ وہ کس وادی میں ہلاک ہوتا ہے۔ (ابن ماجہ)

خواجہ حسن بصریؒ نے فرمایا۔ ”میں نے کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھا جس نے دنیا

چاہی ہو اور اسے آخرت ملی ہو۔ اس کے برخلاف جو آخرت چاہتا ہے، اسے دنیا بھی مل جاتی ہے۔"

صحیح بخاری میں ایک حدیث بیان ہوئی ہے کہ قیامت کے دن جب خدا تعالیٰ کے سائے کے سوا اور کوئی سایہ نہ ہوگا، خدا سات آدمیوں کو اپنے سائے میں لے گا۔ پھر بتایا گیا ہے کہ وہ سات آدمی کون ہوں گے اور سب سے پہلے جس کا نام لیا گیا ہے، وہ ہے "امام عادل"، یعنی انصاف کرنے والا حکمران۔

اب کسی علاقے کے حکمران کا عادل ہونا قیامت کے دن تو اسے خدا کے سائے سے سرفراز کرے گا ہی، لیکن ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ایک انصاف کرنے والا حکمران دنیا میں بھی خدا کے سائے ہی میں ہوتا ہے کیونکہ رعایا کے ساتھ انصاف کرنے کے باعث وہ خواص و عوام میں ہردلعزیز ہوتا ہے۔ اس کے مخالف کم اور حامی زیادہ ہوتے ہیں، اسے خطرے کا احساس کم اور امن و حفاظت کا احساس زیادہ رہتا ہے اور یہ صورتِ حالات اس کے دل کو پرسکون رکھتی ہے اور اس کے عہد کو لمبا کر دیتی ہے۔

بخاری ہی کی ایک حدیث ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جو شخص اپنی زبان اور اپنی عصمت و عفت کی حفاظت کا ذمہ لے، میں اس کے لیے بہشت کا ذمہ لیتا ہوں۔"

اب ہم دیکھ سکتے ہیں کہ جو شخص زبان کو بے جا اور فضول طور پر استعمال نہیں کرتا اور پاکدامنی کی زندگی گزارتا ہے، وہ بعد از موت ملنے والی بہشت ہی کا مستحق نہیں ہوتا بلکہ موت سے پہلے کی زندگی میں بھی بڑی بڑی آزمائشوں سے مامون و مصئون رہتا ہے۔ گویا دنیا میں بھی کسی حد تک وہ بہشت ہی میں ہوتا ہے۔ زبان کا بے جا استعمال فتنہ و فساد کی جڑ ہے۔ انسانوں کا ایک دوسرے کے دلوں کا خون کرنا، معاشرے میں عموماً اور رشتہ داریوں

میں خصوصاً باہمی رنجشوں اور ناچاقیوں کا پیدا ہو کر ظالم اور مظلوم دونوں کی زندگیوں کو اجیرن کر دینا، اس زندگی میں جہاں قدم قدم پر دوسرے انسانوں کی امداد کی ضرورت پیش آتی ہے، دشمنوں کا بڑھ جانا اور دوستوں کا کم ہو جانا، یہ سب مصائب بے لگام زبانوں ہی کے باعث تو ٹوٹتے ہیں۔ یعنی بے لگام زبان آخرت میں تو نتھنوں کے بل جہنم میں گراتی ہی ہے۔ اس دنیا میں بھی گرا دیتی ہے اور جو اس کی حفاظت کا دھیان رکھے یا حضورؐ کے الفاظ میں اس کی حفاظت کا ذمہ لے، اسے زندگی میں بھی بہت حد تک امن کی جنت مل جاتی ہے، کیونکہ وہ بے شمار اذیت دہ جھگڑوں ٹنٹوں میں الجھے جانے سے بچ جاتا ہے۔ کسی عقلمند کا مقولہ ہے کہ ایک چپ میں سو سکھ ہوتے ہیں۔

ایسے ہی نیک چلنی اور عفت مآبی بھی بہشت کا مستحق بنانے کے علاوہ دنیوی پریشانیوں اور اذیتوں سے بھی حفاظت کی ضمانت ہے۔ نیک چلن انسان کو گھر والوں کا اعتماد اور معاشرے کا احترام حاصل رہتا ہے۔ وہ رسوا کن انگشت نمائیوں اور ذلت خیز نکتہ چینیوں سے مامون ہوتا ہے۔ وہ معاشرے میں عزت کی زندگی گزارتا ہے اور ان تمام جسمانی اور ذہنی آلام سے محفوظ رہتا ہے جو فسق و فجور کی زندگی کا لازمی نتیجہ ہیں۔

انسان اس بات کو ہمیشہ سے پسند کرتا آیا ہے کہ اسے لوگوں کے درمیان ہر دلعزیزی حاصل ہو اور لوگ اسے عزت اور محبت دیں۔ دنیا میں لوگ اپنے ابنائے جنس کی واہ واہ حاصل کرنے کے لیے کیا کیا پاپڑ نہیں بیلتے، کہیں اپنی قابلیت اور نیکی کے اشتہار دیے جاتے ہیں، کہیں کوئی رفاہِ عامہ کا کام کرتے ہوئے اپنی تصاویر کھنچوائی جاتی ہیں۔ کہیں جائیدادیں وقف کرنے یا خیراتی کاموں میں رقوم دینے کے اعلان کیے جاتے ہیں--- ان چکروں میں مبتلا ہونے کے بجائے اگر سچے دل سے اصلاحِ نفس کی طرف توجہ کر لی جائے تو خود بخود ہی لوگوں کی عزت اور محبت حاصل ہو جائے گی۔

کہا جاتا ہے کہ نیکی بذاتِ خود حسن ہے اور کوئی شخص بدفطرتی کی انتہا پر نہ پہنچ چکا ہو ورنہ وہ اس حسن سے لازماً متاثر ہوگا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ لوگ جو خود خدا کے نافرمان ہیں اور گنہگارانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان میں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو اپنی اولاد کے بارے میں یہی تمنا رکھتے ہیں کہ وہ نیک بنیں اور نیک نامی حاصل کریں اور خود نیکی کو نہ اپنانے کے باوجود وہ نیکی اپنانے والوں کو احترام اور محبت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

سورۂ مریم آیت ۹۶ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ
الرَّحْمٰنُ وُدًّا ۝

”یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے
نیک اعمال کیے عنقریب رحمان ان کے لیے
(لوگوں کے) دلوں میں محبت پیدا کردیں گا۔“

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو جبرائیلؑ کو آواز دیتا ہے کہ اللہ فلاں سے محبت رکھتا ہے لہٰذا تم بھی اس سے محبت رکھو تو پھر جبرائیلؑ بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ پھر جبرائیل آسمان والوں کو آواز دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں شخص سے محبت رکھتا ہے، پس تم سب بھی اس سے محبت رکھو۔ چنانچہ آسمان والے بھی اس شخص سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ پھر اس شخص کی مقبولیت دنیا میں بھی پیدا کردی جاتی ہے--- اور جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے نفرت کرتا ہے تو وہ جبرائیلؑ کو آواز دیتا ہے اور فرماتا ہے کہ مجھے فلاں شخص سے نفرت ہے پس تم بھی اس سے نفرت کرو، تو پھر جبرائیلؑ بھی اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ پھر وہ آسمان والوں کو ندا دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں شخص سے نفرت کرتا ہے، پس تم بھی اس سے نفرت کرو تو پھر آسمان والے بھی اس شخص سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ پھر زمین میں بھی اس کے لیے نفرت پیدا کردی جاتی ہے۔ (مسلم)

بنو امیہ کے آٹھویں خلیفہ حضرت عمر بنت عبدالعزیز اپنے علم و فضل، اپنے اعمالِ صالحہ اور اپنی دلکش شخصیت کے باعث عوام و خواص سب میں بہت زیادہ مقبول تھے۔ مسلمان تو مسلمان بعض غیر مسلم بھی انہیں جی جان سے چاہتے تھے۔ سہیل بن ابی صالح بیان کرتے ہیں کہ ہم میدان عرفات میں تھے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز گزرے، وہ ان دنوں امیر حج تھے (جیسے ہی وہ گزرے) لوگ کھڑے ہو کر انہیں دیکھنے لگے۔ میں نے اپنے باپ سے کہا کہ ابا جان میرا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کو حضرت عمر بن عبدالعزیز سے محبت ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہ کیسے؟ میں نے کہا۔ اس لیے کہ لوگوں کے دلوں میں ان کے لیے محبت ہے۔ انہوں نے کہا کہ تو نے حضرت ابو ہریرہؓ کو حضورؐ کی حدیث بیان کرتے سنا ہوگا۔ (مسلم)

احادیث نبویؐ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسی انسان کا دنیا میں نیک نام ہونا اس کی آخرت پر بھی اثر ڈالتا ہے۔

حضرت انسؓ بن مالک نے بیان کیا کہ لوگ ایک جنازے کے پاس سے گزرے تو اس (میت) کی تعریف و توصیف کی تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''واجب ہوگئی۔'' پھر وہ لوگ ایک اور جنازے کے پاس سے گزرے تو اس کی برائی بیان کی، تو حضورؐ نے (پھر) فرمایا کہ ''واجب ہوگئی۔'' اس پر حضرت عمرؓ بن خطاب نے سوال کیا کہ ''کیا واجب ہوگئی۔'' حضورؐ نے فرمایا کہ ''جس شخص کی تم نے تعریف کی ہے۔ اس کے لیے جنت واجب ہوگئی اور جس کی تم نے برائی بیان کی ہے اس کے لیے دوزخ واجب ہو گئی۔ تم لوگ زمین پر اللہ کے گواہ ہو۔'' (بخاری)

ابوالاسود بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت عمرؓ بن خطاب کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک جنازہ پاس سے گزرا اور اس میت کی تعریف کی گئی۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ''واجب ہوگئی۔'' پھر ایک اور جنازہ گزرا اور اس میت کی بھی تعریف کی گئی اور حضرت عمرؓ

نے پھر کہا کہ "واجب ہوگئی۔" پھر ایک تیسرا جنازہ گزرا اور اس میت کی برائی بیان کی گئی اور حضرت عمرؓ نے پھر فرمایا کہ "واجب ہوگئی۔" ابوالاسود کہتے ہیں کہ "میں نے عرض کیا کہ امیر المومنین کیا واجب ہوگئی۔" آپ نے فرمایا کہ میں نے اسی طرح کہا ہے جس طرح رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ جس مسلمان کے لیے چار (مسلمان) اچھی گواہی دیں، اسے اللہ جنت میں داخل کرے گا۔ ہم نے آپؐ سے پوچھا کہ اگر تین آدمی گواہی دیں تو۔ آپؐ نے فرمایا کہ تین کا بھی یہی حکم ہے۔ پھر ہم نے پوچھا کہ اگر دو آدمی گواہی دیں تو۔ آپؐ نے فرمایا کہ دو کا بھی یہی حکم ہے۔ پھر ہم نے ایک کے بارے میں نہیں پوچھا۔ (بخاری)

حضرت علیؓ کا فرمان ہے کہ "وہ نیک نامی جسے خدا لوگوں میں مشہور کرا دے، اس مال و دولت سے کہیں بہتر ہے جو انسان ترکے اور میراث میں چھوڑ کر جائے گا۔"

واضح رہے کہ جناب امیرؓ نے یہ فرمایا ہے کہ "جسے خدا لوگوں میں مشہور کرا دے۔" یہ نہیں فرمایا کہ جسے مشہور کرانے کے لیے انسان خود کوشش کرے۔ کیونکہ اللہ کی طرف سے کسی نیک شخص کا نیک نام ہو جانا، ایک بات ہے اور انسان کا خود جدوجہد کرنا کہ لوگ مجھے نیک سمجھیں، ایک بالکل علیحدہ قسم کی بات ہے۔ انسان کی توجہ تو اصلاحِ نفس کی طرف ہونی چاہیے اور آخرت کا اجر پیش نظر رہنا چاہیے۔ ہاں جب وہ ایسا کرے گا تو اللہ تعالیٰ جو اجر اسے دے گا، دنیا کی نیک نامی بھی اس کا ایک حصہ ہے اور یہ نیک نامی جو رحمتِ خداوندی کے باعث ملی ہو، اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص نیک اعمال کرے گا ہی، اس لیے کہ لوگ مجھے نیک سمجھیں اور مجھے نیک نامی حاصل ہو، تو یہ شے سیدھی سیدھی ریا بن جائے گی جس پر خدا اور خدا کے رسولؐ کی طرف سے بڑی وعید آئی ہے۔

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ فرماتے ہیں کہ "متقی آدمی بادشاہ سے زیادہ معزز ہوتا ہے۔ بادشاہ لوگوں کو اپنے پاس جمع کرتا ہے، مگر متقی آدمی لوگوں سے بھاگتا ہے اور لوگ اس

کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔''

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کی نیکوکاری کا یہ عالم تھا کہ سال کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہوا تھا۔ چار مہینے حدیث پڑھنے پڑھانے میں گزارتے، چار مہینے جہاد میں رہتے اور چار مہینے حج کے سفر میں رہتے۔ مشہور محدث اور زاہد حضرت ذہبیؒ فرمایا کرتے تھے۔ ''حضرت عبداللہ میں کونسی خوبی نہیں ہے۔ خدا ترسی، عبادت، خلوص، جہاد، زبردست علم، دین میں مضبوطی، حسنِ سلوک، بہادری۔ خدا کی قسم مجھے ان سے محبت ہے اور ان کی محبت سے مجھے بھلائی کی امید ہے۔''

سورہ بنی اسرائیل، آیت ۱۸ تا ۲۱ میں اللہ تعالیٰ نے بدعمل لوگوں پر نیک عمل لوگوں کی فضیلت ثابت کرتے ہوئے فرمایا ہے:

''جو کوئی دنیا کا خواہشمند ہو، اسے ہم یہیں (اسی دنیا میں) دے دیتے ہیں جو کچھ بھی جسے دینا چاہیں۔ پھر اس کی قسمت میں جہنم لکھ دیتے ہیں جسے وہ ملامت زدہ اور رحمت سے محروم ہو کر تاپے گا، اور جو آخرت کا خواہشمند ہو اور اس کے لیے کوشش (بھی) کرے جیسی کہ اس کے لیے کوشش کرنی چاہیے اور ہو وہ مومن، تو ایسے ہر شخص کی کوشش مقبول ہو گی۔ ان (دنیا پرستوں) کو بھی اور ان (خدا پرستوں) کو بھی، دونوں فریقوں کو ہم (دنیا میں) سامانِ زیست دیے جا رہے ہیں۔ یہ تیرے رب کا عطیہ ہے اور تیرے رب کی عطا کو روکنے والا کوئی نہیں ہے۔ مگر دیکھ لو کہ (دنیا ہی میں) ہم نے ایک گروہ کو (جو نیکوکار ہے) دوسرے گروہ پر (جو بدعمل ہے) کیسی فضیلت دے رکھی ہے اور آخرت میں تو اس (نیکوکار) گروہ کے درجے اور بھی زیادہ بڑے ہوں گے اور ان کی فضیلت اور بھی زیادہ بڑھ چڑھ کر ہو گی۔''

اس آیت کی تشریح میں بیان کیا گیا ہے:

''یعنی دنیا میں بھی یہ فرق نمایاں ہو جاتا ہے کہ آخرت کے طلب گار دنیا پرست

لوگوں پر فضیلت رکھتے ہیں۔ یہ فضیلت اس اعتبار سے نہیں ہے کہ ان کے کھانے اور لباس اور مکان اور سواریاں اور تمدن و تہذیب کے ٹھاٹھ ان سے کچھ بڑھ کر ہیں بلکہ اس اعتبار سے ہے کہ یہ جو کچھ بھی پاتے ہیں' صداقت' دیانت اور امانت کے ساتھ پاتے ہیں اور وہ جو کچھ پا رہے ہیں' ظلم سے' بے ایمانیوں سے اور طرح طرح کی حرام خوریوں سے پا رہے ہیں۔ پھر ان کو جو کچھ ملتا ہے وہ اعتدال کے ساتھ خرچ ہوتا ہے۔ اس میں سے حقداروں کے حقوق ادا ہوتے ہیں۔ اس میں سے سائل اور محروم کا حصہ بھی نکلتا ہے اور اس میں سے خدا کی خوشنودی کے لیے دوسرے نیک کاموں پر بھی مال صرف کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس دنیا پرستوں کو جو کچھ ملتا ہے۔ وہ بیشتر عیاشیوں اور حرام کاریوں اور طرح طرح کے فساد انگیز اور فتنہ خیز کاموں میں پانی کی طرح بہایا جاتا ہے۔ اس طرح تمام حیثیتوں سے آخرت کے طلب گار کی زندگی خدا ترسی اور پاکیزگی اخلاق کا ایسا نمونہ ہوتی ہے جو پیوند لگے ہوئے کپڑوں اور خس کی جھونپڑیوں میں بھی اس قدر درخشاں نظر آتا ہے کہ دنیا پرست کی زندگی اس کے مقابلے میں ہر چشمِ بینا کو تاریک نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے جبار بادشاہوں اور دولت مند امیروں کے لیے بھی ان کے ہم جنس انسانوں کے دلوں میں کوئی سچی عزت اور محبت اور عقیدت کبھی پیدا نہ ہوئی اور اس کے برعکس فاقہ کش اور بوریا نشین اتقیاء کی فضیلت کو خود دنیا پرست لوگ بھی ماننے پر مجبور ہو گئے۔ یہ کھلی کھلی علامتیں اس حقیقت کی طرف صاف اشارہ کر رہی ہیں کہ آخرت کی پائیدار اور مستقل کامیابیاں ان دونوں گروہوں میں سے کس کے حصے میں آنے والی ہیں۔'' (تفہیم القرآن جلد دوم)

اہل سنت کے ایک مشہور امام' امام شافعیؒ نے ایک دفعہ اپنے استاد حضرت وکیعؒ سے عرض کیا کہ کوئی ایسی تدبیر بتایئے جس سے حافظے کی کمزوری جاتی رہے اور حافظہ ٹھیک ہو جائے۔ اس پر حضرت وکیعؒ نے فرمایا کہ ''اللہ کی نافرمانی اور گناہ سے بچو کیونکہ حافظے کا

علاج ہے۔ علم اللہ تعالیٰ کا ایک نور ہے اور یہ نور ان کو نہیں دیا جاتا جنہوں نے گناہوں سے اپنی زندگی گندی کر لی ہو۔"

غرضیکہ جن اعمال نیک کا خدا نے حکم دیا ہے، ان میں سے کوئی عمل لے کر اس کے دنیوی نتائج پر غور کر لیجیے۔ آپ آخر کار اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ وہ عمل نیک آخرت ہی کو نہیں بلکہ دنیا کو بھی سنوار دیتا ہے۔

اسلام کے بنیادی احکام میں ہر صاحبِ استطاعت پر زکوٰۃ اور حج فرض کیے گئے ہیں اور حکم دیا گیا ہے کہ خدا اور رسولؐ کی اطاعت کی جائے، آخرت کی فکر رکھی جائے اور دنیا میں اللہ تعالیٰ نے جو مادی اور روحانی نعمتیں عطا کی ہوئی ہیں، ان کا شکر ادا کیا جائے۔ ایسے ہی اسلام کے نظامِ اخلاق میں تقویٰ، عفو، صلہ رحمی اور تواضع کی توصیف فرمائی گئی ہے اور حسد، طمع اور ریا کو سخت ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح اسلام نے مومن کے لیے اس شے کو پسند کیا ہے کہ وہ خدا کی عطا کردہ عقل سے کام لے۔ اپنے مسلمان بھائیوں کا سچا خیر خواہ ہو، نصیحتوں پر کان دھرے اور زندگی کے مختلف امور میں فراخ حوصلگی کا ثبوت دے۔

اللہ رب العٰلمین، حضور ہادی عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے بعد صلحائے امت جہاں ان اوصافِ حسنہ کے اخروی فوائد کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لوگوں کو پاک زندگی گزارنے کی تلقین کرتے رہے ہیں۔ وہاں انہوں نے ان کے دنیوی فوائد کے بارے میں بھی وضاحت فرمائی ہوئی ہے۔

سورۂ یونس آیت ۱۰۸ میں ارشاد ہوا ہے:

"(اے نبیؐ) کہہ دیجیے کہ اے لوگو، تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے حق آ چکا ہے۔ اب جو سیدھی راہ اختیار کرے، اس کی راست روی اسی کے لیے مفید ہے اور جو گمراہ رہے گا، اس کی گمراہی اسی کے لیے تباہ کن ہے اور میں تمہارے اوپر کوئی حوالہ دار نہیں

ہوں۔"

سورۃ المزمل، آیت ۱۹ میں فرمایا گیا ہے:

"بے شک یہ ایک نصیحت ہے۔ اب جس کا جی چاہے، اپنے رب کی طرف جانے کا راستہ اختیار کرلے۔"

سورۂ یونس آیات ۶۲، ۶۳، ۶۴ میں بشارت دی گئی ہے کہ:

"سنو، جو اللہ کے دوست ہیں، جو ایمان لائے اور جنہوں نے تقویٰ کا رویہ اختیار کیا، ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں، دنیا اور آخرت دونوں زندگیوں میں ان کے لیے بشارت ہی بشارت ہے۔ اللہ کی باتیں بدل نہیں سکتیں۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔"

حضرت علیؓ پرہیزگاری اور نیکوکاری کے دنیوی اور اخروی دونوں فوائد بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"دنیا میں دو طرح کے عمل کرنے والے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو دنیا کے لیے عمل کرتے ہیں، دنیا کے لیے آخرت سے بے تعلق ہو جاتے ہیں، اپنے بعد والوں کی مفلسی سے ڈرتے ہیں اور اپنی زندگی دوسروں کے نفع کے لیے ختم کر دیتے ہیں--- دوسرے وہ جو دنیا میں آخرت کے لیے عمل کرتے ہیں۔ ان کی دنیاوی ضروریات بغیر عمل کے پوری ہو جاتی ہیں۔ وہ ایک ساتھ دونوں مزے اٹھاتے ہیں۔ دونوں گھروں کے مالک ہوتے ہیں اور خدا کی بارگاہ میں معزز۔"

امام جعفر صادقؒ کا ارشاد ہے: "خدا نے دنیا کی طرف وحی کی ہے کہ جو شخص میری خدمت کرتا ہے تو اس کی خدمت کر، اور جو تیری خدمت کرتا ہے اسے تھکا دے۔"

حضور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی کئی احادیث میں نیک اعمال کے دنیوی فوائد کو واضح فرمایا گیا ہے:

حضرت عبداللہؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حج اور عمرہ یکے بعد دیگرے کرتے رہو۔ بے شک وہ دونوں محتاجی اور گناہوں کو اس طرح دور کرتے ہیں جس طرح بھٹی لوہے اور سونے اور چاندی کی میل کچیل کو دور کرتی ہے۔ (ترمذی)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خیرات کرنے سے مال مین کمی نہیں آتی اور معاف کرنے سے خدا بندے کی عزت بڑھاتا ہی ہے اور جس نے خدا کی رضا جوئی کے لیے تواضع کی، خدا اس کے درجے بلند فرماتا ہے۔ (مسلم)

حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اس بات کو محبوب رکھتا ہے کہ اس کے رزق میں کشادگی ہو اور اس کی عمر دراز ہو، اسے چاہیے کہ رشتے داروں سے نیک سلوک کرے۔ (بخاری، مسلم)

حضرت ابوبکر صدیقؓ فرماتے ہیں:

”جو مومن شکر گزار ہوتا ہے، وہ عافیت کے بہت قریب ہوتا ہے۔“

نیز آپؓ نے فرمایا: ”ہم نے بزرگی کو پرہیزگاری میں،
بے نیازی کو یقین میں،
اور عزت کو تواضع میں پایا۔“

حضرت علیؓ کا فرمان ہے:

”جو شخص اپنے اور خدا کے درمیان حالات کی اصلاح کرے گا، خدا اس کے اور لوگوں کے تعلقات درست کردے گا،

جو آخرت کے معاملات ٹھیک کرے گا، خدا اس کے دنیا کے معاملات ٹھیک کر دے گا،

جس کا نفس نصیحت گر ہوگا، خدا اس کا نگران ہوگا۔"

نیز آپؒ نے فرمایا: "صدقہ دے کر ایمان کو استوار کرو اور زکوٰۃ دے کر دولت کی حفاظت کرو۔"

آپؒ ہی کے یہ مقولے بھی ہیں۔

"جسم کی صحت کا انحصار حسد کی کمی پر ہے۔"

"سرداری فراخ حوصلگی سے حاصل ہوتی ہے۔"

"حلیم کو اس کے حلم کا پہلا عوض تو یہ ملتا ہے کہ لوگ جاہل کے مقابلے میں اس کے معاون ہو جاتے ہیں۔"

"بے شک پرہیز گاری رضائے الٰہی (حاصل ہونے کا ذریعہ ہے نیز) روز قیامت (کی بخشش) کا سامان ہے۔ ہر غلامی سے آزادی اور ہر ہلاکت سے بچاؤ کا موجب ہے۔"

امام غزالیؒ فرماتے ہیں: "تین چیزیں خباثت قلب کو ظاہر کرتی ہیں۔ حسد، ریا اور گھمنڈ۔ عقلمندوں کو ان سے بچنا چاہیے۔ جو شخص ان سے محفوظ رہے گا، وہ دوسری مصیبتوں سے بھی محفوظ رہے گا۔"

سید عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں: "لوگ تجھے تکبر کرنے سے بڑا نہیں سمجھ سکتے بلکہ تو تواضع کرنے سے بڑا ہوگا۔"

مفتی محمد حسنؒ فرماتے ہیں: "نیک عمل سے دنیا میں بھی جزا ملتی ہے کہ ایک نیکی کے بعد دوسری نیکی کی توفیق ہوتی ہے اور گناہ کی سزا دنیا میں بھی ملتی ہے کہ ایک گناہ کے بعد دوسرے گناہ کی جرأت ہوتی ہے۔"

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اپنی ایک مجلس میں فرمایا کہ مولانا

عبید اللہ سندھی نے نقل کیا کہ علامہ شبلی نعمانی نے ان کے سامنے فرمایا کہ تجربے سے یہ بات ثابت ہوئی کہ قوم کو اصلاحی فائدہ وہی شخص پہنچا سکتا ہے جس میں تقدس و تقویٰ ہو۔ اس کے بغیر کتنا ہی بھاری عالم اور محقق ہو، اصلاحِ خلق اس سے نہیں ہو سکتی۔“

خواجہ حسن بصریؒ فرماتے ہیں: ”جب تم کسی شخص سے دشمنی کرنا چاہو تو پہلے اس پر نظر کرو۔ اگر وہ شخص خدا کا مطیع ہے تو اس (کو ضرر پہنچانے) سے بچو۔ کیونکہ خدا اس کو کبھی تمہارے قبضے میں نہ دے گا اور تمہارے لیے اس کو تنہا نہ چھوڑے گا اور اگر وہ خدا کا نافرمان ہے تو تم کو اس سے دشمنی کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ اپنے نفس کو خواہ مخواہ اس کی دشمنی میں پریشان نہ کرو۔ (وہ اپنی نافرمانی کے باعث خود ہی ضرر اٹھا لے گا)

غرضکہ شریعت اسلامی، جیسے کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے فرمایا ہے:

”دنیا اور آخرت کی سعادتوں کی ضامن ہے۔“

جناب بدیع الزمان نورسی فرماتے ہیں: ”دین زندگی کی روح، اس کا نور اور اس کی بنیاد ہے۔“

حضرت امام جعفر صادقؒ کا فرمان ہے: ”ہمارا دین سراپا ادب ہے، جو اسے ملحوظ نہیں رکھے گا وہ حرماں نصیب ہے۔“

لہٰذا اللہ تبارک تعالیٰ، اللہ کے بزرگ نبیؐ اور سلف صالحین سب نے تاکید کے ساتھ تزکیۂ نفس کا حکم دیا ہے۔

* * *

تزکیۂ نفس کی تاکید

سورۃ الشمس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

"قسم ہے سورج کی اور اس کی دھوپ کی،
قسم ہے چاند کی جب کہ وہ اس کے پیچھے آتا ہے،
قسم ہے دن کی جب کہ وہ اس (سورج) کو نمایاں کر دیتا ہے،
قسم ہے رات کی جب کہ وہ اس (سورج) کو ڈھانک دیتی ہے،
قسم ہے آسمان کی اور اس ذات کی جس نے اسے قائم کیا،
قسم ہے زمین کی اور اس ذات کی جس نے اسے بچھایا،
قسم ہے نفسِ انسانی کی اور اس ذات کی جس نے اسے ہموار کیا، پھر اس کی بدی اور اس کی پرہیزگاری اس پر الہام کر دی۔"

اتنی زیادہ قسمیں کھانے کے بعد آخر میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ۝	"یقیناً کامیاب ہوا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اسے دبا دیا۔"

نفس کا تزکیہ کرنے اور نفس کو دبا دینے کی تشریح یوں کی گئی ہے کہ:

"تزکیہ کا مطلب ہے پاک کرنا، ابھارنا اور نشوونما دینا۔ سیاق وسباق سے اس صاف مطلب یہ ہے کہ جو اپنے نفس کو فجور سے پاک کرے۔ اس کو ابھار کر تقویٰ پر۔

جائے اور اس کے اندر بھلائی کو نشوونما دے، وہ فلاح پائے گا۔

اس کے مقابلے میں دَسّٰھا کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کا مصدر تدسیہ ہے۔ تدسیہ کے معنی دبانے، چھپانے، اغوا کرنے اور گمراہ کر دینے کے ہیں۔ سیاق وسباق سے اس کا مطلب بھی واضح ہو جاتا ہے کہ وہ شخص نامراد ہوگا جو اپنے نفس کے اندر پائے جانے والے نیکی کے رجحانات کو ابھارنے اور نشوونما دینے کے بجائے ان کو دبا دے، اس کو بہکا کر برائی کے رجحانات کی طرف لے جائے اور فجور کو اس پر اتنا غالب کر دے کہ تقویٰ اس کے نیچے اس طرح چھپ کر رہ جائے جیسے قبر پر مٹی ڈال دینے کے بعد لاش چھپ جاتی ہے۔"

(تفہیم القرآن، جلد ششم)

عام سادے الفاظ میں اس بات کو یوں سمجھ لیجئے کہ انسان کے اندر نیکی اور برائی دونوں کی صلاحیتیں موجود ہیں۔ جس نے کوشش کی کہ برائیوں کو اپنے آپ سے دور کر دوں اور نیکیوں کو زیادہ سے زیادہ اختیار کروں، وہ کامیاب ہوگیا۔ مگر جس نے برائیوں کو تو کھلے بندوں پلنے بڑھنے دیا اور نیکیوں سے ایسی غفلت برتی کہ وہ اس کی کثیر برائیوں کے نیچے کہیں دب دبا کر رہ گئیں، اس نے گھاٹے کا سودا کیا۔

جب حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ خانہ کعبہ کی دیواریں اٹھا رہے تھے تو وہ ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کرتے جا رہے تھے۔

دعائے ابراہیمی

"......اے رب، ان لوگوں میں خود انہیں کی قوم سے ایک ایسا رسولؐ اٹھائیو جو انہیں تیری آیات سنائے، انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے......"

(البقرہ:۱۲۹)

حضرت زیدؓ بن ارقم بیان کرتے ہیں کہ حضورؐ یہ دعا مانگا کرتے تھے۔

دعا

"خدایا، میرے نفس کو اس کا تقویٰ عطا کر اور اس کا تزکیہ کر۔ تو ہی وہ بہتر ہستی

سکن ہ منے

ہے جو اس کا تزکیہ کر سکتی ہے۔ تو ہی اس کا سرپرست اور مولا ہے۔" (نسائی)

حضرت ابوذرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ جہاں کہیں بھی تم ہو اللہ سے ڈرتے رہو اور (اگر) برائی (کا ارتکاب ہو ہی جائے تو اس) کے بعد نیکی کر لیا کرو۔ وہ اس برائی کو مٹا دے گی اور لوگوں کے ساتھ اچھے خلق سے پیش آیا کرو۔ (ترمذی)

حضرت ابوذر غفاریؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مجھ سے فرمایا کہ نیکی میں سے کسی چیز کو حقیر نہ سمجھو اگرچہ وہ اتنی ہی ہو کہ تم اپنے بھائی کے ساتھ خندہ پیشانی سے ملاقات کرو۔ (مسلم)

ذیل میں تاریخ اسلام کی بعض بزرگ ہستیوں کے ارشادات پیش کیے جاتے ہیں جو انہوں نے تزکیہ نفس کے سلسلے میں فرمائے ہیں۔

☆ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا: "اپنی عمر کے اس دن پر رو جو گزر گیا اور اس میں تو نے کوئی نیکی نہیں کی۔"

"گناہ سے توبہ کرنا واجب ہے مگر گناہ سے بچنا واجب تر ہے۔"

"اگر کوئی نیکی کسی وجہ سے رہ جائے تو اسے حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ اور اگر اسے پالو تو آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔"

"مَا فَاتَ کا تدارک مَا اٰتَ سے کرو اور پرانے گناہوں کو نئی نیکیوں سے مٹا ڈالو۔"

مَا فَاتَ کا مطلب ہے وہ جو گزر گیا۔ مَا اٰتَ کا مطلب ہے وہ جو آنے والا ہے۔

☆ حضرت عمرؓ نے فرمایا:

"(اے مسلمانو!) تم اپنے اخلاق کی بناء پر دشمنوں پر غالب آرہے ہو اور یہ کہ

تمہارے ساتھ فرشتے مامور ہیں۔ ان سے حیا کرتے رہو اور برائیوں سے بچو۔‘‘

☆ حضرت عثمانؓ نے فرمایا:

’’لوگو، تم ایک عارضی جگہ پر ٹھہرے ہوئے زندگی کی منزلیں پوری کر رہے ہو۔ اس لیے تم جتنے خیر کے کام کر سکتے ہو انہیں انجام دیتے ہوئے موت کی طرف بڑھو۔‘‘

’’لوگو، تم گھر میں اپنے آپ کو قلعہ بند سمجھتے ہو حالانکہ تم عمر کے پچھلے حصے میں ہو، اس لیے اپنی باقی ماندہ زندگی میں بہت جلد نیک کام انجام دو اور جو کر سکتے ہو اس میں دریغ نہ کرو۔ کیونکہ ہمیں صبح یا شام کو کوچ کرنا ہوگا۔‘‘

’’اپنے گناہوں کے علاوہ کسی سے نہ ڈرو۔‘‘

☆ حضرت علیؓ نے فرمایا:

’’جو شخص خود اپنی اصلاح نہیں کرتا، وہ دوسروں کے حق میں کبھی مصلح نہیں بن سکتا۔‘‘

’’فسق و فجور کے مقامات سے دور رہ کہ یہ خدا تعالیٰ کے غضب کے مقامات اور اس کے عذاب کے محل ہیں۔‘‘

’’دنیا سے وہ توشہ اپنے ساتھ لے کر چلو جس سے کل قیامت کے دن اپنے آپ کو عذابِ الٰہی سے بچا سکو۔‘‘

’’خدا کے واسطے کم از کم یہ تو کرو کہ گناہ کرنے میں خدا کی نعمتوں سے امداد نہ لو۔‘‘

☆ امام جعفر صادقؒ نے فرمایا:

’’گناہ ناسور ہے۔ اگر ترک نہ کرو گے تو برابر بڑھتا رہے گا۔‘‘

☆ حضرت مسلم بن یسارؒ، جو حضرت طلحہؓ کے غلام تھے، فرمایا کرتے تھے: ’’ایمان باللہ کے لیے یہ ضروری ہے کہ انسان ان تمام باتوں کو ترک کر دے جو اللہ کو ناپسند ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ بندے کا ایمان کس کام کا، اگر وہ خدا کی ناپسندیدہ باتوں کو نہیں

چھوڑتا۔“

☆ حضرت فضیلؒ نے فرمایا: ”اگر انسان چالیس برس کی عمر تک پہنچ کر بھی گناہ نہ چھوڑے اور اپنی سرکشی سے تائب نہ ہو تو شیطان اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرتا ہے (اور کہتا ہے) کہ نجات نہ پانے والے چہرے پر میں فدا!“

☆ حضرت شقیق بلخیؒ کا فرمان ہے: ”علم کا فائدہ تین باتوں پر عمل کرنے میں ہے، ورنہ یہ فائدہ نہیں دیتا چاہے اسّی (۸۰) صندوق کتابوں کے پڑھ لے:

1- نہ محبت رکھ دنیا سے کہ یہ مسلمان کا گھر نہیں ہے۔

2- نہ دوست رکھ شیطان کو کہ یہ مسلمان کا ساتھی نہیں ہے۔

3- نہ تکلیف دے کسی کو کہ یہ مسلمان کا پیشہ نہیں ہے۔

واضح رہے کہ تزکیہ نفس کی تاکید کرنے سے اصل مقصد یہ ہے کہ مخاطبین اپنے آپ کو برائیوں سے پاک کرنے اور اچھائیوں سے مزین کرنے کا کام عملاً شروع کریں۔ یہ نہیں کہ صرف نیکیوں کی تعریفیں ہی کی جاتی رہیں--- بلاشبہ اچھی چیز کی تعریف کرنا بھی بڑی اچھی بات ہے اور تزکیہ نفس کا پہلا قدم یہی ہوتا ہے کہ اچھائیوں سے الفت اور برائیوں سے نفرت پیدا ہو۔ تاہم یہ احتیاط لازمی ہے کہ کہیں ایسے نہ ہو کہ ابتدائی قدم خود ہی مقصود بن جائے اور اصل کام ملتوی ہی ہوتا چلا جائے۔

نفس کا تزکیہ جسے کہا گیا ہے، وہ بہرحال ایک عمل ہے صرف نظریہ ہی نہیں۔ نیکی کی کروڑوں تعریفیں کرنے سے بھی انسان کا نفس پوری طرح پاک نہیں ہوتا جب تک نیکی کو عملاً اختیار نہ کیا جائے اور جب معاملہ صرف نیکی کی تعریف و توصیف تک ہی رہ جائے، تو پھر معاشرے کے وہ انفرادی اور اجتماعی دکھ بھی دور نہیں ہوتے جن کا منبع گناہ ہیں۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ نفس کو پاک کرنے کے لیے عملی جدوجہد شروع کی جائے اور صرف زبانی جمع

خرچ تک نہ رہا جائے۔ پانی پانی کرتے رہنے سے پیاس نہیں بجھا کرتی، جب تک پانی کا گھونٹ بھرا نہ جائے۔

سورۃ لانفال، آیت ۲۱ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ قَالُوا سَمِعْنَا
وَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ٥

"ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے
کہا کہ ہم نے سنا حالانکہ وہ نہیں سنتے۔"

اگر ہم نیکی کی تعریف و توصیف تو کرتے جائیں گے مگر عملاً اسے اختیار نہیں کریں گے تو ہماری حالت انہیں لوگوں جیسی ہو جائے گی جو کہتے تو یہی ہیں کہ ہم نے سن لیا حالانکہ انہوں نے کچھ نہیں سنا ہوتا۔

حضرت ابوبکرؓ فرماتے ہیں: "اللہ اپنے بندوں سے اس بات پر راضی نہیں کہ وہ اخاعت کا صرف زبانی اقرار کر لیں۔ وہ تو عملی اطاعت چاہتا ہے۔"

صحابہ کرامؓ کے حالات پڑھیں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ نیکو کار کتنی جلدی اطاعت اور عمل کو اختیار کر لیتے تھے۔

زمانہ جاہلیت میں عربوں کے ہاں شراب بہت پی جاتی تھی۔ اسلام آیا تو کافی دیر شراب کے بارے میں کوئی حکم نہ آیا۔ جس دن شراب بالکلیہ حرام ہوئی، اس دن تک بعض کبار صحابہؓ کے ہاں بھی شراب کا استعمال ہوتا تھا۔ مگر جیسے ہی اس کے بارے میں واضح حکم آیا۔ ایک دم مٹکے توڑ دیئے گئے اور شراب بہا دی گئی۔ صحیح بخاری میں حضرت انسؓ کی ایک روایت ہے کہ میں حضرت ابوطلحہؓ کے ہاں سب کو شراب پلا رہا تھا۔ اس وقت شراب کی حرمت کا حکم نازل ہوا۔ حضورؐ نے ایک منادی کرنے والے کو حکم دیا کہ حرمت شراب کی منادی کر دے۔ جب منادی ہو رہی تھی تو ابوطلحہؓ نے مجھے کہا کہ باہر نکل کر دیکھ کہ یہ آواز کیسی ہے۔ میں نے نکل کر دیکھا اور پھر ابوطلحہؓ کو بتایا کہ حرمتِ شراب کی منادی ہو رہی ہے۔ اس

پر ابو طلحہؓ بولے کہ اٹھ اور شراب کو بہا دے۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ اس دن مدینے کے راستوں میں شراب بہی بہی پھر رہی تھی۔

بخاری ہی میں حرمتِ شراب کے بارے میں حضرت انسؓ کی ایک اور حدیث بیان ہوئی ہے۔ جس میں وہ بتاتے ہیں کہ ابو طلحہؓ نے مجھ سے کہا کہ اے انسؓ ان مٹکوں کو بہا دو۔ اور اس کے بعد کہتے ہیں کہ پھر کسی نے کوئی بات نہیں پوچھی اور نہ اس حکم کے خلاف کوئی کام کیا۔

جب حضورؐ مبعوث ہوئے تو یہودیوں کا قبلہ بیت المقدس تھا اور کافروں کا خانہ کعبہ۔ چونکہ بیت المقدس اہل کتاب کا قبلہ تھا اور خانہ کعبہ کے قبلہ ہونے کے بارے میں خدا کی طرف سے کوئی حکم ابھی نازل نہیں ہوا تھا، اس لیے حضورؐ اپنی ساری مکی زندگی بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے اور مسلمان بھی اسی کو اپنا قبلہ سمجھتے تھے۔ ہجرت کے بعد بھی کچھ دیر بیت المقدس ہی قبلہ رہا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس کے بجائے خانہ کعبہ کو قبلہ بنا دیا۔ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی کہ ایک قوم مدتوں ایک طرف منہ کر کے نماز پڑھتی رہی ہو اور پھر ایک دم اسے کہا جائے کہ تم اب اس طرف نہیں بلکہ اس طرف رخ کر کے عبادت کرو۔ خود کلام پاک میں بھی قبلے کی اس تبدیلی کے بارے میں بیان ہوا ہے کہ:

وَاِنَّ كَانَتُ لَكَبِيُرَةً. (البقرہ : ۱۴۳) ”بے شک یہ معاملہ تھا تو بڑا سخت۔“

مگر صحابہ کرامؓ کی اطاعت شعاری کے لیے یہ کوئی بڑی سخت بات نہیں تھی۔ جیسے ہی انہوں نے یہ حکم سنا ایک دم اپنا رخ بدل لیا اور نئے قبلے کی طرف منہ کر کے عبادت کرنے لگے۔ ذیل کی عبارت سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس معاملے میں مسلمانوں کی اطاعت کا کیا حال تھا۔

”(قبلے کی تبدیلی کا) کا یہ حکم رجب یا شعبان ۲ھ میں نازل ہوا۔ ابن سعدؒ کی

روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم بشر بن براء بن معرور کے ہاں دعوت پر گئے ہوئے تھے، وہاں ظہر کا وقت آگیا اور آپ لوگوں کو نماز پڑھانے کھڑے ہوئے۔ دو رکعتیں پڑھا چکے تھے کہ تیسری رکعت میں یکایک وحی کے ذریعے سے یہ آیت نازل ہوئی اور اسی وقت آپ اور آپ کی اقتدا میں جماعت کے تمام لوگ بیت المقدس سے کعبے کے رخ پھر گئے۔ اس کے بعد مدینہ اور اطراف مدینہ میں اس کی عام منادی کی گئی۔ براء بن عازب کہتے ہیں کہ ایک جگہ منادی کی آواز اس حالت میں پہنچی کہ لوگ رکوع میں تھے۔ حکم سنتے ہی سب کے سب اسی حالت میں کعبے کی طرف مڑ گئے۔ حضرت انس بن مالک کہتے ہیں کہ (قبیلہ) بنی سلمہ میں یہ اطلاع دوسرے روز صبح کی نماز کے وقت پہنچی۔ لوگ ایک رکعت پڑھ چکے تھے کہ ان کے کانوں میں آواز آئی۔ ”خبردار ہو، قبلہ بدل کر کعبے کی طرف کر دیا گیا ہے۔“ سنتے ہی ساری جماعت نے اپنا رخ بدل لیا۔“ (تفہیم القرآن جلد اول)

احکامِ الٰہی کی فوری اطاعت کے معاملے میں مسلمان خواتین بھی مردوں سے پیچھے نہیں تھیں۔

اسلام سے پہلے عرب عورتوں میں پردے اور حیا کے وہ اصول موجود نہیں تھے جو اسلام نے متعارف کرائے، مگر اپنی اطاعت شعاری کے باعث انہوں نے ان اصولوں کو فوراً اپنانے میں ذرا بھی حیل وحجت نہ کی۔

حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی:

وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ	”اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں۔“

تو عورتوں نے اپنے تہہ بندوں کو کناروں سے پھاڑ کر ان کی اوڑھنیاں بنالیں۔

(بخاری)

خرابیِ نفس

کے

اسباب

۱۔ غفلت

”اور یاد کرو جب کہ ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے نہ کیا۔ اس نے کہا۔ ”کیا میں اس کو سجدہ کروں جسے تو نے مٹی سے بنایا ہے۔“ پھر وہ بولا۔ ”دیکھ تو سہی، کیا یہ اس قابل تھا کہ تو نے اسے مجھ پر فضیلت دی؟ اگر تو مجھے قیامت کے دن تک مہلت دے تو میں اس کی پوری نسل کی بیخ کنی کر ڈالوں۔ بس تھوڑے ہی لوگ مجھ سے بچ سکیں گے۔“ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ”اچھا تو جا، ان میں سے جو بھی میری پیروی کریں، تجھ سمیت ان سب کے لیے جہنم ہی بھرپور جزاء ہے۔ تو جس جس کو اپنی دعوت سے پھسلا سکتا ہے پھسلا لے۔ ان پر اپنے سوار اور پیادے چڑھا لا، مال اور اولاد میں ان کے ساتھ ساجھا لگا اور ان کو وعدوں کے جال مین پھانس--- اور شیطان کے وعدے ایک دھوکے کے سوا اور کچھ بھی نہیں--- یقیناً میرے بندوں پر تجھے کوئی اقتدار حاصل نہ ہو گا اور توکل کے لیے تیرا رب کافی ہے۔“ (سورۂ بنی اسرائیل: ۶۱ تا ۶۵)

ہمارے نفس میں برائیاں پیدا ہو جانے کا اصل منبع تو یہ دشمنِ ازلی ہی ہے جو ہماری رگوں میں خون کی طرح گردش کرتا رہتا ہے اور چونکہ آنکھوں سے نظر نہیں آتا، اس لیے اکثر پتہ نہیں چلتا کہ وہ کس کس وقت کیا کیا خوشنما طریقے اختیار کر کر کے دل کو راہ سے بے راہ کر رہا ہے۔

ام المومنین حضرت صفیہؓ سے ایک روایت بیان ہوئی ہے جسے میں انہوں نے بتایا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَجْرِیْ مِنَ الْاِنْسَانِ "بے شک شیطان انسان (کی رگوں)
مَجْرَی الدم۔ (ابوداؤد) میں خون کی طرح گردش کرتا ہے۔"

ہمارے نفس کی خرابی کی پہلی وجہ تو یہی ہے کہ ہم اس ہوشیار، موقعہ شناس، حیلہ جو کینہ توز اور وسوسہ انداز دشمن کی طرف سے غافل رہتے ہیں اور ہماری یہ غفلت اسے وہ مواقع بہم پہنچاتی رہتی ہے جن سے فائدہ اٹھا کر وہ ہم احمقوں کا متاعِ کارواں لوٹ لے جاتا ہے۔ بغیر اس کے کہ ہمیں پورا احساس زیاں ہو---

شیطان ہوشیار رہے: اس طرح کہ جس مقصد کا عزم لے کر وہ دنیا میں آیا تھا، اس مقصد کی طرف سے وہ کبھی لاپروا نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس انسانوں کی اکثریت اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیے ہوئے وعدے کو اس طرح بھول گئی ہے گویا اس نے اللہ سے وہ وعدہ کبھی کیا ہی نہیں تھا۔

شیطان نے دنیا میں آنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے سامنے اس عزم کا اظہار کیا تھا کہ:

فَبِعِزَّتِکَ لَاُغْوِیَنَّھُمْ اَجْمَعِیْنَ ۝ اِلَّا "تیری عزت کی قسم، میں ضرور ان سب
عِبَادَکَ مِنْھُمُ الْمُخْلَصِیْنَ ۝ کو گمراہ کر کے رہوں گا، سوائے ان میں
سے تیرے خالص بندوں کے۔"

انسانوں نے بھی دنیا میں آنے سے پہلے ہی ایک عہد کر لیا تھا۔

سورۃ الاعراف ۱۷۲ میں بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قیامت تک پیدا ہونے والے تمام انسانوں کو بیک وقت جمع کر کے ان سے دریافت فرمایا تھا کہ:

اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ ؕ "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔"

تو انہوں نے جواب دیا تھا۔

.... بَلٰی شَھِدْنَا ج "کیوں نہیں۔ ہم گواہی دیتے ہیں
(کہ آپ ہمارے رب ہیں)"

اب ہم دیکھ سکتے ہیں کہ شیطان تو اپنے ''لَأُغْوِيَنَّهُمْ'' پر پورے پورے طور پر کاربند ہے اور صبح شام اس فکر میں رہتا ہے کہ ہر ممکن طریقے سے ہر فرد بشر کو گمراہ کرتا رہے۔ مگر انسان کی روزمرہ کی زندگی میں سے اس کا ''بَلٰی'' اس طرح غائب ہو گیا ہے' گویا اس نے کبھی خدا کو اپنا رب ماننے کا اقرار کیا ہی نہیں تھا۔ غریبوں کو پیٹ کے دھندے ہی سے فرصت نہیں کہ سوچ سکیں کہ کسی کو رب ماننے کے تقاضے کیا ہیں۔ امیروں کو کھانے پہننے کی فکر کی تکلیف نہیں تھی تو انہوں نے معیارِ زندگی بڑھانے اور عیش و عشرت کے سامان حاصل کرنے کا روگ ایسا پال لیا ہے کہ وہ بھی اتنے ہی مصروف ہیں جتنے غریب۔ باقی رہا متوسط طبقہ جسے کسی قوم کا بہترین حصہ سمجھا جاتا ہے کیونکہ نہ اس کے پاس اتنا کم ہوتا ہے کہ وہ چوری' دھوکا' فریب' گداگری اور بددیانتی کا مرتکب ہو اور نہ اس کے پاس اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ وہ ہوسِ زر' عیش و عشرت اور فسق و فجور کا شکار ہو۔ سو اس طبقے کا بھی یہ حال ہے کہ اس میں اپنی معیاری پوزیشن سے فائدہ اٹھانے کا خیال بہت کم پایا جاتا ہے۔ کیونکہ اس کے بھی اکثر حصے نے غریبوں کو دیکھ دیکھ کر اپنی حالت پر مطمئن ہونے کے بجائے امیروں کو دیکھ دیکھ کر ترسنا شروع کر دیا ہے اور سر دھڑ کی بازی لگا کر دوڑ رہے ہیں کہ کسی طرح ان سے زیادہ سے زیادہ قریب ہو جائیں۔ لہٰذا رب کی ربوبیت کو ماننے کے تقاضے پورے کرنے کے سلسلے میں یہ لوگ بھی بالکل لاپروا ہیں۔

سوائے تھوڑے سے نیک نفوس کے ---- انسانوں کی غالب اکثریت اپنے کیے ہوئے وعدے اور اپنے مقصد زندگی کے بارے میں مجرمانہ قسم کی غفلت کا شکار ہے۔ اس کے برعکس شیطان کا یہ حال ہے کہ کیا مجال وہ اپنے ''لَأُغْوِيَنَّهُمْ'' سے ذرا سی بھی غفلت برتے۔ صبح کی روشنی ہو یا رات کا اندھیرا' سکھ کی نرم و نازک ہوائیں چل رہی ہوں یا دکھ کی جلا ڈالنے والی گرم آندھیاں' انسان فتح و کامرانی حاصل ہونے کی حالت میں ہو یا ناکامی اور محرومی کے چنگل میں گرفتار ہو۔ شیطان ہر صورتِ حالات میں ایسی راہیں

ڈھونڈنے میں لگا رہتا ہے جن پر چل کر وہ ان غافلوں کی غفلت سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکے' اورانہیں سیدھی راہ سے بھٹکا کر ٹیڑھی میڑھی راہوں پر لا ڈالے تاکہ یہ بیوقوف دنیا میں بھی زندگی کے صاف کشادہ راستے چھوڑ کر کانٹوں بھری' اونچی نیچی پگڈنڈیوں پر بھٹکتے اور کپڑوں کو تار تار اور جسموں کو لہولہان کرتے رہیں اور آخرت میں بھی اسی ذلت خیز جگہ میں جا داخل ہوں۔

وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ. ''جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے۔'' (البقرہ: ۲۴)

اور جو

تَرْمِي بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ. ''محل جیسی بڑی بڑی چنگاریاں پھینکتی ہو گی۔'' (المرسلٰت: ۳۲)

اور جس میں ڈالے جانے والا

لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰىo ''نہ اس میں مرے گا اور نہ زندہ (ہی) رہے گا۔'' (طٰہٰ: ۷۴)

شیطان موقع شناس ہے: وہ اس طرح کہ وہ کسی ایسے موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا' جس سے کام لے کر وہ انسان کو گمراہ کر سکے۔ اور ایسے مواقع تو زندگی میں مسلسل آتے ہی چلے جاتے ہیں کیونکہ انسانی زندگی کبھی راحت' آرام' خوش حالی' صحت اور سکون کی ٹھنڈی چھاؤں تلے خوش و خرم ہوتی ہے تو کبھی غم و الم' تکلیف' محتاجی' بیماری اور ذہنی و قلبی اذیتوں کی تپتی دھوپ میں جل رہی ہوتی ہے۔ اب دکھ کا وقت ہو یا سکھ کا ہر صورت میں انسان کے لیے آزمائش موجود ہوتی ہے۔

خوشحالی اور راحت میں جہاں اس بات کا امکان ہوتا ہے کہ انسان شکر گزار بن کر خدا کی طرف رجوع ہو گا' وہاں یہ خدشہ بھی موجود ہوتا ہے کہ وہ فخر و غرور کا شکار اور عیش و

عشرت کا عادی ہو کر شیطان کا مصاحب بن بیٹھے گا' اسی طرح مصائب اور غم والم کے وقت بھی جہاں اس بات کی توقع لگائی جا سکتی ہے کہ مصیبت زدہ شخص دل نرم ہو جانے کے باعث خدا کا مقرب بن جائے گا' وہاں یہ خطرہ بھی بہرحال موجود ہوتا ہے کہ وہ باغی بن کر بالکل ہی شیطان کا آلہ کار ہو جائے گا۔ اب انسان تو ہے غافل اور لاپروا' اس نے کہاں یہ سوچنا ہے کہ سکھ مجھے خوشی پہنچانے ہی نہیں آیا بلکہ میری آزمائش کرنے بھی آیا ہے کہ میں مسرت اور شادمانی کی حالت میں اپنے رب کو کہاں تک یاد رکھتا ہوں اور دکھ میرے لیے غم و الم کا سامان لے کر ہی نہیں آیا بلکہ میرا امتحان لینے بھی آیا ہے کہ میں آلام اور اذیتوں میں سے گزرتے ہوئے بھی کس حد تک اپنے خالق کا وفادار اور شکر گزار رہتا ہوں۔

مگر شیطان نہ غافل ہے نہ لاپروا۔ وہ انسان کی خوشی اور غم دونوں حالتوں میں اپنا مطلب نکالنے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ مسرور اور خوش حال انسان کو وہ دنیا کے عشق میں مبتلا کر کے اس کے ذہن سے آخرت کا خیال بھلاتا ہے اور اس کی طرز فکر ایسی کر دیتا ہے کہ وہ خدا کی عطا کردہ نعمتوں کے حاصل ہونے پر منعم کا شکر گزار اور مطیع ہونے کے بجائے اس کی نافرمانی کی راہوں پر چل نکلتا ہے اور یوں کفران نعمت کا مرتکب ہوتا ہے۔ دولت کے لیے جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں ان میں ایک ''خیر'' بھی ہے یعنی بھلائی۔ کیوں کہ دولت بہت سی بھلائیاں کرنے کا ذریعہ بنتی ہے' مگر بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو اس بھلائی سے مزید بھلائیاں حاصل کرنے کا کام لیں۔

مال و زر حاصل ہونے سے دل اور دماغ کے جن کونوں سے روٹی کپڑے اور دوسری ضروریاتِ زندگی کے وسائل حاصل کرنے کی فکر ختم ہوتی ہے' وہ زیادہ دیر تک خالی نہیں رہتے۔ شیطان جلد ہی انہیں فخر' غرور' تکبر' خودنمائی' مزید حاصل کرنے کی حرص' لوگوں کو شان و شوکت دکھلانے کی تمنا اور اپنی آئندہ آنے والی کئی پشتوں کی مالی جڑیں مضبوط کر جانے کی ہوس سے بھر دیتا ہے۔

اگر دولتِ ایمان کا ساتھ حاصل نہ ہو تو مادی دولت شیطان کا وہ کامیاب ہتھیار ہے جس کے ذریعے وہ انسان کا نکتہ نگاہ ہی بدلا کر رکھ دیتا ہے۔

جب اس کے پاس زر و مال موجود ہے تو آخر وہ کیوں نہ جو جی چاہے کھائے، جو جی چاہے پہنے اور جس طریقے سے چاہے زندگی گزارے۔ پھر جب بات اس کے جی کے چاہنے ہی پر آٹھہری ہو تو پھر حرام کیا اور حلال کیا؟ جب اس کے پاس دولت موجود ہے تو پھر وہ اپنے آپ کو پانی اور دودھ اور شربت تک ہی کیوں محدود رکھے۔ وہ شراب کیوں نہ پئے، جب کہ وہ اقوام جو اس وقت دنیا کی امامت کا عہدہ سنبھالے ہوئے ہیں، بے تکلف شراب پیتی ہیں۔

جب وہ خرچ کر سکتا ہے، تو پھر وہ اپنے لباس، اپنے رہنے کی جگہ اور اپنے ساز و سامان میں ضرورت سے زیادہ دکھاوے اور نمائش کو اختیار کیوں نہ کرے جب کہ ایسا کرنا لوگوں پر رعب ڈالنے کا ایک کامیاب ذریعہ ہے!۔

جب اس کے پاس موجود زندگی کو شان و شکوہ اور راحت و آرام سے گزارنے کے ذرائع موجود ہیں تو پھر آخر کیوں وہ آخرت کی فکر میں ڈر ڈر کر مرتا رہے اور کیوں نہ جی بھر کر زندگی کا لطف حاصل کرے اور کیا وجہ ہے کہ وہ ان اعمال و افعال کو اختیار نہ کرے، جنہیں "تنگ نظر" لوگ فسق و فجور کا نام دیتے ہیں۔ حالانکہ وہ ایک "نارمل" انسان کی طبعی خواہشات ہیں!

خوش حال لوگوں کی خوشحالی کو گمراہی کا ذریعہ بنانے کے لیے شیطان کا ایک کامیاب ہتھیار یہ ہے کہ عہدہ و جاہ اور دولت و ثروت حاصل کرنے والوں کے دل میں "طبقۂ اعلیٰ" کا ایک فرد بننے کی خواہش پیدا کر دی جائے۔ بس پھر اس کے بعد وہ شخص عموماً اپنی گمراہی کی منازل خود ہی طے کرتا چلا جاتا ہے۔ کیونکہ "بڑوں" کے زمرے میں داخل ہونے کی خواہش کو پورا کرنے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ بڑوں کے طور طریقے اختیار کیے جائیں۔ ورنہ "بڑے" بھلا اسے کاہے کے لیے اپنے زمرے میں داخل کرنے کا شرف

بخشیں گے اور ''بڑوں'' کی اکثریت تو اس وقت اس لادینی تہذیب کی گرویدہ ہے جس کی نمایاں خصوصیات مادہ پرستی اور آخرت فراموشی ہے۔ لہٰذا ان کے زمرے میں داخل ہونے کے لیے اسلام کے قائم کردہ حرام اور حلال کے اصولوں کو نظر انداز کیے بغیر چارہ نہیں۔ چنانچہ جس نے ''بڑوں'' میں شامل ہونا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ پہلے اپنی طرزِ زندگی اور اخلاقی اقدار بدلے۔

بہت سے خاندان ایسے دیکھنے میں آتے ہیں کہ جب تک مالی وسائل محدود تھے اور معاشرے میں کوئی اور اونچا عہدہ نہیں ملا تھا۔ اچھی بھلی مسلمانوں کی سی زندگی گزاری جاتی تھی۔ جس میں شرم وحیا' حبِ دین' اسلامی اخلاق بہت حد تک نہیں تو کسی حد تک ضرور موجود تھا۔ مگر جیسے ہی کوئی رتبہ حاصل ہو گیا یا بعض اور ذرائع سے دولت دنیا زیادہ مل گئی۔ ایک دم ''طبقہِ اعلیٰ'' کا ایک حصہ بننے کی خواہش نے زور مارنا شروع کر دیا اور پھر اغیار کے طور طریقوں کی بھونڈی نقالی' اجنبی مردوں عورتوں کا بے جا اختلاط' لباس کی عریانی' بے جا اسراف' نمود و نمائش' تعلّی' بے حیائی' سب کچھ ضروری ہو گیا۔ پھر جیسے جیسے ''بڑا'' بننے کی خواہش تیز تر ہوتی گئی۔ ''روشن خیالی'' میں اتنی ترقی ہوتی گئی کہ کھلی کھلی بدعملیاں بھی جائز سمجھی جانے لگیں۔

یہ تو ہوئیں وہ آزمائشیں جن کے ذریعے شیطان خوش حال لوگوں کو اپنے ڈھب پر لاتا ہے۔ اب باقی رہے مصیبت زدہ' غریب اور پریشان حال لوگ تو وہ بھی اسی طرح شیطان کی زد میں ہیں جس طرح مسرور اور خوش حال لوگ۔ کیونکہ اگرچہ عام خیال یہی ہے کہ غم اور تکلیفیں انسان کو خدا سے زیادہ قریب کرتی ہیں تاہم ایسے انسانوں کی بھی کمی نہیں جو محتاجی' غم اور تکلیف کی حالت میں زیادہ آسانی سے شیطان کی ریشہ دوانیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ پریشانیاں ان کے دلوں کو نرم کرنے کے بجائے ان میں بغاوت بھر دیتی ہیں۔

آخر اللہ نے اپنی مخلوق میں سے ہمیں کو کیوں محتاجی اور پریشانی میں مبتلا کیا جب

کہ اور بہت سے لوگ بڑے ٹھاٹھ سے زندگی گزار رہے ہیں۔ آخر ان لوگوں نے کیا نیکی کی اور ہم بے چاروں نے کیا گناہ کیا کہ وہ ہر طرح کے آرام و آسائش کے مالک بنے بیٹھے ہیں۔ اور ہمارے لیے نہ پیٹ بھر روٹی ہے نہ تن ڈھانکنے کو کپڑا' نہ رہنے کا کوئی ڈھنگ کا ٹھکانہ' نہ دن کا چین نہ رات کا آرام۔

مسرت اور خوشی درحقیقت جھپٹ کر لی جانے والی چیزیں ہیں۔ خود بخود نہیں ملا کرتیں---- تو پھر ہم بھی کیوں نہ اسے جھپٹنے کی کوشش کریں۔

جب ہمارے پاس ضروریات پوری کرنے کے لیے بھی کچھ نہیں تو پھر ہم کیوں چوری نہ کریں' کیوں جھوٹ نہ بولیں' کیوں لوگوں کو دھوکا نہ دیں---- جب ہم مشقت کر کے بھی محتاج رہتے ہیں تو پھر ہم کیوں نہ گداگری کریں' خیانت سے کیوں کام نہ لیں سمگلر کیوں نہ بنیں۔ آخر مسرت دوسروں ہی کے حصے میں کیوں آئی ہے ہم بھی کیوں نہ اسے حاصل کریں' چاہے صحیح طریقے سے حاصل ہو یا غلط طریقے سے۔

کیا حرام اور کیا حلال---- کیسی جنت اور کہاں کی دوزخ۔ جب مریں گے دیکھا جائے گا۔ اس دنیا میں تو یہی دیکھنے میں آ رہا ہے کہ جو زیادہ برائی کرتا ہے اسے ہی زیادہ نعمتیں حاصل ہوتی ہیں!!!

شیطان نے تو انسان کا سوچنے کا انداز ہی بدلانا ہوتا ہے۔ اس کے بعد انسان خود ہی اپنی اصلاح کے ذرائع کو بھی اپنے بگاڑ کا سامان بناتا چلا جاتا ہے۔ جب ایک دفعہ انسان کے دل میں یہ بات بیٹھ جاتی ہے کہ محتاجی اور پریشانی میں مبتلا ہو جانے کے باعث اب میں حق بجانب ہوں کہ ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے حرام یا حلال جو ذرائع بھی ہاتھ آئیں انہیں استعمال کر لوں تو پھر یہی تنگ دستی اور غم جو اسے خدا کے زیادہ قریب لانے کا ذریعہ بھی بن سکتے تھے' اسے خدا سے زیادہ دور بھگا لے جانے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔

تنگ دستی' مصائب اور پریشانی کے باعث دل میں جو نرمی پیدا ہوتی ہے' وہ

شیطان کو سخت ناگوار ہے کیونکہ یہ نرمی انسان کو خدا کے زیادہ قریب کرتی ہے۔ لہٰذا شیطان کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ ایسے انسان کے دل میں باغیانہ خیالات پیدا کر کے اس کے دل کی نرمی کو سختی میں بدل دے اور پھر جب دل سخت ہو جائے تو اس کی وہی کیفیت ہو جاتی ہے کہ وہ:

كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً۔ (البقرہ: ۷۴)
"پتھروں کی طرح سخت (ہو گئے) بلکہ ان سے بھی زیادہ سخت۔"

پھر غریبی کے ساتھ چونکہ عموماً دینی بے علمی بھی ہوتی ہے، اس لیے بہت سے لوگ تو گناہ اور ثواب سے پورے طور پر واقف بھی نہیں ہوتے۔ اور بڑی آسانی سے چوری، خیانت، جھوٹ، دھوکا فریب وغیرہ جیسے برے اعمال اختیار کر لیتے ہیں اور انہیں کبھی خیال بھی نہیں آتا کہ وہ کوئی ایسی حرکت کر رہے ہیں جس کے سلسلے میں کل مواخذہ ہوگا۔ ایسی صورت میں وہ ان لوگوں سے تو ضرور ڈرتے ہیں جو اگر انہیں جرم کرتے پکڑ لیں گے تو سزا دیں گے، مگر اس خدا سے نہیں ڈرتے جو انہیں ہمہ وقت جرم کرتے دیکھ رہا ہوتا ہے اور جو شَدِيْدُ الْعِقَاب ہے (شدید سزا دینے والا)۔

حیلہ جو: شیطان کی ایک اور صفت جو بتائی جاتی ہے، وہ یہ ہے کہ وہ بڑا۔

اسے اس بات کی بڑی مشق ہے کہ چکر کھا کھا کر انسان کے سامنے آئے اور فریب دے دے کر اسے مطمئن کر دے کہ جس راہ کی طرف وہ اسے لے جا رہا ہے، وہ برائی کی راہ ہے ہی نہیں، وہ تو عین بھلائی ہے۔

دنیا میں بڑے بڑے ظالم حکمران ایسے گزرے ہیں جو ظلم توڑتے ہوئے یہی سمجھتے رہے کہ وہ تو ملک میں نظم و نسق اور امن و امان قائم کر رہے ہیں اور شریر عناصر کا استیصال کر کے اہلِ ملک پر احسان کر رہے ہیں حالانکہ ان کے ظلم کی چکی میں شریر عناصر سے زیادہ بے گناہ پستے رہے اور ملک میں امن و امان انصاف کرنے سے قائم ہوتا ہے نہ کہ ظلم

بے شمار خوش عقیدہ لوگ دیکھنے میں آتے ہیں جو بزرگوں کی قبروں پر جا جا کر سجدے کرتے، چڑھاوے چڑھاتے اور کھلے کھلے مشرکانہ اعمال کرتے ہیں مگر شیطان ان سے یہ سب کام کراتے ہوئے انہیں بالکل مطمئن رکھتا ہے کہ یہ سب کچھ عین دینداری ہے!

بہت سے ایسے "دیندار" موجود ہیں جو اپنی دینداری کے زعم میں لوگوں کے لیے انتہائی سخت زبان استعمال کرتے ہیں، کسی پر نکتہ چینی کرتے ہیں، کسی کی عیب جوئی کرتے ہیں، کسی کے چھپے ہوئے اعمال کو الم نشرح کر کے اسے معاشرے میں رسوا کرتے ہیں، اپنے ہی مسلمان بہن بھائیوں کے لیے "بدعتی"، "مشرک" بلکہ "کافر" تک کے الفاظ بے تکلف استعمال کرتے ہیں، طعن و تشنیع سے لوگوں کے سینے چھلنی کرتے ہیں اور راہ چلتوں سے جھگڑا شروع کر دیتے ہیں---- شیطان ان سے وہ سب اعمال کرواتا جاتا ہے، جو حضورؐ کے اس فرمان مبارک کے خلاف ہوتے ہیں کہ:

"آسانی کا معاملہ کرو اور تنگی اور سختی نہ کرو اور خوش خبری سناؤ اور نفرت نہ پیدا کرو۔" (بخاری و مسلم)

مگر ان سے یہ سب ناپسندیدہ کام کرواتے ہوئے بھی شیطان ساتھ ساتھ انہیں یقین دلاتا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ تو "مومنانہ بے باکی" ہے جو مومن کی ایک بہت بڑی صفت ہے۔

اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں سے تعلق رکھنے والے بعض لوگ بزعمِ خود بڑی لگن سے تبلیغی سرگرمیوں میں مصروف ہوتے ہیں مگر درحقیقت اسلام کو دنیا میں متعارف کرانے سے بہت زیادہ ان کی توجہ اس بات پر مرکوز ہوتی ہے کہ اپنے اپنے فرقے کے نظریات کو مسلمانوں ہی کے دوسرے فرقوں کے نظریات سے درست ثابت کر دیں۔ اس طرح ان کی پوری توجہ غیر مسلموں کو مسلمان بنانے کی طرف نہیں بلکہ مسلمانوں ہی کے مختلف فرقوں کو کافر ثابت کرنے کی طرف لگی رہتی ہے۔ مگر یہ سب کچھ کرتے ہوئے

بھی وہ اپنے آپ کو شاباش دیتے رہتے ہیں کہ واہ بھئی واہ کیا بات ہے ہماری! ہم کتنی زیادہ خدمت دین کر رہے ہیں۔!

بڑے بڑے سخت گیر اور ظالم خاوند ایسے دیکھے جاتے ہیں جو اپنے رشتہ داروں کے کہے سنے میں آ کر بیویوں کے شرعی حقوق غصب کرتے اور ان پر وہ بوجھ ڈالتے ہیں جن کے لیے شریعت نے کوئی جواز نہیں رکھا، مگر ایسا کرتے ہوئے بھی وہ سمجھ یہی رہے ہوتے ہیں کہ ہم بڑے اطاعت شعار بیٹے اور بڑے جاں نثار بھائی ہیں اور ہماری جنت پکی ہے۔ حالانکہ ماں باپ کی خدمت کرنے اور رشتہ داروں سے محبت رکھنے کے لیے یہ قطعی ضروری نہیں کہ ساتھ ہی انسان ظالم خاوند بھی بن جائے۔

غرضیکہ شیطان جو کامیاب چالیں چلتا ہے ان میں ایک یہ بھی ہے کہ وہ نادان لوگوں سے خدا کی نافرمانی کے کام کرواتا ہے، مگر ساتھ ہی انہیں پورا یقین دلائے رکھتا ہے کہ یہ تو عین اطاعت ہے۔ بڑے سے بڑا گنہگار بھی اگر گناہ کو گناہ سمجھ کر کرے گا تو امکان ہے کہ کسی دن وہ ڈر جائے اور توبہ کر لے، مگر جب انسان گناہ کو ثواب ہی سمجھ لے تو پھر اس نے کہاں توبہ کرنی ہے۔!

ایسے ہی بسا اوقات شیطان لوگوں سے غیر شرعی قدم اٹھواتا ہے مگر ساتھ ساتھ انہیں مطمئن کرتا رہتا ہے کہ اس میں ملک و ملت کا فائدہ ہے حالانکہ کوئی غیر شرعی قدم کبھی ملت کی بھلائی کا باعث نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ شریعت اسلامیہ نے انہیں نظریات اور اعمال کو غلط قرار دیا ہے جو تھے ہی ملت کے لیے مضر۔

تاریخ اسلام میں بنو امیہ کا گورنر حجاج بن یوسف بہت مشہور ہے۔ وہ بعض امور میں بڑا قابل تھا مگر وہ ظالم بے انتہا تھا اور اپنے زیر حکومت علاقوں کا بندوبست کرنے کے سلسلے میں اس نے بعض ایسے قدم اٹھائے جو اسلامی احکام کے خلاف تھے۔ اسلامی سلطنت میں غیر مسلموں پر ایک ٹیکس لگایا جاتا ہے جسے جزیہ کہتے ہیں۔ جب کوئی غیر مسلم شخص

مسلمان ہو جائے تو یہ ٹیکس فوراً معاف ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی غیر مسلموں کے پاس جو زمینیں تھیں، ان پر خراج لیا جاتا تھا اور مسلمانوں کے پاس جو زمینیں تھیں ان پر عشر لیا جاتا تھا۔ اور اصول یہ ہے کہ اگر خراجی زمین مسلمان کے پاس آجائے تو وہ خراجی سے عشری ہو جائے گی۔ حجاج بن یوسف نے ان اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے نو مسلموں سے بھی جزیہ لینا شروع کر دیا اور جن خراجی زمینوں کو مسلمانوں کے قبضے میں آجانے کے باعث عشری ہو جانا چاہیے تھا، ان سے بدستور خراج لیتا رہا۔ یہ بڑی ناروا حرکات تھیں۔ مگر حجاج نے اپنے زعم میں ملک کی مالی حالت کو بہتر بنانے کے لیے یہ عمل جاری رکھا۔

حجاج کی وفات کے کچھ عرصہ بعد جب بنو امیہ کی حکومت حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے قبضے میں آئی تو انہوں نے حکم دے دیا کہ نو مسلموں سے جزیہ لینا بند کر دیا جائے اور مالی امور میں بنو امیہ کے سابق حکمرانوں کے عہد میں جتنی بدعنوانیاں ہوتی تھیں سب منسوخ کر دیں۔ ایک عام شخص یہی سمجھے گا کہ اس سے حکومت کی آمدنی کم ہو گئی ہو گی اور نو مسلموں سے جزیہ ختم کر دینے کے باعث اس کثرت سے لوگ مسلمان ہوئے کہ بعض جگہ شکایت پیدا ہوئی بھی کہ آمدنی کم ہو گئی ہے، مگر انجام کار جو کچھ سامنے آیا، وہ یہ تھا کہ آمدنی کم ہونے کے بجائے بڑھ گئی۔ مورخ بتاتے ہیں کہ حجاج رعایا پر ظلم کر کے جتنی مالگزاری وصول کرتا تھا، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ظالمانہ ٹیکس معاف کر کے اور لوگوں پر نرمی اور شفقت برت کر اس سے بہت زیادہ مالگزاری وصول کی۔ وہ خود فرماتے تھے کہ:

> حجاج پر خدا کی لعنت ہو، اسے نہ دین کی لیاقت تھی نہ دنیا کی۔ اس نے اپنے ظلم کے باوجود عراق سے صرف دو کروڑ اسی لاکھ درہم وصول کیے اور جب عراق میرے قبضے میں آیا، تو میں نے اس سے ۱۰ کروڑ ۲۴ لاکھ درہم وصول کیے۔

شیطان کی سکھائی ہوئی حیلہ سازی کی ایک بدترین شکل وہ ہے جس میں انسان کسی شرعی حکم سے جان بچانے کے لیے کوئی ایسا طرزِ عمل اختیار کرتا ہے جس سے بظاہر

قانونی طور پر وہ اس حکم سے واقعی بچ جاتا ہے، مگر اس شرعی حکم پر نہ عمل کرنے کے جو برے نتائج پیدا ہونے ہوتے ہیں، وہ پیدا ہو جاتے ہیں۔

اسلامی شریعت میں اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کرنا فرض ہے اور زکوٰۃ کی ادائیگی اس وقت فرض ہوتی ہے جب زکوٰۃ والے مال کو قبضے میں آئے ایک سال گزر چکا ہو۔ بعض لوگ زکوٰۃ سے بچنے کے لیے یوں حیلہ کر لیتے تھے کہ گیارہ مہینے تک وہ مال خاوند اپنی ملکیت میں رکھتا اور بارہویں مہینے اسے بیوی کے نام ہبہ کر دیتا۔ اب جب تک اس مال کو بیوی کے قبضے میں آئے سال نہ گزر جاتا اس پر زکوٰۃ فرض نہیں ہو سکتی تھی۔ اب بیوی بھی گیارہ مہینے اسے اپنی ملکیت میں رکھ کر بارہویں مہینے پھر اسے خاوند کو دے دیتی۔ اس طرح چکر چلا کر وہ زکوٰۃ سے محفوظ ہو جاتے۔ مال رہتا بھی اسی گھر میں اور اس پر زکوٰۃ بھی عائد نہ ہوتی۔ میاں بیوی مطمئن ہوتے کہ ہم نے کوئی گناہ نہیں کیا، مگر زکوٰۃ ادا نہ کرنے کی انفرادی اور اجتماعی خرابیاں برابر قائم رہتیں۔ مال والوں کے دلوں سے مال کی حرص بھی کم نہ ہوتی اور معاشرے کے جن محتاجوں اور ضرورت مندوں نے اس زکوٰۃ سے فائدہ اٹھانا تھا، وہ بھی محروم رہتے اور خدا کے ایک حکم سے بچنے کے لیے ان چکر چلانے والوں کو اللہ کے ساتھ چالاکیاں کرنے کا جو گناہ ہوتا وہ علیحدہ۔

کینہ توز: شیطان کی ایک مزید صفت یہ ہے کہ وہ کینہ توز ہے۔

اس موجودات میں حکم تو اللہ ہی کا چلتا ہے مگر اس کی منشاء کو پورا کرنے کے لیے مختلف ہستیاں ذرائع کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ شیطان اپنی نافرمانی کے باعث اللہ کی رحمت سے دور ہوا اور اس کے اللہ کی رحمت سے دور ہونے کا ذریعہ انسان بنا، جس کو سجدہ کرنے سے انکار کرنے کے باعث وہ خدا کے غضب کا مستحق ٹھہرا۔

انسان نے بھی دنیا میں آنے سے پہلے بہشت میں بیٹھ کر ہی خدا کی نافرمانی کر کے اس کی ناراضی مول لے لی اور اس کے ساتھ خدا کے ناراض ہونے کا ذریعہ شیطان،

بنا جس نے اسے ممنوعہ پھل کھلایا۔

اب شیطان کی کینہ توزی کا یہ عالم ہے کہ اسے یہ بات کبھی نہیں بھولی کہ اسے خدا کی رحمت سے دور کروانے والی ہستی انسان تھا۔ چنانچہ وہ برابر اس سے کھلی کھلی دشمنی کیے جاتا ہے اور اپنی مانند اسے بھی خدا کی رحمت سے دور کروا دینے کی سعی میں مصروف رہتا ہے۔

دوسری طرف انسان ایسا بھلکڑ ہے کہ اس کی اکثریت کو سرے سے یاد ہی نہیں کہ شیطان نے اس سے کیا دشمنی کی تھی۔

شیطان تو اپنے زیاں کو اتنا پہچانتا ہے کہ اس زیاں کے ذریعے کے خلاف اس کا دل بغض و عداوت سے کبھی خالی نہیں ہوا مگر انسان ایسا زیاں کار ہے کہ اپنے زیاں کے ذریعے سے دوستیاں کرنے سے بھی نہیں شرماتا بلکہ بعض اوقات اس دوستی پر بہت کچھ فخر و مباہات کا اظہار بھی کرتا ہے---- اب اسے انسان کی بے غیرتی کے سوا اور کیا کہا جائے کہ دشمن ذلیل و رسوا کرنے کے درپے ہو اسی کے اشاروں پر ناچا جائے۔

وسواس، خناس: کلام پاک کی آخری سورت میں شیطان کے لیے دو نام استعمال کیے گئے ہیں۔

تفہیم القرآن جلد ششم میں ان الفاظ کی تشریح یوں بیان کی گئی ہے:

”وسواس کا مطلب ہے بار بار وسوسہ ڈالنے والا‘ اور وسوسے کے معنی ہیں پے در پے ایسے طریقے یا طریقوں سے کسی کے دل میں کوئی بری بات ڈالنا کہ جس کے دل میں وہ ڈالی جا رہی ہو اسے یہ محسوس نہ ہو سکے کہ وسوسہ انداز اس کے دل میں ایک بری بات ڈال رہا ہے۔ وسوسے کے لفظ میں خود تکرار کا مفہوم شامل ہے جیسے زلزلہ میں حرکت کی تکرار کا مفہوم شامل ہے۔ چونکہ انسان صرف ایک دفعہ بہکانے سے نہیں بہکتا بلکہ اسے بہکانے کی پے در پے کوشش کرنی ہوتی ہے۔ اس لیے ایسی کوشش کو وسوسہ اور کوشش کرنے والے کو وسواس کہا جاتا ہے۔

رہا لفظ خناس، تو یہ خنوس سے ہے جس کے معنی ظاہر ہونے کے بعد چھپنے یا آنے کے بعد پیچھے ہٹ جانے کے ہیں۔ اور خناس چونکہ مبالغے کا صیغہ ہے۔ اس لیے اس کے معنی یہ فعل بکثرت کرنے والے کے ہوئے۔ اب یہ ظاہر بات ہے کہ وسوسہ ڈالنے والے کو بار بار وسوسہ اندازی کے لیے آدمی کے پاس آنا پڑتا ہے اور ساتھ ساتھ جب اسے خناس بھی کہا گیا تو دونوں الفاظ کے ملنے سے خود بخود یہ مفہوم پیدا ہو گیا کہ وسوسہ ڈال کر وہ پیچھے ہٹ جاتا ہے اور پھر پے در پے وسوسہ اندازی کے لیے پلٹ کر آتا ہے۔ بالفاظ دیگر ایک دفعہ جب اس کی وسوسہ اندازی کی کوشش ناکام ہوتی ہے تو وہ چلا جاتا ہے۔ پھر وہی کوشش کرنے کے لیے دوبارہ، سہ بارہ اور بار بار آتا رہتا ہے۔" (تفہیم القرآن، جلد ششم)

شیطان کی ان صفات پر غور کرنے کے بعد اب اس بات پر غور کیجئے کہ جب دشمن ہوشیار بھی ہو اور موقع شناس بھی ہو اور حیلہ جو بھی ہو اور کینہ توز بھی ہو اور وسواس اور خناس بھی ہو تو پھر کیا کیا جائے اس نادان کا، جو ایسے زبردست دشمن کے ساتھ رہتے ہوئے غفلت اور لاپروائی کو شعار بنائے رکھے --- پھر کیوں نہ اس کے نفس میں خرابیاں پیدا ہوں، کیوں نہ وہ خسارے کا شکار ہو اور کیوں نہ اسے دنیا میں بھی غم و رسوائی کا سامنا کرنا پڑے اور آخرت میں بھی عذاب و رسوائی کا!

خدائے بزرگ و برتر اور خدا کے مکرم رسولؐ نے انسان کو بار بار اس دشمن ازلی کی چالوں سے ہوشیار رہنے کی تاکید فرمائی ہے۔

سورۃ الاعراف آیت ۲۷ میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو تنبیہ فرمائی ہے:

"اے بنی آدمؑ ایسا نہ ہو کہ شیطان تمہیں پھر اسی طرح فتنے میں مبتلا کر دے جس طرح اس نے تمہارے والدین کو جنت سے نکلوایا تھا....."

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شیطان انسان کے دل میں ایک خیال ڈالتا ہے اور فرشتہ بھی انسان کے دل میں

ایک خیال ڈالتا ہے۔ شیطان کا خیال برائی کا وعدہ دینا اور حق کو جھٹلانے پر آمادہ کرنا ہے اور فرشتے کا خیال بھلائی کا وعدہ دینا اور حق کی تصدیق پر آمادہ کرنا ہے۔ پس جو کوئی (اپنے دل میں) یہ چیز (یعنی فرشتے کا ڈالا ہوا خیال) پائے تو وہ جان لے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے پس اللہ کی تعریف کرے اور جو کوئی (اپنے دل میں) کوئی اور شے (یعنی شیطان کا ڈالا ہوا خیال) پائے تو وہ شیطان سے اللہ کی پناہ مانگے ......'' (ترمذی)

حقیقت یہ ہے کہ ارادتاً ضد کے باعث برائیاں کرنے والے لوگ تھوڑے ہوتے ہیں۔ برائیوں کا شکار ہونے والوں میں سے غالب اکثریت انہیں لوگوں کی ہوتی ہے جو غفلت اور لاپروائی کے باعث اس دلدل میں پھنس جاتے ہیں۔

لوگوں نے ایک دفعہ شیخ شبلیؒ سے پوچھا کہ حضورؐ کے اس قول کا کیا مطلب ہے:

اِذَا رَأَيْتُمْ اَهْلَ الْبَلَاءِ فَاسْئَلُوْا (جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو مبتلائے
رَبَّكُمُ الْعَافِيَةَ۔ بلا ہیں تو اپنے رب سے عافیت مانگو)

اس پر شیخ شبلیؒ نے فرمایا کہ ''مبتلائے بلا وہ لوگ ہیں جو خدا کی طرف سے غافل ہیں۔''

آپ کی مراد یہ تھی کہ چونکہ وہ غافل ہیں، اس لیے آسانی سے ایسی حرکات کا ارتکاب کرلیں گے جو انہیں دنیا اور آخرت دونوں جگہ کی مصائب کا شکار بنا دیں گی۔ غفلت کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی کے اہم پہلوؤں پر کبھی غور نہ کرے۔ اسے کبھی یہ خیال نہ آیا ہو کہ میں کہاں سے آیا ہوں، کہاں جاؤں گا، کس نے مجھے یہاں بھیجا ہے، کیوں بھیجا ہے، میرے یہاں آنے کا مقصد کیا تھا، اگر میں نے وہ مقصد پورا نہ کیا تو کیا ہوگا۔

آخر انسان آئے دن لوگوں کو اس دنیا سے رخصت ہوتے دیکھتا ہے۔ پھر بھی اگر اسے یہ خیال نہیں آتا کہ ایک دن میں نے بھی اسی طرح رخصت ہونا ہے۔ یہ جو میرے سامنے رخصت ہوا ہے یہ کہاں گیا ہے۔ میں نے کہا جانا ہے۔ وہاں کیا ہوگا۔ مجھے اس

کے لیے کیا تیاری کرنی ہے۔ یہ سوال اگر اس کے دل میں نہیں اٹھتے تو اس کا دل غافل ہے۔ اگر لوگوں کو مرتے دیکھ کر بھی اس کے ذہن میں اپنی موت کا اور مابعد الموت کا خیال نہیں آتا تو یہی وہ غفلت ہے جس کی اسلام نے مذمت کی ہے۔ ان غافلوں میں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو فوری نکلنے والے نتائج کے سلسلے میں از حد ہوشیار ہوتے ہیں۔ اپنی دنیوی زندگی کے مادی فوائد حاصل کرنے میں ان کا دماغ خوب چلتا ہے اور وہ بڑی سوجھ بوجھ اور ہوشیاری کا ثبوت دیتے ہیں مگر چونکہ اپنے لازماً آنے والے انجام کی وہ بالکل پروا نہیں کرتے' اس کی پروا کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے' اس لیے وہ اپنی ساری مادی سمجھ بوجھ اور ہوشیاری کے باوجود پرلے درجے کے غافل ہوتے ہیں۔ اور یہ غفلت انہیں انواع واقسام کی برائیوں میں مبتلا ہو جانے کے خطرے میں ڈالے رکھتی ہے۔

حضرت عثمانؓ کا فرمان ہے۔ ''غریب آدمی ذلیل نہیں ہوتا بلکہ ذلیل وہ ہے جو اپنے مذہب کی طرف سے غافل ہے۔''

ایسے دنیا پرست غافل انسان عموماً کسی خیر اندیش کی خیر خواہانہ نصیحتوں سے بھی کم ہی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ حضرت علیؓ کا فرمان ہے:

''تیرے اور نصیحت کے درمیان بے توجہی کا پردہ حائل ہے۔''

یہ بے توجہی انسان کے لیے انتہائی نقصان دہ شے ہے کیونکہ ہر لمحہ' جو گزر رہا ہے' انسان کی زندگی کے تاروں کو کاٹے چلا جا رہا ہے اور وہ لحظہ بہ لحظہ اپنے انجام سے قریب سے قریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں:

''دنیا والے ان مسافروں کی طرح ہیں جنہیں قافلہ لیے جا رہا ہو اور وہ غافل سو رہے ہوں۔''

* * *

۲۔ حُبِّ دُنیا اور حُبِّ خواہشات

نفس میں خرابیاں پیدا کرنے کی دوسری وجہ حُبّ دنیا اور حُبّ خواہشات بتائی جاتی ہے۔ صوفیائے اکرام کے اقوال میں خصوصی طور پر دنیا اور خواہشات کی مذمت میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ حضرت معروف کرخیؒ فرماتے ہیں:

"دنیا کا لفظ دنائت سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں خواری، ذلت، کمینگی۔ اسی سے اندازہ لگالو کہ دنیا کیا چیز ہے۔"

نیز آپ کا مقولہ ہے کہ "حُبّ دنیا کو ترک کرو کیونکہ اگر دنیا کی ذرا سی چیز بھی تمہارے دل میں ہوگی تو سجدہ کرنے میں بھی تم اسے فراموش نہیں کرسکو گے۔"

حضرت شقیق بلخیؒ کا بیان ہے: "عقلمند وہ ہے جو دنیا سے دست بردار ہو جائے۔ قبل اس کے کہ دنیا اس سے دست بردار ہو جائے۔"

حضرت بایزید بسطامیؒ فرماتے ہیں: "جو شخص کثرتِ خواہشات سے اپنے دل کو مردہ بنالے اسے لعنت کے کفن میں لپیٹو اور ندامت کی سرزمین میں دفن کردو اور جو شخص نفس کو خواہشات سے باز رکھے اسے رحمت کے کفن میں لپیٹو اور سلامتی کی سرزمین میں دفن کردو۔"

یہ سب کچھ اپنی جگہ صحیح سہی، تاہم انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اگر دنیا اتنی ہی قابلِ نفرین جگہ تھی تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہاں بھیجا ہی کیوں؟ اور اگر خواہشات کو پورا کرنے

سے لازماً نفس میں خرابیاں ہی پیدا ہوتی تھیں تو پھر انہیں بالکلیہ حرام کیوں نہ کر دیا گیا۔

بہ حیثیت مسلمان ہمارا ایمان ہے کہ زندگی گزارنے کا بہترین انداز وہی تھا جو خدا کے برگزیدہ نبیؐ نے اختیار کیے رکھا اور آپؐ کی سیرت مبارکہ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ آپؐ نے ایک نارمل انسان کی طبعی خواہشات کا گلا گھونٹ کر زندگی نہیں گزاری تھی۔ یہی نہیں بلکہ حضورؐ کے صحابہؓ میں سے اگر کسی نے ضرورت سے زیادہ زہد اختیار کرنے کا ارادہ کیا تو آپؐ نے انہیں اس بات پر ٹوکا بھی۔

حضرت عبداللہؓ بن عمروؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو میرے بارے میں خبر دی گئی کہ میں کہتا ہوں کہ خدا کی قسم، جب تک میں زندہ رہوں گا، دن بھر روزہ رکھا کروں گا اور رات بھر کھڑا عبادت کیا کروں گا۔ (حضورؐ نے اس کے بارے میں مجھ سے دریافت کیا) تو میں نے عرض کیا کہ میرے ماں باپ آپؐ پر قربان، ہاں میں نے ایسے کہا ہے (اس پر) آپؐ نے فرمایا کہ تم اس کی طاقت نہیں رکھتے (کہ ہمیشہ دن بھر روزہ رکھا کرو اور رات بھر کھڑے عبادت کیا کرو) پس تم روزہ رکھا کرو اور افطاری بھی کیا کرو اور (رات کو عبادت کے لیے) کھڑے ہوا کرو اور سو بھی جایا کرو اور (آپؐ نے مجھے تلقین فرمائی کہ) ایک مہینے میں تین (نفلی) روزے رکھ لیا کرو...... (بخاری)

صحاحِ ستہ میں متعدد مقامات پر ایسی احادیث آئی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ حضورؐ نے عبادتِ شاقہ کو اپنے اوپر لازم کرنے والوں کو ٹوکا اور انہیں سمجھایا کہ تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے، تمہارے بدن کا بھی تم پر حق ہے، تمہارے گھر والوں کا بھی تم پر حق ہے، تمہارے مہمان کا بھی تم پر حق ہے۔ حضورؐ کی مراد یہ تھی کہ اپنے بدن کو آرام بھی دو اور اپنے متعلقین کو بھی وقت دو۔

ایسے ہی جب کسی نے چاہا کہ عبادت و ریاضت میں مصروف رہنے کے لیے تجرد کی

زندگی اختیار کر لے تو آپؐ نے ایسا کرنا ناپسند فرمایا اور اسے اپنی سنت کے خلاف قرار دیا۔

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم میرے ہاں تشریف لائے اور میرے پاس ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ حضورؐ نے دریافت کیا کہ یہ کون ہے؟ میں نے عرض کیا کہ یہ ایسی عورت ہے جو سوتی نہیں اور نماز پڑھتی رہتی ہے۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ اتنا ہی عمل اختیار کرو جتنے کی طاقت ہو۔ خدا کی قسم، اللہ (ثواب دینے سے) نہیں تھکے گا، مگر تم (طاقت سے زیادہ عبادت کرو گے تو) تھک جاؤ گے۔ (مسلم)

کتب احادیث اور حضورؐ کی سیرت کی کتابیں پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا اور خواہشات کی وہ محبت جو نفس انسانی میں خرابی پیدا کرتی ہے اور شے ہے اور زندگی سے قدرتی لگاؤ اور عام طبعی خواہشات کو جائز حدود کے اندر پورا کرنا ایک بالکل دوسری چیز ہے اور یہ ہرگز ضروری نہیں کہ جو انسان زندگی کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہو اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں سے فائدہ اٹھاتا ہو وہ لازماً دنیا پرست اور خواہش پرست ہی بن جائے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس دنیا میں بھیجا تا کہ وہ زمین میں خدا کا خلیفہ بن کر رہے، اس کی بندگی کرے اور اپنی آخرت کی زندگی کی بہتری کا سامان کرے۔ لہٰذا دنیا اس کے لیے میدانِ عمل ہے اور اگر وہ اپنے ذمے لگے ہوئے عمل سے واقعی دلچسپی رکھتا ہے تو اسے میدانِ عمل سے کچھ نہ کچھ لگاؤ ضرور پیدا ہو جائے گا اور دنیا کے ساتھ اس طبعی لگاؤ کو دنیا پرستی نہیں کہا جا سکتا۔

ایسے ہی اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر کچھ کمزوریاں بھی رکھی ہوئی ہیں:

اسے بھوک پیاس لگتی ہے۔ لہٰذا اسے کھانے پینے کی ضرورت ہے۔

وہ تھک جاتا ہے، لہٰذا اسے آرام کرنے اور سونے کی ضرورت ہے۔

وہ معاشرتی حیوان ہے، لہٰذا اسے دوسرے انسانوں کی رفاقت اور محبت درکار ہے۔

وہ طبعاً حسین اور خوبصورت چیزوں کو پسند کرتا ہے، لہٰذا وہ مجبور ہے کہ اشیاء کو بہتر سے بہتر شکل میں لانے کی کوشش کرتا رہے۔

اس کی زندگی میں نشیب و فراز، سردی گرمی، دکھ سکھ آتے چلے جاتے ہیں۔ لہٰذا اس کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ حالات کی دھوپ چھاؤں کا مقابلہ کرنے کے لیے پہلے سے کچھ پیش بندی کرتا رہے۔

اب اگر وہ ان طبعی ضروریات اور خواہشات کو جائز حدود کے اندر پورا کرتا ہے تو اسے دنیا پرستی اور خواہشات پرستی نہیں کہا جا سکتا۔

تاہم ہم دیکھتے ہیں کہ صوفیائے کرام ہی نے نہیں بلکہ دوسرے سلف صالحینؒ صحابہ کرامؓ، یہاں تک کہ خود حضورؐ نے بھی دنیا کی محبت اور حُبِّ خواہشات کی مذمت میں بہت کچھ ارشاد فرمایا ہے۔

امام غزالیؒ کہتے ہیں: ”طالبِ دنیا سمندر کا پانی پینے والے کی مانند ہے کہ جس قدر زیادہ پیتا ہے، زیادہ ہی پیاس لگتی ہے۔“

حضرت علیؓ کا ارشاد ہے: ”خواہشات پرستی ہلاک کر دینے والا ساتھی ہے۔ اور بری عادت ایک زورآور دشمن ہے۔“

حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں۔ ”غمِ دنیا دل کا اندھیرا ہے۔“

”غمِ آخرت دل کا نور ہے۔“

حضورؐ کا فرمان ہے:

”تباہ ہوا دینار کا بندہ اور درہم کا بندہ اور شال کا بندہ! وہ منہ کے بل گرے، پھر سر کے بل الٹ جائے۔ اگر اس کو کوئی کانٹا چبھے تو کوئی اس کا کانٹا نہ نکالے۔“ (ابن ماجہ)

اب ان ارشادات کو بھی سامنے رکھیے جن میں لوگوں کو حدِ مناسب سے بڑھ کر

زاہد بننے سے روکا گیا ہے اور ان احکام و نصائح کو بھی دیکھئے جن میں دنیا کی دولت اور دنیوی خواہشات کی محبت پر نکیر کی گئی ہے اور ان کے ساتھ کلام پاک، دوسری احادیث نبویؐ اور سلف صالحینؒ کے اور بہت سے بیانات کا بھی مطالعہ کیجئے، تو خود بخود ہی یہ واضح ہو جائے گا کہ:

نفس میں خرابی پیدا کرنے والی حُبِّ دنیا در حقیقت دنیا کی وہ اندھی محبت ہے جو آخرت کو بھلا دے۔

اور نفس میں خرابی پیدا کرنے والی حُبِّ خواہشات در حقیقت وہ خواہشات پرستی ہے جو حلال اور حرام کے فرق کو مٹا دے۔

ورنہ زندگی سے قدرتی لگاؤ اور عام طبعی خواہشات کو شرعی حدود کے اندر پورا کر لینا ہرگز وہ شے نہیں جو نفس میں خرابی پیدا کرے۔

حلال و حرام کی تمیز رکھتے ہوئے خدا کی عطا کردہ نعمتوں سے فائدہ اٹھانے سے، اپنی جان اور جسم کو مناسب آرام دینے سے اور دنیا کو مَزْرَعَةُ الآخِرَت سمجھتے ہوئے اسے قدر کی نگاہ سے دیکھنے سے کوئی شخص دنیا کا بندہ یا خواہشات کا غلام نہیں بنتا۔ ہاں جب دنیوی زندگی میں دنیوی مال و متاع، عہدہ و جاہ اور ساز و سامان حاصل کرنے کی حرص انسان پر اتنا غلبہ پا لے کہ اسے یاد ہی نہ رہے کہ مجھے کہیں جا کر کچھ جواب دہی بھی کرنی ہے، تو پھر البتہ یہ حُبِّ دنیا اس کے لیے تباہی کا پیغام لے آتی ہے۔

ایسے ہی اگر اس کے دل میں خواہشات کو پورا کرنے کی تمنا اتنی شدید ہو جائے کہ اسے اپنی کسی خواہش کے جائز یا ناجائز ہونے کی پروا بھی نہ رہے تو اس وقت البتہ یہ حُبِّ خواہشات سیدھی سیدھی خواہش پرستی بن جاتی ہے۔

لہٰذا اربابِ عقل و دانش نے جہاں جہاں بھی حُبِّ دنیا اور حُبِّ خواہشات کی مذمت کی ہے وہاں یہی بے لگام حُبِّ دنیا اور یہی غیر دانشمندانہ حُبِّ خواہشات مراد ہے جو

بلاشبہ نفس کو بے شمار روحانی بیماریوں میں مبتلا کر دیتی ہے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ انسانی زندگی ایک انتہائی ناپائیدار شے ہے۔ ایک ذرا سی بندوق کی گولی، ایک چھوٹا سا تیز دھار چاقو، کسی سڑک پر واقعہ ہونے والا کوئی عام سا حادثہ، کسی بلندی سے ذرا سا پاؤں پھسل جانا، سینے کے اندر دھڑکتے رہنے والے دل کا یکا یک بند ہو جانا۔۔۔۔ ان میں سے کوئی شے اسے ختم کر سکتی ہے اور اگر وہ ان سب حادثات سے بچ بھی جائے تو موت ہی اسے اس کی توقع سے بہت پہلے آ دبوچتی ہے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے چند لکیریں کھینچیں۔ پھر فرمایا کہ یہ تو انسان ہے اور یہ اس کی موت ہے۔ انسان اسی طریقے سے رہتا ہے کہ قریب کی لکیر (یعنی موت) اسے آ لیتی ہے۔ (بخاری)

اب جو انسان زندگی کی اس بے ثباتی کو ذہن نشین کیے رہے اور عارضی شے کو عارضی ہی گردانتے ہوئے آگے آنے والی دائمی زندگی کی تیاری کرتا رہے، وہ بے شک اچھا کھائے، اچھا پہنے، اچھے گھر میں رہے۔ اس کا خدا کی نعمتوں کا شکر گزار ہوتے ہوئے ان سے محظوظ ہونا اسے دنیا پرست نہیں بنائے گا۔

البتہ جس نے اس عارضی وقفے کو دائمی سمجھ لیا، جس نے لوگوں کو اس دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے دیکھا، مگر اپنے رخصت ہونے کے لمحات کا کبھی دل میں خیال نہ لایا اور جس نے اپنی تمام قوتیں اور صلاحیتیں اسی پر صرف کر دیں کہ دنیا میں زیادہ سے زیادہ مال و زر اور عیش و آرام حاصل کر لوں، وہ یقیناً خدا پرستی کو چھوڑ کر دنیا پرست بن گیا اور یہ دنیا پرستی ضرور اس کے نفس کو مہلک قسم کی روحانی بیماریوں کا شکار بنا دے گی۔ انہیں امراض سے شفا پانے کی جدوجہد کرنے کا نام تزکیہ نفس ہے۔

یہی حال خواہشات کا ہے۔ اپنی عام طبعی جائز خواہشات کو پورا کر لینے سے نہ

صرف یہ کہ نفس میں خرابیاں پیدا نہیں ہوتیں بلکہ نفس بہت سی خرابیوں کے خطرے میں مبتلا ہونے سے بچ جاتا ہے۔ کیونکہ انسان کی طبعی خواہشات بڑی زور آور چیز ہیں۔ اگر انہیں حد سے زیادہ دبایا جائے گا تو خدشہ ہے کہ وہ بغاوت اختیار کر کے اور زیادہ شدت سے حملہ آور ہوں گی۔ اس لیے ان کو جائز حد تک پورا کر کے ان کے زور کو توڑ دینا ایمان اور اخلاق کے بچاؤ کے لیے زیادہ مفید ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ انہیں بالکل ختم کرنے کی کوشش کی جائے اور اس خطرے میں مبتلا ہوا جائے کہ وہ بغاوت اختیار کر کے اور زیادہ شدت سے حملہ آور ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام میں رہبانیت کی زندگی کو ایک غلط طرزِ زندگی قرار دیا گیا ہے اور یہی سبب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے حرام اور حلال کی حدود خود ہی قائم کر دی ہیں اور انسان کو اجازت نہیں دی کہ وہ از خود کسی حلال چیز کو حرام یا کسی حرام چیز کو حلال کر لے۔

ہاں جب انسان اپنی خواہشات کو پورا کرنے میں شرعی اعتدال کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اپنا وقت، اپنی قوتیں، اپنی صلاحیتیں، اپنا پیسہ سب کچھ خواہشات ہی کی راہ میں لگانا شروع کر دیتا ہے اور اس دھن میں یہ بھی نہیں دیکھتا کہ کون سی خواہش حلال ہے اور کون سی حرام۔ تو پھر البتہ وہ خدا کا بندہ بننے کے بجائے خواہشات کا بندہ بن کر رہ جاتا ہے اور یہ خواہشات کی بندگی اسے خدا کے حفظ و امان سے نکال کر شیطان کے حملوں کی زد میں لا کھڑا کرتی ہے۔ اب وہ بد کردار بھی ہو سکتا ہے، شراب نوش بھی، جوئے باز بھی، رشوت خور بھی، خائن بھی، غاصب بھی، چور بھی، ڈاکو بھی، قاتل بھی، حرام خور بھی اور ملک و ملت کا غدار بھی۔!

دنیا اور خواہشات کی یہی حد اعتدال سے بڑھی ہوئی محبت نفسِ انسانی میں خرابیاں پیدا کرنے کا ایک خاص ذریعہ ہے۔ لہٰذا جسے اپنے نفس کے تزکیے کا خیال ہو، اس کے لیے لازم ہے کہ اس محبت کو اعتدال پر اور جائز حدود کے اندر رکھے۔

مرزا غالب کا ایک شعر ہے۔

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگ گراں اور

شاعر کہتا ہے کہ اگرچہ ہم بت شکنی میں بہت ماہر ہو چکے ہیں مگر جب تک ہم خود موجود ہیں ہمارے سچا خدا پرست بننے کی راہ میں ایک بھاری پتھر پڑا ہے۔ اس شعر میں لفظ "ہم" معنی خیز ہے۔ جس سے مراد اپنی نفسانی خواہشات ہیں۔ شاعر کی مراد یہ ہے کہ اگر ہماری خواہشات نے ہم پر اتنا قابو حاصل کیا ہوا ہے کہ ہم خدا کی رضا کے مقابل میں ان خواہشات کو پورا کرنا زیادہ ضرور سمجھتے ہیں تو پھر بے شک ہم پتھر، لکڑی، مٹی کے بنے ہوئے بت توڑ ڈالنے میں کتنے ہی ماہر کیوں نہ ہو جائیں، یہ خواہشات کا بت ہی ہمیں پکا موحد نہیں بننے دے گا۔

زندگی میں ان گنت مواقع ایسے پیدا ہوتے رہتے ہیں جب ہماری خواہش کچھ اور چاہتی ہے اور خدا کی رضا کسی اور شے میں ہوتی ہے۔ چند معمولی مثالوں ہی پر غور کر لیں۔ موسم گرما کی چھوٹی چھوٹی راتوں میں جو شخص رات بھر گرمی اور مچھروں کے باعث بے چین رہا ہو، صبح کے قریب اس کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ اب نیند پوری کر لے۔ مگر خدا کی رضا اس وقت اس میں ہوتی ہے کہ وہ بستر چھوڑ کر اٹھے اور نماز فجر کو اس کے صحیح وقت پر ادا کرے۔ اب اگر وہ اپنی خواہش کو پورا کرے گا تو خدا کی رضا سے ہاتھ دھونے پڑیں گے اور اگر خدا کی رضا پوری کرے گا تو خواہش کو دبانا پڑے گا۔ اب اگر خواہش میں اتنا زور ہو کہ اسے اٹھنے نہ دے اور نماز کا وقت گزر جائے تو پھر اس کی اس ناجائز خواہش کا پورا ہو جانا وہی "ہم" ہے جس کی موجودگی سچی خدا پرستی کی راہ میں "سنگِ گراں" ہے۔

ایک گھر کی آمدنی بس اتنی ہی ہے جس سے معمولی درجے کا گزارا چل سکے مگر گھر کا کفیل جہاں کام کرتا ہے وہاں حرام ذرائع سے بہت کچھ حاصل کر لینے کے مواقع موجود

ہیں۔ اب گھر والوں کی خواہش تو یہی ہوگی کہ زیادہ سے زیادہ خوشحالی ہو مگر جن ذرائع سے خوشحالی حاصل ہوسکتی ہے وہ خدا کی رضا کے خلاف ہیں۔ اب اگر کمانے والے اور کھانے والوں کی دولت کی ریل پیل حاصل کرنے کی خواہش اتنی شدید ہوگئی کہ اس نے خدا کی رضا حاصل کرنے کے خیال کو دبا دیا' تو یہ دولت پرستی ان کے سچے خدا پرست بننے کی راہ کی رکاوٹ بن جائے گی' چاہے اپنے زعم میں وہ شرک کو مٹانے کے لیے کتنی ہی کوششیں کیوں نہ کر رہے ہوں۔

ایسے ہی انسان کو اپنا آپ بہت پیارا ہوتا ہے۔ عام طور پر سمجھا تو یہی جاتا ہے کہ سب سے زیادہ شدید جذبہ مامتا کا جذبہ ہوتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اپنی آن قائم رکھنے اور اپنے آپ کو بے خطا اور ہر دوسرے انسان پر برتر ثابت کرنے کا جذبہ بعض اوقات اتنا شدید ثابت ہوتا ہے کہ مامتا کا جذبہ بھی اس کے سامنے شکست کھا جانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اب فرض کیجئے کہ کسی نے ہمارے اس جان سے زیادہ پیارے ''اپنے آپ'' پر کوئی وہمی یا حقیقی حملہ کیا۔ مثلاً زبانِ طعن دراز کی یا ہماری کسی عادت پر نکتہ چینی کی' یا ہماری کسی صلاحیت کو گھٹیا ثابت کرنے کی سعی کی یا کسی اور طریقے سے ہماری چھوٹی موٹی غیرت کو ٹھیس لگائی۔ اب دل کی خواہش تو یہی ہوگی کہ اس شخص کو کچا ہی کھا جائیں اور جتنا گھٹیا اس نے ہمیں ثابت کرنا چاہا ہے اس سے دس گنا زیادہ گھٹیا ہم اسے ثابت کر کے دم لیں اور اگر اس نے ہم پر ایک اعتراض کیا ہے تو ہم جواب میں اس پر بیس اعتراض کریں۔ مگر خدا کی رضا تو صرف واجبی بدلہ لے لینے میں ہے۔ اس پر بھی اگر کوئی معاف ہی کر دے تو یہ اس کے لیے اور بھی زیادہ اچھا ہے کیونکہ ایسا کرنے سے اس کے اپنے گناہ معاف ہو جائیں گے۔ اب اگر ہمارے دل کا غیظ و غضب کسی صورت نہ مانے اور ہم خدا کی رضا یا ناراضی کی پروا کیے بغیر شدید سے شدید تر انتقام لینے پر تل جائیں تو ہمارا یہ غیظ و غضب خود ایک بت بن جائے گا جو ہمارے

خدا تک پہنچنے کی راہ میں آ کر کھڑا ہو جائے گا۔ اب ہمارے اس دعوے میں کہ ہم بت نہیں پوجتے، زیادہ وزن نہیں رہے گا کیونکہ بے جان بتوں کو راہ سے دور کر کے ہم نے اپنی "جاندار" خواہشوں کے بت کو جو راہ میں لا بٹھایا ہے۔

دنیا اور خواہشات کی اس غیر معتدل محبت کی مذمت صرف صوفیائے کرامؒ ہی نے نہیں کی بلکہ خود رب العٰلمین، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرامؓ اور دوسرے سلف صالحینؒ سب نے کی ہے، اور نفس کا تزکیہ کرنے کی خواہش رکھنے والے کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ اپنی بے لگام خواہشات کو قابو میں لائے نہ کہ خود ان کے قابو میں چلا جائے۔

کلام پاک کے آخری پارے میں سورہ تکاثر میں اللہ تعالیٰ نے زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی حرص کے مضر نتائج بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ o حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ o	تم لوگوں کو زیادہ سے زیادہ اور ایک دوسرے سے بڑھ کر دنیا حاصل کرنے کی دھن نے غفلت میں ڈال رکھا ہے۔ یہاں تک کہ (اسی فکر میں) تم لبِ گور پہنچ جاتے ہو۔

ان آیات کی تشریح یوں کی گئی ہے کہ:

"اَلْهٰكُمْ لَهو سے ہے جس کے اصلی معنی غفلت کے ہیں۔ لیکن عربی زبان میں یہ لفظ ہر اس شغل کے لیے بولا جاتا ہے جس سے آدمی کی دلچسپی اتنی بڑھ جائے کہ اس میں منہمک ہو کر دوسری اہم تر چیزوں سے غافل ہو جائے .... تکاثُر کثرت سے ہے اور اس کے تین معنی ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی زیادہ سے زیادہ کثرت سے حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ دوسرے یہ کہ لوگ کثرت کے حصول میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کریں۔ تیسرے یہ کہ لوگ ایک دوسرے کے مقابلے میں اس بات پر فخر جتائیں کہ انہیں

دوسروں سے زیادہ کثرت حاصل ہے۔

پس اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ کے معنی ہوئے کہ تکاثر نے تمہیں اپنے اندر ایسا مشغول کر لیا ہے کہ اس کی دھن نے تمہیں اس سے اہم تر چیزوں سے غافل کر دیا ہے۔۔۔۔

چونکہ اس امر کی صراحت نہیں کی گئی کہ تکاثر نے لوگوں کو اپنے اندر منہمک کر کے کس چیز سے غافل کر دیا ہے۔ اس لیے اس کے مفہوم میں بڑی وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ لوگوں کو اس تکاثر (یعنی زیادہ سے زیادہ کثرت سے حاصل کرنے) کی دھن نے ہر اس چیز سے غافل کر دیا ہے جو اس کی بہ نسبت اہم تر ہے۔ وہ خدا سے غافل ہو گئے ہیں، عاقبت سے غافل ہو گئے ہیں۔ اخلاقی حدود اور اخلاقی ذمہ داریوں سے غافل ہو گئے ہیں۔ حقداروں کے حقوق اور ان کی ادائیگی کے معاملے میں اپنے فرائض سے غافل ہو گئے ہیں، انہیں معیارِ زندگی بلند کرنے کی فکر ہے۔ اس بات کی کوئی فکر نہیں کہ معیارِ آدمیت کس قدر گر رہا ہے۔ انہیں زیادہ سے زیادہ دولت چاہیے، اس بات کی کوئی پروا نہیں کہ وہ کس ذریعے سے حاصل ہوتی ہے۔ انہیں عیش و عشرت اور جسمانی لذتوں کے سامان زیادہ سے زیادہ مطلوب ہیں۔ اس ہوس رانی میں غرق ہو کر وہ اس بات سے بالکل غافل ہو گئے ہیں کہ اس روش کا انجام کیا ہے۔۔۔۔" (تفہیم القرآن، جلد ششم)

سید عبدالقادر جیلانیؒ انسان کے حرص کا شکار ہو کر اللہ تعالیٰ کے قرب سے دور ہو جانے کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"تم مشغول ہو ایسی شے کے جمع کرنے میں جسے کھا نہیں سکو گے۔

آرزو رکھتے ہو ایسی چیزوں کی جنہیں پا نہیں سکو گے۔

تعمیر کرتے ہو ایسا مکان جس میں بس نہیں سکو گے۔

اور یہ سب باتیں تمہیں تمہارے رب کے مقام سے محجوب کرتی ہیں۔"

حقیقت یہ ہے کہ دنیا حاصل کرنے کی دھن کو بہت زیادہ ذہن پر سوار کر لینے سے خود دنیا کا آرام اور راحت کا زیادہ مل جانا بھی ضروری نہیں ہے۔ کیونکہ جس شخص کو واقعی آخرت کی کامیابی کی فکر ہوگی' وہ اس کے حصول کی خاطر زندگی میں ایسے اعمال اختیار کرے گا جن سے عاقبت تو سدھرے گی ہی خود اس زندگی میں بھی اسے خدا کی نصرت' لوگوں کی عزت و محبت' دل کا سکون اور بسا اوقات رزق کی خیر و برکت بھی حاصل ہو جائے گی۔ اس کے برعکس جس کا مقصد صرف دنیا کی کامیابی ہوگا' وہ اپنی حرص و آز اور غیر دیانتدارانہ رویے کے باعث خود اپنی دنیوی زندگی کو بھی بے چینی' بے سکونی اور خدشات کا پٹارا بنا لے گا۔

حضرت انسؓ بن مالک سے روایت کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جسے صرف آخرت ہی کی فکر رہے' اللہ اس کے دل کو غنی بنا دے گا اور اس کے پراگندہ کاموں کو یکجا کر دے گا اور دنیا ناک رگڑتی ہوئی اس کے پاس آئے گی۔ اور جسے صرف دنیا ہی کی فکر رہے گی تو خدا محتاجی کو اس کی دونوں آنکھوں کے سامنے لے آئے گا اور اس کے کام پراگندہ ہو جائیں گے اور (اس کے باوجود) دنیا اسے اتنی ہی ملے گی جتنی اس کے مقدر میں ہوگی۔ (ترمذی)

حضرت عبداللہؓ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ چار چیزوں سے خدا کی پناہ مانگا کرتے تھے:

اس علم سے جو نفع نہ دے'
اس دل سے جس میں خوفِ خدا نہ ہو'
اس دعا سے جو قبول نہ ہو'
اور اس نفس سے جو سیر نہ ہو۔ (نسائی)

حضرت عمروؓ بن عوف سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

خدا کی قسم میں تم پر فقر و فاقہ آ جانے نہیں ڈرتا بلکہ تمہارے معاملے میں مجھے خوف اس بات کا ہے کہ دنیا تم پر وسیع کر دی جائے' جیسے وہ ان پر وسیع کی گئی' جو تم سے پہلے ہوئے' پھر تم اس میں ایسی رغبت کرنے لگو جیسی اس میں ان (پہلے) لوگوں نے کی تھی اور (نتیجہ یہ ہو کہ) دنیا تمہیں ہلاک کر ڈالے جیسے اس نے ان (اگلوں) کو کیا تھا۔ (ترمذی)

حضورؐ کی تعلیمات کے زیر اثر صحابہ کرامؓ بھی دنیا اور خواہشات کی اعتدال سے بڑھی ہوئی محبت کو نجات کی راہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ خیال کرتے تھے۔

حضرت علیؓ کا فرمان ہے:

''حلم ایک چھپانے والا حجاب ہے اور عقل ایک تیز تلوار ہے۔ تم اپنے اخلاق کی کمزوریاں حلم سے چھپاؤ اور اپنی خواہشات کو عقل کی تلوار سے قتل کرو۔''

ظاہر ہے کہ خواہشات سے یہاں مراد وہی غیر معتدل خواہشات ہیں۔

انسان کے نفسِ امارہ کی یہ خصوصیت ہے کہ اگر اس کے آگے ایک دفعہ جھک جاؤ تو پھر وہ مزید جھکاتا ہی چلا جاتا ہے۔ ایک غلط خواہش پوری کر لو تو دوسری غلط خواہش پہلی سے زیادہ شدت کے ساتھ دل میں اٹھ کھڑی ہو گی۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ نے جب حضرت عمرؓ کو خلافت کی ذمہ داریاں سونپیں تو انہیں قیمتی نصیحتیں کیں۔ جن میں ایک یہ بھی تھی کہ نفس کو قابو میں رکھا جائے۔ کیونکہ:

''نفس کی ایک بات پوری کریں تو دوسری کے لیے پاؤں پھیلاتا ہے۔''

انسان ذرا بھی آنکھیں کھول کر دیکھے تو فوراً محسوس ہونا شروع ہو جاتا ہے کہ زندگی انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ گزرتی چلی جا رہی ہے۔ صبح' دوپہر' شام' رات پھر صبح' پھر دوپہر' پھر شام اور پھر دوسری رات۔ ہفتے مہینے اور مہینے سال بن بن کر اڑے چلے جا رہے ہیں اور یہ سارا وقت جو ہم دنیا حاصل کرنے اور دنیوی عیش و آرام کے لیے لمبے چوڑے

بندوبست کرنے میں کھپائے جا رہے ہیں۔ وہ ہماری زندگی کے ماہ و سال کو کاٹ کاٹ کر پھینکے جا رہا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ فرماتے ہیں:

''تو دنیا میں رہنے کے سامانوں میں لگا ہوا ہے اور دنیا تجھے اپنے سے نکالنے میں سرگرم ہے۔''

پھر یہ وقت جو ہم اپنی غلط خواہشات کو پورا کرنے میں صرف کرتے رہتے ہیں صرف ہماری زندگی کے ایک حصے کو ضائع ہی نہیں کرتا بلکہ ہمارے لیے دنیوی اور اخروی مصائب بھی اکٹھی کر دیتا ہے۔ سید عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں:

''تو نفس کی تمنا پوری کرنے میں مصروف ہے اور نفس تجھے برباد کرنے میں۔''

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا۔ اسے زمین پر اپنی خلافت کا رتبہ عطا کیا۔ اس کے ان گنت ابنائے جنس کو نبوت جیسی عزت سے سرفراز فرمایا۔ اسے جنت جیسے مکرم ٹکانے کی توقع دلائی۔ اب اگر وہ اپنے اس رتبہ بلند کو نظر انداز کر کے ذلیل اور گھٹیا قسم کی مصروفیات میں اپنا وقت کھپانا شروع کر دے تو اس سے بڑا بدنصیب کون ہو گا۔ امام غزالیؒ اپنی ایک تصنیف ''تبلیغِ دین'' میں فرماتے ہیں:

''اگر کسی شہزادے کو کوئی شخص غلام بنا لے۔ اس سے پاؤں دبوائے اور ادنیٰ کام کروائے تو اس کا کیا حال ہو گا۔ یہی صورت اس مسلمان کی ہے جو برے اخلاق کا شکار ہو چکا ہو اور ہوائے نفس کا غلام بن گیا ہو اور وہ ہوائے نفس اس سے سخت ذلت کے کام کرواتی ہو۔''

ایسے ہی حضرت علیؓ کا فرمان ہے:

''جسے اپنا نفس معزز معلوم ہو، خواہشاتِ نفس اس کے لیے حقیر ہوں گی۔''

کیوں بقول امام غزالیؒ

''خواہش پر غالب آنا فرشتوں کا کام ہے اور خواہشات سے مغلوب ہونا چار پاؤں کا۔''

۳۔ عبرت پذیری کا فقدان

خرابیِ نفس کا تیسرا سبب یہ ہے کہ ہم لوگوں میں عبرت پذیری کا مادہ بہت کم ہے۔ ہم صبح و شام راہ ہدایت سے ہٹنے والوں کو خِـزْیٌ فِی الدُّنْیَا کا شکار ہوتے دیکھتے ہیں مگر نصیحت حاصل نہیں کرتے۔

کتنے ہی جاہ پرست ایسے ہیں کہ ایڑی چوٹی کا زور لگا کر کسی اونچی کرسی پر پہنچے اور احساسِ برتری نے دماغ ایسا چوپٹ کیا کہ انسان چیونٹیاں نظر آنے لگے۔ مگر ابھی جی بھر کر ان چیونٹیوں کو مسلنے بھی نہ پائے تھے کہ کرسی نیچے سے سرک گئی اور وہ دھڑام سے انہیں رینگنے والی چیونٹیوں کے درمیان آ گرے ---- یہی نہیں بلکہ بعض کو تو ادبار نے ایسا گھیرا کہ چیونٹیوں کے درمیان بھی نہ رہ سکے۔ چیونٹیاں تو پھر بھی آزادی سے گلی کوچوں میں پھرتی رہیں۔ مگر یہ عزت و جاہ والے دار الامارت سے نکلے تو سیدھے زندان میں جا پھنسے۔

باوجود اس حقیقت کے کہ باقی سب جاہ پرستوں نے اس انجام کو دیکھا۔ ان میں سے شاید ہی کوئی ایسا نکلا جس نے حرص و جاہ کے اس انجامِ بد سے کوئی عبرت پکڑی ہو۔ وہ اسی طرح لٹھ لیے جاہ کے پیچھے دوڑتے رہے بلکہ ایک جاہ پرست کے زندان نشین ہونے سے جو جگہ خالی ہوئی، بے شمار جاہ پرستوں نے اسے حاصل کرنے کے لیے باہم دوڑ لگا دی ---- اب اگر حرصِ جاہ کا ایسا افسوسناک انجام دیکھ کر بھی دل عبرت نہ پکڑے تو پھر حریص اور لالچی نفس حرص کی بیماری میں کیوں نہ مبتلا رہے۔

اسلام نے گھر اور معاشرے کو بے شمار خرابیوں، الجھنوں، رسوائیوں، مصیبتوں اور اذیتوں سے بچانے کے لیے حیا کو لازم پکڑنے کا حکم دیا ہے، مگر بے شمار گھرانے ایسے ہیں جو بے حیائی اور روشن خیالی میں خلطِ مبحث کرتے ہوئے بزعم خود روشن خیالی کو، مگر درحقیقت بے حیائی کو فروغ دے رہے ہیں۔ جیسے جیسے بے حیائی عام ہو رہی ہے، فسق و فجور بڑھتا جا رہا ہے۔ پھر اس فسق و فجور کے عام ہو جانے کے باعث جب کسی "روشن خیال" گھرانے میں کوئی رسوا کن واقعہ پیش آ جاتا ہے۔ تو پھر وہ لوگ بھی جو بے حیائی کو فروغ دینے میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ زبانیں لمبی کر کر کے اس پر اعتراض کرتے ہیں۔ اس وقت وہ یہ بات بالکل بھول جاتے ہیں کہ جس "روشن خیالی" کی ترویج کے لیے وہ خود بھی کوشاں ہیں۔ اس نے معاشرے کے صرف اسی گھر کو خطرے میں نہیں ڈالا، جس کے خلاف وہ زبانِ طعن دراز کر رہے ہیں بلکہ اس نے معاشرے کے ہر گھر کو خطرے میں ڈال دیا ہے اور ان کا اپنا گھرانہ بھی اسی معاشرے کا ایک حصہ ہے----- اب دوسروں کی رسوائی سے عبرت حاصل کر کے اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کرنے کے بجائے اگر ان کی رسوائی سے حظ اٹھانے ہی کی طرف توجہ رہے گی تو پھر نفسِ امارہ کا ہے، کے لیے حیا کی پابندیوں کو قبول کرنے کی طرف آمادہ ہو گا۔

انسانی جان کو خالقِ کائنات نے اتنا قیمتی قرار دیا ہے کہ:

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِى الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ٥ (المائدہ : ٣٢)

"جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا، اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا۔"

مگر بہت سے خونخوار ایسے دیکھے جاتے ہیں جو اپنے ذرا ذرا سے دنیاوی فائدوں

کی خاطر بے تکلف انسانی جانوں کو فنا کر ڈالتے ہیں۔ بسا اوقات ایسے سفاک خود بھی عبرتناک موت کا شکار ہوتے ہیں اور جس طرح انہوں نے دوسرے انسانوں کی جان کی کوئی قیمت نہیں لگائی ہوتی، خود ان کے دشمن بھی ان کی جان کی کوئی قیمت نہیں لگاتے----- پھر معاشرے کے کئی اور سفاک اپنی آنکھوں انہیں اس انجام سے دوچار ہوتے دیکھتے ہیں، مگر عبرت نہیں پکڑتے اور اپنی ثَمَناً قَلِیْلًا حاصل کرنے کی خاطر بدستور انسانی جانوں کو موت کی نیند سلاتے جاتے ہیں---- اب اگر کسی سفاک قاتل کی اپنی سفاکانہ موت بھی دوسرے سفاکوں کے دلوں میں کوئی عبرت پیدا نہ کر سکے تو پھر نفس کی خون آشامی کیوں نہ بڑھتی جائے اور انسانی جان کیوں نہ ارزاں رہے۔

غرضکہ عبرت پذیری کا فقدان ہمارے نفس میں ان گنت خرابیاں پیدا کرنے کا ذریعہ بنتا رہتا ہے۔ حالانکہ اگر ہم نگاہِ عبرت کھولے رہیں تو برائیوں کے برے انجام صبح و شام ہمارے مشاہدے میں آتے رہتے ہیں۔

ہم آئے دن دیکھتے ہیں کہ جھوٹ بولنے والا اعتبار کھو بیٹھتا ہے،
حریص نگاہوں سے گر جاتا ہے،
حرام کمائی کھا کر پلے ہوئے بچے نالائق نکلتے ہیں،
شرابی بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے،
حاسد محسود سے بڑھ کر تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے،
کینہ پرور طرح طرح کے روگ پال لیتا ہے،
دوسرے کے حقوق چھیننے والا دوست گنوا بیٹھتا ہے اور دشمن پیدا کر لیتا ہے،

مگر چونکہ ہم عبرت نہیں پکڑتے، اس لیے جھوٹ، حرص، حرام خوری، شراب نوشی، حسد، کینہ، بے انصافی غرضکہ تمام نفسانی روگ کم ہونا تو کجا دن بدن زیادہ پھیلتے جا رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے کلام پاک میں جگہ جگہ لوگوں کو عبرت حاصل کرنے کا حکم فرمایا ہے۔

کلام پاک کے مواد کا بہت سا حصہ صرف پرانی قوموں اور ان کے پاس آنے والے انبیاءؑ کے قصوں پر مشتمل ہے۔

ظاہر ہے کہ ان قصوں کو بیان کرنے سے اللہ تعالیٰ کا منشاء لوگوں کو کہانیاں سنانا یا ماضی کے واقعات سے واقف کرانا نہیں بلکہ عبرت دلانا ہے جیسا کہ ذیل کی آیت سے ظاہر ہے۔

”کیا تمہیں ان (قوموں) کے حالات نہیں پہنچے جو تم سے پہلے گزر چکی ہیں؟ قوم نوحؑ، قوم عاد، قوم ثمود اور ان کے بعد آنے والی (بہت سی قومیں)......“ (ابراہیم: ۹)

پھر اسی سورۃ، آیت ۱۵ میں ان بدکردار قوموں کا انجام بتاتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ۔ (اور ہر جبار، دشمنِ حق نے منہ کی کھائی)

قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ ان اقوام کی طرف انبیاء بھیجے گئے۔ جنہوں نے انہیں ان کی بداعمالیوں پر ٹوکا اور انہیں سیدھی راہ کی طرف لانے کی انتہائی جدوجہد کی لیکن جب وہ کسی طرح نہ مانے اور اپنی سرکشی اور طغیانی پر اڑے رہے تو پھر ان پر خدا کا قہر ٹوٹا اور وہ ہولناک عذاب کی لپیٹ میں آ گئے۔ کسی کو تیز و تند آندھی نے ختم کر دیا، کسی کو ایک ہولناک چنگھاڑ نے فنا کے گھاٹ اتار دیا، کوئی قیامت خیز طوفان کی نذر ہو گئی، کسی پر پتھروں کی بارش ہوئی اور کوئی ڈوب کر کیفرِ کردار تک پہنچی۔

بدعمل اقوام کے برے انجام کے ساتھ ساتھ یہ بھی واضح کیا جاتا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر بار انبیاء اور ان پر ایمان لانے والوں کو عذابِ عام سے بچا لیا، اور وہ اپنی نیکوکاری کے باعث اس عبرتناک سزا سے محفوظ رہے۔

قرآن میں ان قصوں کو بیان کرنے سے مقصد یہ ہے کہ مسلمان پرانی قوموں

کے انجام سے عبرت پکڑیں اور ان اعمال سے پرہیز کریں جو ان پرانی اقوام کی بربادی کا باعث بنے تھے۔ ان معذب قوموں میں سے چند ایک کا مختصر سا ذکر درج ذیل ہے۔

قوم نوح

سورۂ نوح کے آغاز میں فرمایا گیا ہے:

''ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا (اس ہدایت کے ساتھ) کہ اپنی قوم کے لوگوں کو خبردار کر دے قبل اس کے کہ ان پر ایک دردناک عذاب آئے۔ اس نے (اپنی قوم سے) کہا۔ اے میری قوم کے لوگو، میں تمہارے لیے ایک صاف صاف خبردار کر دینے والا (پیغمبر) ہوں (تم کو آگاہ کرتا ہوں) کہ اللہ کی بندگی کرو اور اس سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ اللہ تمہارے گناہوں سے درگذر فرمائے گا اور تمہیں ایک وقت مقرر تک باقی رکھے گا۔ بیشک اللہ کا مقرر کیا ہوا وقت جب آ جاتا ہے تو پھر ٹالا نہیں جاتا۔ کاش تمہیں اس کا علم ہو۔'' (سورۂ نوح، آیات ۱تا۴)

مگر حضرت نوحؑ کی قوم ایک بدکردار قوم تھی، وہ خدائے واحد کی پرستش کے بجائے بتوں کو پوجنے کی گندگی اختیار کر چکی تھی۔ اسی سورہ میں ان کے کئی بتوں کے نام آتے ہیں مثلاً وَدّ، سَوَاع، یَغُوث، یَعُوق اور نَسر۔ حضرت نوحؑ نے انہیں خدا کی طرف لانے کی انتہائی کوشش کی مگر وہ دور ہی بھاگتے رہے۔ جب حضرت نوحؑ انہیں خدا کی طرف بلاتے تو وہ کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے اور کپڑوں سے منہ ڈھانپ لیتے اور سخت متکبرانہ انداز اختیار کرتے۔

حضرت نوحؑ نے انہیں خدا کی بندگی کے اخروی اور دنیوی دونوں اقسام کے فائدے کھول کھول کر سمجھائے اور بتایا کہ اگر تم خدا کے احکام کو مانو گے، تو خدا تمہارے گناہ

معاف کر دے گا' تمہیں مال اور بیٹوں سے امداد دے گا' تمہارے لیے باغ پیدا کرے گا اور تمہارے لیے نہریں جاری کرے گا۔ مگر وہ کسی صورت نہ مانے اور اپنی سرکشی پر اڑے رہے۔ انہیں حضرت پر اعتراض تھا کہ تم تو ہمیں جیسے انسان ہو تو پھر ہم کیوں تم پر ایمان لائیں۔ پھر انہیں ان سے یہ بھی شکوہ تھا کہ تم پر تو وہی لوگ ایمان لائے ہیں جو ہم میں گھٹیا قسم کے لوگ سمجھے جاتے ہیں۔

وہ لوگ خود تو جو کچھ تھے' وہ تھے ہی۔ ان کے سرداروں نے انہیں اور بھی زیادہ گمراہ کیا۔ اور انہیں سمجھایا کہ نوحؑ نے پیغمبری کا ڈھونگ صرف اس لیے رچایا ہے کہ کسی طرح تم پر فوقیت حاصل کرے' حالانکہ یہ بھی ویسا ہی عام انسان ہے جیسے کہ تم سب ہو! انہوں نے عام لوگوں کو پٹی پڑھائی کہ ہرگز ان کے کہنے میں آ کر اپنے معبودوں کو نہ چھوڑنا۔

قرآن پاک کے بیان کے مطابق حضرت نوحؑ نے نو سو پچاس برس ان لوگوں میں گزارے اور اپنی سی ہر تدبیر کر دیکھی مگر تھوڑے سے اہلِ ایمان کے سوا باقی سب اپنے کفر پر اڑے رہے اور بڑی ڈھٹائی سے بولے کہ اچھا پھر لے آ ہم پر وہ عذاب جس سے تو ہمیں ڈراتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ انتہائی گستاخی سے کام لیتے ہوئے خدا کے نبی کو دھمکایا۔

لَئِنۡ لَّمۡ تَنۡتَهِ يٰنُوۡحُ لَتَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡمَرۡجُوۡمِيۡنَ. (نوح: ١١٦)

''اے نوح' اگر تو باز نہ آیا تو ان لوگوں میں شامل ہو کر رہے گا جنہیں سنگسار کیا جاتا ہے۔''

آخر حضرت نوحؑ عاجز ہو کر کہہ اٹھے۔ اِنِّیۡ مَغۡلُوۡبٌ فَانۡتَصِرۡ (اے خدا) میں مغلوب ہو چکا اب تو ان سے انتقام لے) اور ان کے لیے بددعا کی۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ کو تسلی دی کہ جو کچھ اشتعال انگیزیاں یہ لوگ کر رہے ہیں' ان سے رنجیدہ نہ ہونا اور انہیں ایک کشتی بنانے کا حکم دیا۔ جب وہ کشتی بن رہی تھی تو وہ شریر لوگ ہنسی اڑاتے تھے کہ بھلا اس کشتی کے بنانے میں کیا تک ہے؟ اس پر حضرت نوحؑ

نے فرمایا کہ آج تم ہماری ہنسی اڑا رہے ہو۔ عنقریب وہ دن آ جائے گا۔ جب ہم تمہاری ہنسی اڑائیں گے اور عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ وہ کون ہے جس پر رسوا کن اور پائیدار عذاب نازل ہوگا۔

اب حجت تمام ہو چکی تھی اور وہ وقت آ چکا تھا کہ بدعملوں کو ان کی بداعمالیوں کی سزا دی جائے۔ لہٰذا:

فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ
مُّنْهَمِرٍ o وَفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا
فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰٓى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ o
(القمر : ۱۱، ۱۲)

”تب ہم نے موسلادھار بارش سے آسمان کے دروازے کھول دیئے اور زمین کو پھاڑ کر چشموں میں تبدیل کر دیا اور یہ سارا پانی اس کام کو پورا کرنے کے لیے مل گیا جو مقدر ہو چکا تھا۔

غرضکہ آسمان سے پانی برسا اور زمین سے پانی ابلا اور دنیا ایک ہولناک طوفان میں گھر گئی۔ اس وقت وہی ہستی کام آئی، جس کی کفار ہنسی اڑاتے رہے تھے۔ خدا نے حکم دیا کہ سب اہلِ ایمان اور اس کے علاوہ سب جانداروں کا جوڑا جوڑا اس کشتی میں بٹھا لیا جائے اور اس کے بعد کشتی ان ایمانداروں کو لے کر چل پڑی۔

بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖهَا وَمُرْسٰهَا o
(ھود : ۴۱)

”اللہ ہی کے نام سے ہے اس کا چلنا بھی اور اس کا ٹھہرنا بھی۔“

چاروں طرف پہاڑ سی موجیں اٹھ رہی تھیں۔ کفار ان موجوں کی نذر ہوتے جا رہے تھے۔ اس بلا کا طوفان تھا کہ ہر طرف پانی ہی پانی ٹھاٹھیں مار رہا تھا بس وہی لوگ زندہ سلامت رہے جو کشتی کے اندر بیٹھے تھے، باقی سب فنا کے گھاٹ اتر گئے۔

اس بدکردار قوم کا دنیوی اور اخروی انجام بتاتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

مِمَّا خَطِيٓـٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا — ''اپنی خطاؤں کی بناء پر ہی وہ غرق کیے
نَارًاo (نوح : ۲۵) — گئے اور آگ میں جھونک دیئے گئے۔''

اہلِ ایمان کو بچانے والی اس کشتی کے متعلق ارشاد فرمایا گیا ہے:

...... وَجَعَلْنٰهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَo — ''اور ہم نے اسے (یعنی کشتی کو) دنیا والوں
(العنکبوت:۱۵) — کے لیے ایک نشانِ عبرت بنا کر رکھ دیا۔''

مسلمانوں کو اس عبرتناک واقعے سے عبرت دلانے کے لیے حضورؐ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے:

...... فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ — ''پس دیکھ لو کہ جنہیں ڈرایا گیا تھا (اور
الْمُنْذَرِيْنَ۔ (یونس:۷۳) — پھر بھی وہ راہ راست پر نہیں آئے تھے)
ان کا کیا انجام ہوا۔''

قومِ عاد: قومِ عاد بھی پرانی بگڑی ہوئی اقوام میں سے ایک قوم تھی۔

سورۃ الفجر، آیات ۶، ۷، ۸ میں اس قوم کے متعلق فرمایا گیا ہے۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍo — ''کیا تم نے دیکھا نہیں کہ تمہارے رب
اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِo الَّتِىْ لَمْ — نے عادِ ارم کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جو اونچے
يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِى الْبِلَادِo — ستونوں والے تھے، جن کے مانند کوئی قوم
دنیا کے ملکوں میں پیدا نہیں کی گئی تھی۔''

ان آیات کی تشریح میں اس قوم کا کچھ حال بیان کیا گیا ہے جو حسبِ ذیل ہے:

''عادِ ارم سے مراد وہ قدیم قومِ عاد ہے جسے قرآن مجید اور تاریخِ عرب میں عاد اولیٰ کا نام دیا گیا ہے...... قدیم قومِ عاد کو 'عادِ ارم' اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ سامی نسل کی اسی شاخ سے تعلق رکھتے تھے جو سام بن نوحؑ کے بیٹے ارم سے چلی تھی...... عاد کے

لیے اونچے ستونوں والے‘ کے الفاظ اس لیے استعمال کیے گئے ہیں کہ وہ بڑی بڑی بلند عمارتیں بناتے تھے اور دنیا میں اونچے ستونوں پر عمارتیں قائم کرنے کا طریقہ سب سے پہلے انہیں نے شروع کیا تھا...... وہ اپنے زمانے کی ایک بے نظیر قوم تھے۔ اپنی قوت اور شان و شوکت کے اعتبار سے کوئی قوم اس وقت دنیا میں ان کی ٹکر کی نہیں تھی۔“

(تفہیم القرآن‘ جلد ۶‘ ص ۳۲۹)

کلام پاک سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ متکبر‘ سرکش اور جبار تھے اور انہوں نے بڑا فساد مچا رکھا تھا۔ ان کی طرف اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ہودؑ کو بھیجا۔ جنہوں نے انہیں وہی پاکیزہ سبق پڑھایا جو انبیاء گمراہ قوموں کو پڑھاتے چلے آ رہے تھے کہ:

یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ط اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ○ (الاعراف : ٦٥)

(اے میری قوم‘ اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔ پھر کیا تم غلط روی سے پرہیز نہ کرو گے؟)

یہاں بھی وہی ہوا کہ قوم کے سرداروں نے بڑھ کر نبی کی تکذیب کی اور گستاخانہ بولے۔

اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ سَفَاهَةٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ○ (الاعراف:٦٦)

”ہم تو تمہیں بے وقوفی میں مبتلا سمجھتے ہیں اور ہمیں گمان ہے کہ تم جھوٹے ہو۔“

حضرت ہودؑ نے انہیں سمجھایا کہ مجھ میں کوئی بے وقوفی کی بات نہیں ہے بلکہ میں تو خدا کا بھیجا ہوا رسول ہوں اور اس لیے آیا ہوں کہ تمہیں خدا کا پیغام پہنچاؤں اور میں تمہارا صحیح معنوں میں خیر خواہ اور امانت دار ہوں۔ انہوں نے ان گمراہ لوگوں کو توجہ دلائی کہ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ میں جو کچھ تمہاری اصلاح کے لیے کر رہا ہوں‘ اس پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگ رہا۔ اگر تم عقل سے کام لو تو یہی دلیل تمہیں یہ یقین دلانے کے لیے کافی ہے کہ اس کام میں

میری کوئی ذاتی غرض پوشیدہ نہیں ہے۔

حضرت ہودؑ نے بھی حضرت نوحؑ کی طرح اپنی قوم کو خدا پرستی کے دنیوی اور اخروی دونوں طرح کے فوائد سمجھائے اور نصیحت کی کہ خدا کے حضور میں استغفار کرو اور گناہوں سے توبہ کرو تو:

يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ”وہ تم پر آسمان کے دہانے کھول دے گا اور
وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ...... تمہاری موجودہ قوت پر مزید قوت کا اضافہ
(ھود : ۵۲) کرے گا۔“

مگر دوسری بگڑی ہوئی قوموں کی طرح یہ قوم بھی ایسی نہ تھی کہ نبیؑ کی باتوں پر کان دھرتی یا اس عذاب سے خوف کھاتی جس کی خبر نبی دے رہا تھا۔ حضرت نوحؑ کی قوم کی طرح ان لوگوں نے بھی بڑی ڈھٹائی سے اپنے نبی سے کہا:

فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ...... ”(اچھا تو پھر) لے آ ہم پر وہ عذاب جس
(الاعراف : ۷۰) کی تو ہمیں دھمکی دیتا ہے۔“

اور ان کی ڈھٹائی اس حد پر جا پہنچی کہ:

قَالُوْا سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَوَعَظْتَ اَمْ لَمْ تَكُنْ کہنے لگے: تو نصیحت کر یا نہ کر،
مِّنَ الْوَاعِظِيْنَo (الشعراء ۱۳۶) ہمارے لیے سب یکساں ہیں۔

اور دعویٰ کیا کہ:

...... مَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَo ”ہم عذاب میں مبتلا نہیں ہوں گے۔“
(الشعراء : ۱۳۸)

مگر جب حجت پوری ہوگئی تو پھر وہی شے جس کے بارے میں انہوں نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ ہم پر نہیں آئے گی، اپنی ساری ہولناکیوں کے ساتھ ان کے سروں پر آنازل ہوئی۔

کلام پاک میں بتایا گیا ہے کہ ان لوگوں نے بادل سا اپنی وادیوں کی طرف آتا دیکھا اور کہنے لگے کہ یہ ہم پر برسے گا، حالانکہ وہ خدا کا عذاب تھا۔ وہی شے تھی جس کی وہ جلدی مچا رہے تھے۔ یہ عذاب ایک آندھی کی شکل میں آیا جو سات رات اور آٹھ دن چلتی رہی اور اس متکبر قوم کو اس طرح برباد کر گئی گویا وہ

اَعۡجَازُ نَخۡلٍ خَاوِیَه. (الحآقة:۷) (گری ہوئی کھجوروں کے تنے تھے)

اور وہی معزز قوم جو کہتی تھی کہ:

مَنۡ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً. (وہ کون ہے جو قوت میں ہم سے زیادہ
(حم السجدہ : ۱۵) ہے)

عبرت کا نشان بن کر رہ گئی، اور اس بستی میں ایسی بربادی آئی کہ سوائے ان کے مکانات کے اور کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔

اس قوم کی عبرتناک تباہی کا حال بیان کر کے پھر اللہ تعالیٰ تنبیہ فرماتے ہیں کہ:

كَذٰلِكَ نَجۡزِی الۡقَوۡمَ ”ہم مجرموں کو یونہی سزا دیا کرتے ہیں۔“
الۡمُجۡرِمِیۡنَ ○ (الاحقاف: ۲۵)

اس قصے کو بیان کرتے ہوئے بھی اللہ تعالیٰ نے وضاحت فرما دی ہے کہ حضرت ہودؑ اور ان کے اہل ایمان ساتھی اس عذاب عام سے بچا لیے گئے۔

قوم ثمود: قوم ثمود بھی عرب کی پرانی اقوام میں سے تھی اور عاد کے بعد ہوئی۔ جب اسلام آیا تو اس وقت اس قوم کے قصے عربوں کے اشعار اور خطبوں میں بیان کیے جایا کرتے تھے۔ تاریخ دانوں نے جو کچھ بیان کیا ہے۔ اس سے پایا جاتا ہے کہ اس قوم کا مسکن عرب کے شمال مغربی حصے میں تھا۔ یہ لوگ پہاڑوں کو تراش تراش کر گھر بناتے تھے جو بڑے عالی

شان ہوتے تھے۔ آٹھویں صدی ہجری میں مشہور مسلمان سیاح ابن بطوطہ حج کو جاتے ہوئے اس علاقے میں آئے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''یہاں سرخ رنگ کے پہاڑوں میں قوم ثمود کی عمارتیں موجود ہیں جو انہوں نے چٹانوں کو تراش تراش کر ان کے اندر بنائی تھیں۔ ان کے نقش و نگار اس وقت تک ایسے تازہ ہیں جیسے آج بنائے گئے ہیں۔''

اس کی طرف اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی حضرت صالحؑ کو بھیجا۔ حضرت صالحؑ نے قوم پر تبلیغ کی تو قوم دو گروہوں میں بٹ گئی، ایک متکبر جو کفر پر اڑے رہے اور دوسرے غریب جو ایمان لائے۔ دوسری بگڑی ہوئی قوموں کی طرح اس قوم کے متکبروں نے بھی جھگڑے کیے اور غریب اہل ایمان کو بہکانے کی کوشش کی۔ حضرت صالحؑ نے بھی اپنی قوم کو توجہ دلائی کہ دیکھو میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگ رہا۔ اُس سے سمجھ جاؤ کہ میں مخلص ہوں۔ مگر دوسری گمراہ قوموں کی طرح ان پر بھی اثر نہ ہوا۔

تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ گمراہ قوموں کی بہت سی عادات مشترک ہوتی ہیں۔ جن قوموں پر عذاب آئے وہ مختلف زمانوں میں اور مختلف مقامات پر ہوئیں مگر اس کے باوجود انہوں نے اپنے انبیاء سے ایک جیسی باتیں کیں جن میں سے ایک بات یہ تھی کہ انہیں نبیوں کے بشر ہونے پر اعتراض ہوا۔ چنانچہ قوم ثمود نے بھی اپنے نبی حضرت صالحؑ سے یہی کہا کہ تم تو ہمیں جیسے انسان ہو۔ ہماری ہی طرح کھاتے پیتے ہو۔ ہم تم پر ایمان کیسے لے آئیں۔

قوم عاد نے اپنے نبی پر بیوقوفی کا الزام لگایا تھا۔ قوم ثمود نے حضرت صالحؑ سے کہا۔

اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ. (الشعراء: ۱۵۳) (تو تو محض ایک سحر زدہ آدمی ہے)

گمراہ قوموں کو باپ دادا کا طریقہ بہت عزیز ہوتا ہے۔ چاہے وہ کتنا ہی غلط کیوں نہ ہو۔ قوم ثمود نے بھی حضرت صالحؑ سے یہی کہا کہ تم ہمیں باپ دادا کے طریقے سے منحرف کرنے آئے ہو۔

گمراہ قومیں آخرت کی منکر ہوتی ہیں۔ لہٰذا ثمود نے بھی یہی اعتراض کیا کہ بھلا قبر میں مٹی اور ہڈیاں ہو جانے کے بعد دوبارہ زندگی کیسے ہوگی۔

ان لوگوں نے بھی اسی ڈھٹائی سے کام لیا جس سے دوسری گمراہ قومیں لیتی تھیں کہ اچھا اگر تو واقعی نبی ہے تو چل پھر لے آ ہم پر عذاب۔

ان شریر لوگوں نے بھی اور بہت سی شریر قوموں کی طرح معجزے کا مطالبہ کیا۔ چنانچہ اللہ نے ان کے لیے معجزانہ طور پر اونٹنی بھیجی۔ اس اونٹنی کے بارے میں ہدایت دی گئی تھی کہ ایک دن وہ اکیلی کنوؤں اور چشموں سے پانی پیا کرے اور دوسرے دن قوم کے لوگ پانی لیا کریں۔ اس کے علاوہ یہ حکم بھی تھا کہ اونٹنی کو کھلا پھرنے دیا جائے کہ جہاں سے چاہے چرے اور تنبیہ کی گئی کہ اسے بری نیت سے ہاتھ نہ لگایا جائے، ورنہ عذاب آ لے گا۔

باوجود اس کے کہ ان بدعمل لوگوں نے خود معجزہ مانگا تھا، اب وہ معجزے کے طور پر آئی ہوئی اونٹنی کے دشمن ہو گئے۔ اونٹنی کو جو حق دیا گیا تھا کہ جہاں چاہے چرتی رہے اور ایک دن پورا پانی اسی کا ہوگا۔ اس بات نے لوگوں کو ناراض کر دیا تھا۔ کچھ دیر تو انہوں نے اس اونٹنی کو برداشت کیا۔ مگر آخر ان میں سے ایک بدبخت نے اٹھ کر اونٹنی کی کوچیں کاٹ ڈالیں۔

یہ اتنی بڑی نافرمانی تھی کہ حضرت صالحؑ نے انہیں آگاہ کر دیا کہ اب تین دن رس بس لو----- اس مدت کے ختم ہونے پر رات کے پچھلے پہر صبح کے قریب ایک زبردست دھماکا ہوا اور اس کے ساتھ ایسا سخت زلزلہ آیا جس نے آن کی آن میں پوری قوم کو تباہ کر کے

رکھ دیا۔ صبح ہوئی تو ہر طرف بربادی ہی بربادی تھی۔ ان کے پہاڑوں سے کھودے ہوئے غار اور ان کے سنگین قصر انہیں انجامِ بد سے ذرا بھی نہ بچا سکے!---- کلام پاک میں ان کی تباہی کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا ہے:

''......وہ اپنی بستیوں میں اس طرح بے حس و حرکت پڑے کے پڑے رہ گئے گویا وہ وہاں کبھی بسے ہی نہ تھے......'' (ہود: ۶۷، ۶۸)

''......سو وہ ایسے ہو گئے جیسے کانٹوں کی باڑ لگانے والے کا چورا۔'' (القمر: ۳۱)

''......پس ہم نے انہیں خس و خاشاک کر دیا......'' (المومنون: ۴۱)

''......آخر کار ان کے گناہ کی پاداش میں ان کے رب نے ان پر ایسی آفت توڑی کہ انہیں پیوندِ خاک کر دیا۔'' (الشمس: ۱۴)

''اب دیکھ لو کہ ان کی چال کا کیا انجام ہوا۔ ہم نے ان کو اور ان کی پوری قوم کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ وہ ان کے گھر خالی پڑے ہیں اس ظلم کی پاداش میں، جو وہ کرتے تھے۔ اس میں ایک نشانِ عبرت ہے ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں۔'' (سورۃ النمل: ۵۱، ۵۲)

جہاں تک اہلِ ایمان کا تعلق ہے۔ سو ان کے بارے میں واضح کر دیا گیا:

''اور بچا لیا ہم نے ان لوگوں کو جو ایمان لائے تھے اور نافرمانی سے پرہیز کرتے تھے۔'' (سورۃ النمل: ۵۳)

غرضکہ قوم ثمود بھی اسی طرح کیفرِ کردار کو پہنچی، جیسے دوسری شریر قومیں پہنچی تھیں۔ نزولِ قرآن کے وقت حجاز کے تجارتی قافلے اس علاقے سے گزرا کرتے تھے جہاں اس معذب قوم کی عمارتوں کے کھنڈرات پھیلے ہوئے تھے۔ غزوۂ تبوک کے موقع پر جب حضورؐ اس طرف سے گزرے تو:

''آپؐ نے مسلمانوں کو یہ آثارِ عبرت دکھائے اور وہ سبق دیا جو آثارِ قدیمہ سے

ہر صاحب بصیرت کو حاصل کرنا چاہیے۔ ایک جگہ آپؐ نے ایک کنوئیں کی نشاندہی کر کے بتایا کہ یہی وہ کنواں ہے جس سے حضرت صالحؑ کی اونٹنی پانی پیتی تھی اور مسلمانوں کو ہدایت کی کہ صرف اس کنویں سے پانی لینا، باقی کنوؤں کا پانی نہ پینا۔ ایک پہاڑی درے کو دکھا کر آپؐ نے بتایا کہ اس درے سے وہ اونٹنی پانی پینے کے لیے آتی تھی۔ چنانچہ وہ مقام آج بھی "فَجُّ النَّاقة" کے نام سے مشہور ہے۔ ان کے کھنڈروں میں جو مسلمان سیر کرتے پھر رہے تھے، ان کو آپؐ نے جمع کیا اور ان کے سامنے ایک خطبہ دیا، جس میں ثمود کے انجام پر عبرت دلائی اور فرمایا کہ یہ اس قوم کا علاقہ ہے جس پر خدا کا عذاب نازل ہوا تھا۔ لہٰذا یہاں سے جلدی گزر جاؤ۔ یہ سیر گاہ نہیں بلکہ رونے کا مقام ہے۔"

(تفہیم القرآن، جلد دوم، صفحہ ۴۸)

ان تین قوموں کے علاوہ کلام پاک میں اور کئی اقوام کا ذکر آیا ہے جو بگاڑ کا شکار ہو گئیں۔ خدا تعالیٰ نے ان کی اصلاح کے لیے ان کی طرف پیغمبر بھیجے مگر جب وہ اپنی بدکرداریوں پر مصر رہیں تو آخر کار انہیں عبرتناک عذاب نے آ لیا۔ قومِ لوط، آلِ فرعون، اصحابِ مدین وغیرہ سب اسی قسم کی قومیں تھیں جو اپنے گناہوں کے باعث بنی نوعِ انسان کے لیے عبرت بن کر رہ گئیں۔

قومِ لوط: حضرت لوطؑ حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے تھے۔ قوم لوط اس علاقے میں رہتی تھی جو عراق و فلسطین کے درمیان واقع ہے۔ بائبل میں اس قوم کے صدر مقام کا نام "سدوم" بتایا گیا ہے۔ یہ لوگ اخلاقی لحاظ سے سخت بدکردار تھے، اور اگرچہ حضرت لوطؑ نے ان کے ساتھ بہت جان ماری لیکن وہ اپنی فحاشی پر اڑے رہے یہاں تک کہ عذاب کا لقمہ بن گئے۔

جب اللہ تعالیٰ نے اس بدچلن قوم پر عذاب نازل کرنے کا فیصلہ کر لیا تو فرشتے عذاب کی خبر دینے کے لیے حضرت لوطؑ کے پاس آئے۔ فرشتے لڑکوں کی شکل میں آئے

تھے۔ اس لیے حضرت لوطؑ کو پتہ نہ چل سکا کہ وہ فرشتے ہیں۔ وہ انہیں دیکھ کر سخت گھبرائے کہ کہیں میری بدکردار قوم مہمانوں کے ساتھ کوئی بدتمیزی نہ کر دے۔ اس پر فرشتوں نے انہیں بتایا کہ ہم تو خدا کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں جو ان لوگوں پر عذاب نازل کرنے کے لیے آئے ہیں اور فرشتوں نے حضرت لوطؑ کو ہدایت کی کہ آپ اور آپ کے اہل خانہ راتوں رات اس بستی سے نکل جایئے کیونکہ صبح صبح ہی ان لوگوں کو عذاب آ لے گا اور صبح کچھ ایسی دور بھی نہیں ہے۔ فرشتوں نے انہیں یہ بھی سمجھایا کہ جاتے ہوئے آپ لوگوں میں سے کوئی مڑ کر پیچھے نہ دیکھے۔ حضرت لوطؑ کی بیوی پیغمبر کی بیوی ہونے کے باوجود بری عورت تھی۔ لہٰذا فرشتوں نے بتا دیا کہ وہ آپ کے ساتھ نہیں جائے گی بلکہ یہیں عذاب کا شکار ہونے والوں میں رہے گی۔

غرضکہ حضرت لوطؑ اور اہلِ ایمان تو اس بستی سے بحفاظت نکل گئے۔ باقی بدکردار لوگوں کا حال یہ ہوا کہ صبح صبح ایک ہولناک چنگھاڑ سنائی دی اور آناً فاناً وہ بستی تہہ و بالا ہو کر رہ گئی۔ انہیں ایک زوردار آندھی نے آ لیا، جو کھنگر کے پتھر برسا رہی تھی اور دیکھتے دیکھتے وہ بدچلن لوگ تباہ و برباد ہو کر رہ گئے۔

کلام پاک میں ان کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ○ (الاعراف : ۸۴)	”پھر دیکھو کہ کیا انجام ہوا ان مجرموں کا۔“
وَلَقَدْ تَّرَكْنَا مِنْهَآ اٰيَةً بَيِّنَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ○ (العنکبوت : ۳۵)	”اور ہم نے اس بستی کے کچھ ظاہری نشان رہنے دیے ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔“

آلِ فرعون: فرعون مصر کا قبطی حکمران تھا اور مارے فخر اور حماقت کے خدائی کا دعویٰ کرتا

تھا۔ مصر میں بنو اسرائیل بھی رہتے تھے مگر وہ قبطیوں کے غلاموں کی حیثیت سے زندگی گزارتے تھے اور ان پر بہت ظلم وستم ہوتا تھا۔ فرعون ان کے بیٹوں کو قتل کروا دیتا تھا اور ان پر اور بھی بہت کچھ ظلم ڈھاتا تھا۔

فرعون کو راہ راست دکھانے کے لیے حضرت موسیٰؑ کو بھیجا گیا جو نبی اسرائیل ہی میں پیدا ہوئے۔ حضرت موسیٰؑ کی امداد کے لیے ان کے بھائی حضرت ہارونؑ کو بھی نبی بنایا گیا۔ حضرت موسیٰؑ نے فرعون کو سمجھایا بجھایا اور زبردست معجزے بھی دکھائے مگر وہ اکڑا رہا اور اپنی خدائی پر اصرار کیا۔ حضرت موسیٰؑ کو خدا تعالیٰ کی طرف سے دو معجزے عطا کیے گئے تھے۔ ایک تو ان کے عصا میں معجزانہ طاقت پیدا ہو گئی تھی کہ جب اسے زمین پر ڈالا جاتا تھا تو وہ سانپ کی شکل اختیار کر لیتا تھا اور دوسرے جب وہ اپنے ہاتھ کو بغل میں ڈال کر باہر نکالتے تھے تو وہ سفید چمکدار نکلتا تھا۔ مگر اس ہٹ دھرم انسان کے لیے یہ معجزے بھی بیکار تھے۔

دوسری گمراہ قوموں کی طرح یہاں بھی خدا کے نبی پر تہمت دھری گئی۔ حضرت ہودؑ کی قوم نے اپنے نبی کو "بیوقوف" کہا تھا۔ حضرت صالحؑ کی قوم نے انہیں "سحر زدہ" کا خطاب دیا تھا۔ فرعون نے حضرت موسیٰؑ کو "جادوگر" کہا اور اپنے جادوگروں کو ان کے مقابلے میں لے آیا۔ جادوگروں نے شعبدہ بازی کر کے رسیوں کو سانپ کر دکھایا مگر جب حضرت موسیٰؑ نے اپنا عصا پھینکا تو وہ بہت بڑا سانپ بن کر ان سب چھوٹے چھوٹے سانپوں کو نگل گیا۔ یہ معجزہ دیکھ کر جادوگر ایمان لے آئے اور سجدے میں گر گئے، مگر اس شکست نے بھی فرعون کو ایمان کی طرف راغب نہ کیا۔ اس علاقے میں بنی اسرائیل پر انسانیت سوز مظالم توڑے جاتے تھے۔ حضرت موسیٰؑ چاہتے تھے کہ اپنی قوم کو یہاں سے نکال لے جائیں مگر فرعون انہیں جانے بھی نہیں دیتا تھا۔

فرعون کا تکبر یہاں تک پہنچا ہوا تھا کہ لوگوں کو جمع کیا اور اعلان کر دیا کہ:

اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى. (النازعات : ۲۴)   ”میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں۔“

اور اپنے درباریوں سے کہا:

یٰاَیُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَکُمْ مِّنْ اِلٰهٍ   ”اے اہلِ دربار، میں تو اپنے سوا تمہارے
غَیْرِیْ. (القصص: ۳۸)   کسی خدا کو نہیں جانتا۔“

اللہ تعالیٰ نے یکے بعد دیگرے اس قوم پر کئی شکلوں میں عذاب نازل کیا۔ کبھی انہیں طوفان نے آلیا، کبھی ٹڈی دل نے حملہ کر دیا، کبھی چچڑیاں پھیل گئیں، کبھی مینڈکوں کی بہتات نے ان کی زندگی اجیرن کر دی، کبھی خون ان کے لیے باعثِ عذاب بن گیا۔ مگر ان کا یہ حال تھا کہ جب کوئی عذاب آتا تو کہنے لگتے کہ اے موسیٰؑ، اپنے رب سے دعا کر کہ ہم سے یہ عذاب ٹل جائے۔ اگر تم نے ہم سے یہ عذاب دور کرا دیا تو ہم ضرور تم پر ایمان لے آئیں گے اور بنی اسرائیل کو تمہارے ساتھ جانے دیں گے۔ مگر جب اللہ تعالیٰ ان سے عذاب کو ہٹا لیتا تو پھر بدعہدی پر اتر آتے۔ کئی دفعہ ایسے ہوا اور ہر بار عذاب کے ہٹ جانے پر انہوں نے بدعہدی کی۔

آخر جب حجت تمام ہو گئی تو حضرت موسیٰؑ نے ان ظالم لوگوں کے لیے بددعا کی جو خدا کے حضور میں مقبول ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو حکم دیا کہ اپنی قوم کو لے کر راتوں رات اس علاقے سے نکل جاؤ۔ جب فرعون کو پتہ چلا تو اس نے اپنے لشکروں کے ساتھ ان کا پیچھا کیا۔ جب وہ قریب آیا تو بنی اسرائیل گھبرا گئے کیونکہ آگے سمندر تھا اور پیچھے دشمن۔ مگر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو حکم دیا کہ اپنا عصا سمندر پر مارو۔ جونہی حضرت موسیٰؑ نے اس حکم کی تعمیل کی، سمندر میں راستہ بن گیا اور حضرت موسیٰؑ اور ان کے ساتھی خیریت سے پار چلے گئے۔ مگر جب فرعون اور اس کے لشکروں نے پار جانا چاہا تو سمندر میں ڈوب گئے۔ اب جب فرعون غرق ہونے لگا تو پھر کہہ اٹھا کہ:

اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآئِیْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ۝ (یونس: ۹۰)

"میں ایمان لایا اس بات پر کہ کوئی معبود نہیں سوائے اس کے جس پر بنو اسرائیل ایمان لائے ہوئے ہیں اور میں بھی سرِ اطاعت جھکا دینے والوں میں سے ہوں۔"

مگر اب چونکہ موت سامنے آ کھڑی ہوئی تھی اس لیے ایمان لانا بے فائدہ تھا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

آٰلْئٰنَ وَقَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ...... (یونس: ۹۱)

"اب ایمان لاتا ہے! حالانکہ اس سے پہلے تک تو نافرمانی کرتا رہا۔"

ان لوگوں کے انجامِ بد سے عبرت دلاتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"وہ لوگ کتنے ہی باغ اور چشمے اور کھیتیاں اور عمدہ عمدہ مکان اور آرام کے سامان، جن میں وہ خوش رہا کرتے تھے (اپنے پیچھے) چھوڑ گئے، اسی طرح ہوا۔ اور ہم نے ایک دوسری قوم کو ان کا مالک بنا دیا۔ سو ان (بدکرداروں کے اس عبرتناک انجام) پر نہ تو آسمان اور زمین کو رونا آیا اور نہ ان کو مہلت ہی دی گئی۔" (الدخان، از ۲۵ تا ۲۹)

اصحابِ مدین: "مدین کا اصل علاقہ حجاز کے شمال مغرب اور فلسطین کے جنوب میں بحر احمر اور خلیج عقبہ کے کنارے پر واقع تھا، مگر جزیرہ نمائے سینا کے مشرقی ساحل پر بھی اس کا کچھ سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ یہ ایک بڑی تجارت پیشہ قوم تھی۔ قدیم زمانے میں جو تجارتی شاہراہ عراق سے مصر کی طرف جاتی تھی، اس کے عین چوراہے پر اس قوم کی بستیاں واقع تھیں۔ اسی بناء پر عرب کا بچہ بچہ مدین سے واقف تھا اور اس کے مٹ جانے کے بعد بھی عرب میں اس کی شہرت برقرار رہی۔ کیونکہ عربوں کے تجارتی قافلے مصر اور شام کی طرف جاتے ہوئے رات دن اس کے آثارِ قدیمہ کے درمیان میں سے گزرتے تھے...... اہلِ مدین بھی

بنو اسرائیل کی طرح ابتداً مسلمان ہی تھے۔ (ان کی طرف حضرت شعیبؑ کو نبی بنا کر بھیجا گیا تھا) اور حضرت شعیبؑ کے ظہور کے وقت ان کی حالت ایک بگڑی ہوئی مسلمان قوم کی سی تھی۔ جیسی کہ حضرت موسیٰؑ کے ظہور کے وقت بنو اسرائیل کی تھی (یہ لوگ حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے مدیان کی طرف منسوب ہیں جو ان کی تیسری بیوی قطورا کے بطن سے تھے) حضرت ابراہیمؑ کے بعد چھ سات سو برس تک مشرک اور بداخلاق قوموں کے درمیان رہتے رہتے یہ لوگ شرک بھی سیکھ گئے تھے اور بداخلاقیوں میں بھی مبتلا ہو گئے تھے، مگر اس کے باوجود ایمان کا دعویٰ اور اس پر فخر برقرار تھا۔" (تفہیم القرآن، جلد دوم، صفحہ ۵۴، ۵۵)

اس بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ اصحابِ مدین میں خدا پرستی رہ چکی تھی اور اب بھی انہیں دعویٰ یہی تھا کہ ہم ایمان والے ہیں۔ مگر وہ اعتقادی اور اخلاقی گمراہیوں میں مبتلا ہو چکے تھے اور انہیں خرابیوں کی اصلاح کے لیے حضرت شعیبؑ کو بھیجا گیا تھا۔ کلام پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں دو خرابیاں خصوصی طور پر پائی جاتی تھیں۔ ایک شرک دوسری تجارتی معاملات میں بددیانتی۔

حضرت شعیبؑ انہیں سمجھاتے کہ:

"صحیح ترازو سے تولو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو، زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو اور اس ذات کا خوف کرو جس نے تمہیں اور گذشتہ نسلوں کو پیدا کیا ہے۔"

(الشعراء: ۱۸۲ تا ۱۸۴)

وہ انہیں توحید خدا کی بندگی اور تجارتی دیانت داری کا سبق پڑھاتے، انہیں فتنہ و فساد پھیلانے اور حق کی راہ روکنے سے منع فرماتے، انہیں خدا کے انعامات یاد دلاتے اور مفسدوں کے انجامِ بد سے ڈراتے۔

"شعیبؑ نے کہا کہ اے میری قوم، اللہ کی بندگی کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی خدا

نہیں ہے۔ تمہارے پاس تمہارے رب کی صاف رہنمائی آ گئی ہے۔ لہٰذا وزن اور پیمانے پورے کرو، لوگوں کو ان کی چیزوں میں گھاٹا نہ دو اور زمین میں فساد برپا نہ کرو، جب کہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے۔ اسی میں تمہاری بھلائی ہے، اگر تم واقعی مومن ہو۔ اور (زندگی کے) ہر راستے پر رہزن بن کر نہ بیٹھ جاؤ کہ لوگوں کو خوفزدہ کرنے اور ایمان لانے والوں کو خدا کے راستے سے روکنے لگو اور سیدھی راہ کو ٹیڑھا کرنے کے درپے ہو جاؤ۔ یاد کرو وہ زمانہ جب کہ تم تھوڑے تھے، پھر اللہ نے تمہیں بہت کر دیا اور آنکھیں کھول کر دیکھو کہ دنیا میں فساد پھیلانے والوں کا کیا انجام ہوا ہے۔" (الاعراف: ۸۵،۸۶)

دوسرے انبیاء کی طرح حضرت شعیبؑ نے بھی اپنے اخلاص کی دلیل کے طور پر اس گمراہ قوم کو توجہ دلائی کہ:

"میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ میرا اجر تو رب العلمین کے ذمے ہے۔" (الشعراء: ۱۸۰)

مگر اس ساری مخلصانہ جدوجہد کے جواب میں سرکش اور ہٹ دھرم قوم اپنی سرکشی پر اڑی رہی اور ویسی ہی باتیں کیں جیسی دوسری گمراہ قومیں کرتی آئی تھیں۔

انہوں نے بھی اپنے نبی سے یہی کہا کہ:

"تم تو صرف ایک بشر ہو، ہماری ہی مانند، اور ہم تو تمہیں بالکل جھوٹا سمجھتے ہیں۔"

(الشعراء: ۱۸۶)

انہوں نے بھی اپنے نبی پر الزام لگایا کہ:

"تم تو محض ایک سحر زدہ آدمی ہو۔" (الشعراء: ۱۸۵)

انہیں بھی غصہ تھا کہ انہیں کیوں ان چیزوں کی پرستش سے روکا جا رہا ہے، جنہیں ان کے باپ دادا پوجتے چلے آ رہے تھے۔

''ان لوگوں نے کہا: اے شعیبؑ' کیا تیری نماز تجھے یہی سکھاتی ہے کہ ہم ان (بتوں) کو چھوڑ دیں جنہیں ہمارے باپ دادا پوجتے چلے آئے ہیں......'' (ہود :۸۷)

یہاں بھی یہی ہوا کہ سرداروں نے عوام کو حق کی طرف جانے سے روکا اور سکھلایا پڑھایا کہ:

''......اگر تم نے شعیبؑ کی پیروی کی تو تم گھاٹے میں جا پڑو گے۔''

(الاعراف:۹۰)

یہاں بھی نبی کی پیروی کرنے کے بجائے اسے اپنی پیروی کی طرف بلایا گیا اور دھمکایا گیا کہ:

''اے شعیبؑ' ہم تجھے (بھی) اور ان لوگوں کو (بھی) جو تیرے ساتھ ایمان لائے ہیں' اپنی بستی سے نکال دیں گے۔ ورنہ تم لوگوں کو ہماری ملت میں واپس آنا ہوگا......''

(الاعراف:۸۸)

ان لوگوں نے بھی عذاب سے ڈرائے جانے پر ڈرنے کے بجائے خدا کے غضب کو دعوت دی کہ:

''اگر تو سچا ہے تو ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا گرا دے۔'' (الشعراء:۱۸۷)

آخر وہ آسمان کا ٹکڑا گرنے کا دن بھی آ ہی گیا۔

''پس ایک دہلا دینے والی آفت نے انہیں آلیا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے کے اوندھے پڑے رہ گئے۔ جن لوگوں نے شعیبؑ کو جھٹلایا' وہ ایسے مٹے گویا کبھی ان گھروں میں بسے ہی نہ تھے۔ جن لوگوں نے شعیبؑ کو جھٹلایا (آخر کار) وہی نقصان اٹھانے والے ہو گئے۔'' (الاعراف:۹۱'۹۲)

''آخر کار جب ہمارے فیصلے کا وقت آ گیا تو ہم نے اپنی رحمت سے شعیبؑ اور

اس کے ساتھی مومنوں کو بچالیا اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا ان کو ایک سخت دھماکے نے ایسا پکڑا کہ وہ اپنی بستیوں میں بے حس و حرکت پڑے کے پڑے رہ گئے، گویا وہ کبھی وہاں رہے بسے ہی نہ تھے---- سنو، مدین والے بھی دور پھینک دیے گئے، جس طرح ثمود پھینکے گئے تھے۔" (ہود: ۹۴، ۹۵)

اس گمراہ قوم کا انجامِ بد بتا کر آخر میں یہاں بھی تنبیہ دلائی گئی ہے کہ:

......اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً ط...... (الشعرا : ۱۹۰) یقیناً اس میں ایک نشانی ہے۔

عبرت کی تاکید

کلام پاک میں اللہ تعالیٰ نے صرف عبرت ناک قصے بیان کر دینے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ وضاحت سے عبرت حاصل کرنے کی تلقین بھی فرمائی ہوئی ہے۔

......فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ○ (الحشر : ۲)	پس اے دانشمندو، عبرت حاصل کرو۔
......فَانْظُرْ کَیْفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الْمُجْرِمِیْنَ○ (الاعراف : ۸۴)	پھر دیکھو کہ ان مجرموں کا کیا انجام ہوا۔
......فَانْظُرْ کَیْفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الْمُفْسِدِیْنَ○ (الاعراف : ۱۰۳)	پس دیکھو کہ ان مفسدوں کا کیا انجام ہوا۔
......فَانْظُرْ کَیْفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الظّٰلِمِیْنَ○ (یونس: ۳۹)	پھر دیکھو ان ظالموں کا کیا انجام ہوا۔
......فَانْظُرْ کَیْفَ کَانَ عَاقِبَۃُ مَکْرِھِمْ اَنَّا دَمَّرْنٰھُمْ وَقَوْمَھُمْ اَجْمَعِیْنَ○ (النمل : ۵۱)	اب دیکھ لو کہ ان کی چال کا انجام کیا ہوا۔ ہم نے تباہ کر کے رکھ دیا ان کو اور ان کی پوری قوم کو۔

زندگی میں دوسروں کو دیکھ کر عبرت حاصل کرنا درحقیقت عقلمندی کی علامت ہے اور عبرت حاصل کرنے سے لاپروائی کرنا درحقیقت بیوقوفی کی دلیل ہے۔ جو شخص برے کو اپنی برائی کی سزا پاتے دیکھتا ہے اور پھر بھی برائی کرتا ہے، وہ صرف سرکش اور ڈھیٹ ہی نہیں بلکہ احمق بھی ہے۔ اگر اس میں عقل ہوتی تو وہ دوسرے کو مبتلائے مصیبت دیکھ کر اپنے آپ کو مصیبت سے بچانے کا بندوبست کرتا۔ حضورؐ عبرت کو کتنی اہمیت دیتے تھے۔ ذیل کی حدیث سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے۔

حضرت عبداللہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم (ثمود کی تباہ شدہ بستی) حجر کے پاس سے گزرے تو آپؐ نے فرمایا کہ تم ان لوگوں کے ٹھکانوں میں جنہوں نے ظلم کیا تھا، روتے ہوئے داخل ہونا۔ کہیں ایسے نہ ہو کہ تم پر بھی وہ مصیبت آ جائے جو ان پر آئی تھی۔ پھر آپؐ نے سواری پر بیٹھے بیٹھے اپنی چادر سے منہ ڈھانپ لیا۔ (بخاری)

حضرت علیؓ کا فرمان ہے: "جس نے عبرت حاصل کی اس نے حقیقت کو دیکھ لیا اور سمجھ گیا، اور جو سمجھ گیا اسے علم حاصل ہو گیا۔"

غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ عبرت کا سامان تو قدم قدم پر موجود ہوتا ہے کیونکہ عبرت صرف برائی کے برے انجام ہی سے نہیں ملتی، بلکہ عبرت کا بہت بڑا ماخذ تو موت کا المیہ ہے اور یہ المیہ انسان کو چاروں طرف سے گھیرے رہتا ہے۔

کس کو معلوم ہے کہ جو دن شروع ہو گیا ہے اس کے اختتام تک وہ ضرور زندہ رہے گا۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ جو رات چھا گئی ہے، اس کی صبح وہ ضرور دیکھ لے گا۔

صحیح بخاری میں بیان ہوا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کو جب بخار آتا تو یہ شعر پڑھتے

كُلُّ امْرِىءٍ مُصَبَّحٌ فِىْ اَهْلِهٖ
وَالْمَوْتُ اَدْنٰى مِنْ شِرَاكِ نَعلِهٖ

(ہر شخص اپنے گھر والوں میں صبح کرتا ہے اور صورت یہ ہوتی ہے کہ موت اس کے جوتے کے تسمے سے بھی زیادہ اس کے قریب ہوتی ہے)

کہاں گئیں وہ پیاری شکلیں جن کے بغیر لمحہ نہیں گزرتا تھا۔ آج وہ منوں مٹی کے کے نیچے دفن ہو چکی ہیں۔ تو آخر ہمیں بھی منوں مٹی کے نیچے پہنچنے میں کون سی دیر لگنی ہے۔ تو پھر ہمیں کیا ہو گیا ہے کہ ان کی جدائی میں آنسو تو بہاتے ہیں مگر جہاں وہ جا چکے ہیں اور جہاں لازماً ہم نے بھی جانا ہے' اس کی تیاری کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔

حضرت فضیلؒ سے ایک شخص نے عرض کیا کہ مجھے نصیحت فرمایئے۔ انہوں نے پوچھا کہ کیا تیرا والد وفات پا چکا ہے۔ اس نے کہا۔ جی ہاں۔ حضرت فضیلؒ نے فرمایا کہ جو شخص والد کی وفات کے بعد بھی وعظ کا محتاج ہے اسے کوئی نصیحت کارگر نہیں ہو سکتی۔

* * *

۴۔ بُرا ماحول

صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہؓ سے ایک روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے والدین اسے یہودی بنا لیتے ہیں یا عیسائی بنا لیتے ہیں۔''

اتنا بیان کر کے آگے آپؐ نے ایک مثال دی کہ جب چوپایہ بچہ پیدا کرتا ہے تو وہ بچہ کن کٹا نہیں ہوتا بلکہ صحیح سالم ہوتا ہے۔ پھر بعد میں تم لوگ اس کا کان کاٹ کر اسے کن کٹا کر دیتے ہو۔

حضورؐ کے اس فرمان مبارک سے دو باتوں کی وضاحت ہوتی ہے۔

۱۔ انسان پیدائشی طور پر گنہگار نہیں ہے بلکہ جب وہ پیدا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔

۲۔ ماحول انسان کو اپنے رنگ میں رنگ لیتا ہے۔

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے، سورہ البقرہ آیت ۳۰ میں اس بات کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ انسان دنیا میں ایک مجرم کی حیثیت سے نہیں بلکہ خدا کے نائب کی حیثیت سے بھیجا گیا تھا۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰئِکَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ط......

اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک نائب بنانے والا ہوں۔

یہ بات کہ اس نے اس دنیا سے آنے سے پہلے ہی شجرِ ممنوعہ کا پھل چکھ کر خدا کی نافرمانی کر لی تھی۔ اسے پیدائشی گنہگار نہیں بناتی، کیونکہ اس غلطی کے بعد اور دنیا میں آنے سے پہلے اس نے توبہ بھی کر لی تھی اور خدا نے اس کا گناہ بخش بھی دیا تھا:

فَتَلَقّٰۤی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ کَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیْهِ ط اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ. (البقرہ: ۳۷)

پھر آدم نے اپنے رب سے (توبہ کے) کلمات سیکھ لیے (اور توبہ کی) تو اللہ تعالیٰ نے اس کی توبہ قبول کر لی، بیشک وہ بہت توبہ قبول کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

اور جو شخص توبہ کر لے وہ ویسا ہی پاک ہو جاتا ہے جیسا اس گناہ کرنے سے پہلے تھا۔

حضرت عبداللہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ گناہ سے توبہ کرنے والا ویسا ہی ہے جیسا وہ شخص جس نے گناہ نہ کیا ہو۔ (ابن ماجہ)

یہاں اسلام کا نظریہ بعض دوسرے مذاہب کے نظریوں سے ٹکراتا ہے جن کا یہ خیال ہے کہ چونکہ انسان نے دنیا میں قدم رکھنے سے پہلے ہی گناہ کر لیا تھا، اس لیے وہ پیدائشی طور پر گنہگار ہے اور دنیا میں اسے اس لیے بھیجا گیا ہے کہ اپنے گناہ کی سزا بھگتے۔ گویا دنیا میں انسان کی حیثیت ایک مجرم کی سی ہے اور یہ دنیا اس کے لیے قید خانہ ہے جہاں اسے اس کے جرم کی سزا دی جا رہی ہے۔

اس کے برعکس اسلام کا نکتہ نگاہ یہ ہے کہ انسان دنیا میں خدا کا نائب بن کر آیا ہے اور دنیا اس کے لیے میدانِ عمل ہے۔ جب وہ اس میدانِ عمل میں داخل ہوتا ہے تو ایک سچے

خدا پرست کی حیثیت سے داخل ہوتا ہے اور اگر وہ سچی خدا پرستی کی راہ سے ہٹتا ہے تو اس ماحول کے اثرات کے باعث ہٹتا ہے جس نے اسے قریبی گھیرے میں لے رکھا ہوتا ہے۔ ایک یہودی کا بچہ ہو یا عیسائی کا یا آتش پرست کا یا بت پرست کا' جب وہ پیدا ہوتا ہے تو وہ ایک سچے مسلم کی حیثیت سے پیدا ہوتا ہے۔ پھر جیسے جیسے وہ شعور کی منزلیں طے کرتا جاتا ہے' اس کا ماحول اس پر غالب آتا جاتا ہے اور اسے اپنے سانچے میں ڈھالتا چلا جاتا ہے اور وہ اسی مذہب کا پیرو ہو جاتا ہے جسے اس کے والدین نے اختیار کیا ہوتا ہے۔

غرضکہ ماحول کا اثر بہت گہرا ہوتا ہے اور بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی انسان اپنے ماحول کے خلاف عقائد اختیار کر لے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض اوقات کوئی شخص اچھے ماحول میں رہ کر بھی برا نکل آتا ہے اور ایسے ہی کوئی انسان برے ماحول میں رہ کر بھی اچھائی کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ مثلاً حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کی بیویاں پیغمبروں کی رفاقت میں رہتے ہوئے بھی بری ہی رہیں اور فرعون کی بیوی ایک سرکش و باغی کے ساتھ زندگی گزارتے ہوئے بھی نیکوکار رہی۔ مگر ایسی صورتیں بہت شاذ ہوتی ہیں۔ جو اصول عام طور پر دنیا میں جاری ساری ہے وہ یہی ہے کہ انسان اپنے ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

انسانی فطرت ہے ہی ایسی کہ جب کوئی بری بات پہلی دفعہ مشاہدے میں آئے تو دل میں اس کے لیے بہت نفرت پیدا ہوتی ہے مگر وہی شے جب دوسری دفعہ دیکھی جائے تو وہ نفرت کچھ کم ہو چکی ہوتی ہے۔ پھر تیسری دفعہ دیکھنے سے وہ مزید کم ہوتی ہے۔ اسی طرح بار بار دیکھتے رہنے سے وہ نفرت کم ہوتی ہوتی آخر ختم ہو جاتی ہے اور انسان اس برائی کے معاملے میں بے حس سا ہو جاتا ہے۔ پھر یہ معاملہ یہاں پر بھی ختم نہیں ہوتا بلکہ جب کسی چیز سے نفرت ختم ہوتی ہے تو پھر اس میں کچھ دلچسپی پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہے اور اگر وہ چیز زندگی میں بار بار مشاہدے میں آتی ہی چلی جائے تو پھر وہ دلچسپی بڑھتے بڑھتے آخر معاملہ

یہاں تک آ پہنچتا ہے کہ انسان اسے عملاً اختیار کر لیتا ہے۔

ایک طالب علم بچی نے اپنا ایک تجربہ بتایا کہ سکول کی تعلیم ختم کر کے جب میں کالج پہنچی تو اتفاق سے مجھے ایک ایسے کالج میں جگہ ملی جہاں "ثقافتی سرگرمیوں" کو بہت زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ داخلے سے چند دن بعد ہی جب میں نے طالبات کی قائم کی ہوئی ایک ناچ رنگ کی محفل میں شرکت کی تو مجھے یہ سب کچھ سخت قابلِ اعتراض لگا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ طالب علم لڑکیاں اپنے رتبے سے اتنا نیچے کیوں گر رہی ہیں کہ پاؤں میں گھنگرو باندھ کر چھما چھم ناچنے کو اپنا کمال سمجھے بیٹھی ہیں۔ جب میں نے اپنی سہیلیوں کے آگے اپنے شدید غم و غصے کا اظہار کیا تو وہ بڑی بے نیازی سے بولیں۔ لو بھئی، بس ذرا ڈانس ہی ہو رہا ہے نا! آخر اس میں ایسی ہی قابل اعتراض بات کون سی ہے۔ جب میں نے اصرار کیا کہ یقیناً یہ حرکات سخت قابلِ اعتراض ہیں تو وہ ہنسنے لگیں اور بولیں کہ بات اصل میں یہ ہے کہ تم ابھی نئی نئی آئی ہو، اس لیے تمہیں یہ سب کچھ برا لگ رہا ہے۔ جب کچھ دن یہاں رہ لو گی تو پھر تمہیں کچھ بھی برا نہیں لگا کرے گا۔

بچی کہتی ہے کہ ان کی بات سن کر میں نے جی ہی جی میں کہا کہ کبھی بھی ایسے نہیں ہو سکتا کہ میں اس لہو ولعب کی اتنی عادی ہو جاؤں کہ یہ مجھے برا لگنا بند ہو جائے۔ مگر کچھ عرصہ گزرنے کے بعد مجھے پتہ چلا کہ ٹھیک بات وہی تھی جو انہوں نے کہی تھی، اور میں ہی غلطی پر تھی، کیونکہ جب میں نے آئے دن ایسی مجالس میں شرکت کرنا شروع کر دیا، تو آخر میں نے محسوس کیا کہ اس "لہو ولعب" کے خلاف میرے دل کی نفرت بتدریج کم ہوتی جا رہی ہے۔ پھر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، یہ نفرت کا جذبہ کم سے کم ہوتا ہوتا آخر بالکل ختم ہو گیا اور کہاں تو پہلے دن میں نے شدید غم و غصے کا اظہار کیا تھا اور کہاں اب میں ان مجلسوں کا انتظار کرنے لگی۔ یہ دلچسپی بھی کسی جگہ رکی نہیں بلکہ بڑھتی ہی چلی گئی اور آخر کار میں نے وہی

فقرے بولنے شروع کر دیئے جو میری سہیلیاں بولا کرتی تھیں کہ:

''آخر اس میں ایسی قابلِ اعتراض بات کون سی ہے۔'' ''ذرا ہاتھ پاؤں کو حرکت ہی تو دی جا رہی ہے۔ آخر اس سے معاشرے میں کیا خرابی پیدا ہو سکتی ہے!''

ایسے ہی ایک خاتون نے اپنا ایک تجربہ بیان کیا کہ حالات کی تبدیلی نے مجھے ایک ایسے ماحول میں لا ڈالا جہاں لباس پر حد سے زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ شروع شروع میں میرا یہ حال تھا کہ جب میں دیکھتی کہ وہاں کی معزز خواتین ہر وقت کپڑوں ہی کی باتیں کرتی رہتی ہیں تو مجھے جی ہی جی میں بہت شرم آتی۔ شرم ہی نہیں بلکہ تعجب بھی ہوتا کہ یہ پڑھی لکھی جاننے بوجھنے والی خواتین، جو روز اخبار پڑھتی ہیں اور ملکی اور عالمی حالات سے پوری واقفیت رکھتی ہیں۔ آخر بڑی بڑی اہم باتوں کو چھوڑ کر بار بار صرف لباس اور اس کی تراش خراش ہی کی باتیں کیوں کرتی ہیں۔ ان کے گروہ میں سے جب کسی دن کوئی خاتون کوئی نیا لباس پہن کر آ جاتیں تو باقی سب خوب زور و شور سے داد دیتیں کہ ''واہ بھئی واہ! کیا ٹھاٹ دار قمیض پہنی ہے۔'' باہر سے مہمان خواتین ملنے آتیں تو ان کی آؤ بھگت کا ایک ضروری حصہ یہ ہوتا کہ ان کے لباس کی تعریف و توصیف کی جائے۔

خاتون بتاتی ہیں کہ دن گزرتے گئے اور مجھے پتہ بھی نہ چلا کہ وہ شرم جو میں شروع شروع میں محسوس کرتی تھی مع اس تعجب کے، جو مجھے ان کی حرکات پر آتا تھا، کہاں غائب غلہ ہو گئی۔ ابھی مجھے وہاں آئے چھ ماہ بھی نہیں ہوئے تھے کہ میں بھی اپنے وقت کے اکثر حصے کو لباس کی تراش خراش سے تعلق رکھنے والی باتوں پر صرف کرنے لگی۔ معاً ایک دن مجھ پر یہ منکشف ہوا کہ میں پورے پورے طور پر ان کے رنگ میں رنگی جا چکی ہوں۔ وہ اس طرح کہ ایک ملنے والی میری ملاقات کو آ گئیں۔ انہوں نے ایک خوبصورت کوٹی پہنی ہوئی تھی، جس پر شیشے کے ٹکڑوں کا کام تھا۔ سلام دعا کے بعد پہلی بات جو میرے منہ سے نکلی وہ یہی تھی

کہ میں نے ان کی خوبصورت کوٹی کی تعریف وتوصیف شروع کر دی اور جس وقت میں اس پر کی ہوئی کاریگری کی تعریفوں کے پل باندھ رہی تھی، معاً میرے ذہن میں یہ بات آ گئی کہ یہ تو ٹھیک وہی حرکت ہے جس پر شروع میں مجھے شرم آیا کرتی تھی!

ایک اچھے بھلے تعلیم یافتہ خاندان کی ایک پڑھی لکھی شائستہ لڑکی کی شادی ایک ایسے شخص سے ہو گئی، جو اگرچہ تعلیم میں اس سے دو قدم آگے ہی تھا، مگر اسے فحش قسم کی گالیاں دینے کی عادت تھی۔ شادی کے بعد بہت جلد لڑکی نے محسوس کر لیا کہ اسے جہنم میں دھکیل دیا گیا ہے۔ حالات کو سدھارنے کی کوئی کوشش کامیاب نہ ہو سکی اور باہمی تعلقات کشیدہ سے کشیدہ تر ہوتے چلے گئے۔ وہ شخص اسے فحش گالیاں دیتا، مار پیٹ کرتا اور ہر ممکن طریقے سے اسے ستاتا۔ لڑکی علیحدگی چاہتی تھی، مگر وہ اس پر بھی آمادہ نہ ہوتا۔ ایک دن وہ لڑکی اپنی اس مصیبت کے سلسلے میں کچھ مشورہ کرنے آ گئی اور اپنے دکھوں کی کہانی سنانے لگی۔ وہ کم وبیش ڈیڑھ دو گھنٹے مسلسل بولتی رہی اور اس دوران میں اس نے جو زبان استعمال کی وہ حیران کن تھی۔ باوجود اس امر کے کہ ان کی باہمی کشیدگی کا سب سے پہلا سبب اس کی خاوند کی گندی زبان ہی بنا تھا۔ اس چار سالہ شادی شدہ زندگی میں وہ اس زبان سے اتنی مانوس ہو چکی تھی کہ انتہائی عریاں قسم کی گالیاں، جن کا کسی اچھے خاندان کی تعلیم یافتہ لڑکی تو کجا، جاہل ان پڑھ لڑکی بھی تصور تک نہیں کر سکتی، بے تکلف اس کی زبان سے نکلی چلی جا رہی تھیں۔ یہ بتاتے ہوئے کہ میرا خاوند مجھے ایسے اور ایسے کہتا ہے۔ اس نے اتنی فحش زبان استعمال کی کہ سننے والی بے چاری کے اوسان خطا ہو گئے۔ جب اسے توجہ دلائی گئی کہ وہ انتہائی ناپاک زبان استعمال کر رہی ہے تو وہ پہلے تو کچھ ٹھٹکی اور پھر بلک بلک کر رونے لگی اور بولی کہ خدا کی قسم مجھے تو پتہ بھی نہیں چلتا کہ میرے منہ سے کیا کچھ نکلا چلا جا رہا ہے۔

پتہ نہ چل سکنے کی وجہ ظاہر تھی کہ ہر وقت وہ گندی زبان سنتے رہنے کے باعث

اب اس کی شناعت کا احساس اتنا گہرا نہیں رہا تھا کہ اسے دہرانے سے روک سکتا اور جب کسی شنیع بات کی شناعت کا احساس ختم ہو جاتا ہے تو پھر اس سے اگلا قدم یہی ہو سکتا ہے کہ اسے اختیار کرنا شروع کر دیا جائے۔

یہ چند عام سی مثالیں ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ انسان کس طرح غیر ارادی طور پر ماحول سے متاثر ہوتا چلا جاتا ہے۔ جامع ترمذی میں حضورؐ کی طرف سے ایک روایت بیان ہوئی ہے کہ جب نبی اسرائیل کے اچھے لوگوں نے ان کے برے لوگوں کو برائیوں پر ٹوکنا چھوڑ دیا اور ان کے ساتھ کھاتے پیتے اور اٹھتے بیٹھتے رہے تو پھر ان بروں کے دلوں کی سیاہی ان اچھوں کے دلوں پر بھی تھوپ دی گئی اور ان پر لعنت کی گئی۔

لہٰذا جب ہم نفس کی خرابیوں کے اسباب پر غور کرتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ یہ سب اسباب داخلی ہی نہیں ہیں بلکہ ان میں ایک خارجی سبب بھی شامل ہے جو قوت و تاثیر میں اول الذکر اسباب سے کم نہیں۔ غفلت، حبِ خواہشات اور عبرت پذیری کی کمی بلاشبہ نفس کی خرابی کے بہت بڑے بڑے اسباب ہیں اور کوئی شک وشبہ نہیں کہ ان کا علاج بے انتہا مشکل ہے۔ تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ یہ اسباب ہیں انسان کے اپنے اختیار کے اندر۔ ان کے لیے اسے کسی دوسرے کی خوشامد کرنے کی ضرورت نہیں۔ فرض کر لیجئے ایک انسان کا دل غافل ہے، وہ دنیاوی حرص میں بری طرح مبتلا ہے اور وہ دوسروں کو اپنے کیے کی سزا پاتے دیکھ کر اور دنیا سے رخصت ہوتے دیکھ کر ذرا بھی عبرت نہیں پکڑتا۔ اب جب تک اسے ان خرابیوں کا احساس نہیں ہوگا، یہ خرابیاں اس میں پلتی بڑھتی اور مزید خرابیاں پیدا کرتی رہیں گی۔ مگر جیسے ہی اسے اپنی ان عاداتِ بد کا احساس ہو جائے گا اور وہ ان کا قلع قمع کرنے کا عزم کر لے گا، تو پھر اس کی راہ میں درحقیقت کوئی حقیقی رکاوٹ موجود نہیں ہوگی، کیونکہ اپنی اصلاح کے سلسلے میں اس نے جو کچھ بھی کرنا ہے خود ہی کرنا ہے۔ کسی اور سے جا کر

درخواست نہیں کرنی کہ بھئی مہربانی کر کے ذرا میرے دل کو ہوشیار کر دینا۔ ازرۂ کرم ذرا اس سے حرص اور لالچ کو کھرچ دینا' براہ مہربانی ذرا اسے ایسا بنا دینا کہ یہ دوسروں کے انجامِ بد سے عبرت پکڑے ---- اصلاحِ نفس بڑی کٹھن مہم ہے مگر ہے انسان کے اپنے اختیار کے اندر۔

مگر اس کے برعکس خرابیِ نفس کا چوتھا سبب یعنی برا ماحول' ایک ایسا سبب ہے۔ جو ہمارے اختیار سے بالکل باہر ہوتا ہے۔ کیونکہ ماحول نام ہے دوسرے لوگوں کا اور دوسرے لوگوں کی خرابیوں کا احساس ہو بھی جائے تو بھی ان کی اصلاح کرنا آپ کے اختیار میں نہیں ہے بلکہ آپ نے دوسروں ہی سے درخواست کرنی ہے کہ ازرہِ مہربانی اپنی اصلاح کر لیجئے اور پھر دوسروں کی مرضی ہے کہ وہ آپ کی بات مانیں یا نہ مانیں اور اگر وہ نہ مانیں اور اپنی برائیوں پر مصر رہیں تو پھر ان کے گھیرے میں گھرے ہوئے ہونے کے باعث زود یا بدیر آپ کا ان کی برائیوں سے متاثر ہو جانا تقریباً لازمی ہو جاتا ہے۔

اب جہاں تک اس لفظ "ماحول" کے مفہوم کا تعلق ہے' یاد رکھنا چاہیے کہ یہ لفظ ہم صرف اپنے اردگرد رہنے والے قریبی لوگوں ہی کے لیے استعمال نہیں کرتے' بلکہ بسا اوقات یہ لفظ ان لوگوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جو درحقیقت ہم سے دور ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر جب ہم کہتے ہیں کہ "آجکل کا ماحول خراب ہے" تو اس سے ہماری مراد صرف اپنا گلی محلہ یا ملنے ملانے والے لوگوں کا حلقہ ہی نہیں ہوتا بلکہ ہمارا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس وقت دنیا میں عام طور پر خرابی پھیلی ہوئی ہے۔ غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ "ماحول" کا لفظ ہم غیر ارادی طور پر چار معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ کبھی ماحول کا لفظ بول کر ہم وہ میلانات اور عادات واطوار مراد لیتے ہیں جو کسی خاص زمانے میں کل دنیا میں پھیلی ہوتی ہیں۔ کبھی اس لفظ سے ہماری مراد وہ مخصوص میلانات اور طور طریقے ہوتے ہیں جو ہمارے

اپنے ملک میں جاری و ساری ہو چکے ہوتے ہیں۔ کبھی ماحول کا لفظ ہم اپنے خاندان کے لیے استعمال کرتے ہیں اور کبھی ماحول کہہ کر ہماری مراد ملنے ملانے والوں کا حلقہ ہوتا ہے۔

لہٰذا جب ہم کہتے ہیں کہ خرابی نفس کا ایک سبب ''براماحول'' ہے تو اس سے کبھی ہم وہ برائیاں مراد لیتے ہیں جو دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ چند ایک ملکوں سے نکلتی ہیں اور پھر پھیلتے پھیلتے دنیا کے کثیر حصے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہیں۔

کبھی براماحول کہنے سے ہماری مراد وہ مخصوص خرابیاں ہوتی ہیں جو ہمارے اپنے ملک میں پھیل چکی ہوتی ہیں۔ یہ بھی عموماً کسی ایک طبقے سے نکلتی ہیں اور پھر سارے طبقات میں پھیل کر ملک گیر ہو جاتی ہیں۔

ایسے ہی کبھی براماحول کہنے سے ہماری مراد وہ بد عادات ہوتی ہیں جو ہمارے اپنے کنبے میں پائی جاتی ہیں اور کبھی یہ ترکیب ہم ان برائیوں کے لیے استعمال کرتے ہیں جو ہمارے ملنے ملانے والے حلقے میں پائی جاتی ہیں۔

ماحول کی ان چاروں اقسام میں سے ہر قسم انسان پر لازماً اثر ڈالتی ہے۔ انسان ان برائیوں سے بھی متاثر ہوتا ہے جو دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہوتی ہیں' ان کا اثر بھی قبول کرتا ہے جو اپنے ملک میں جاری و ساری ہوتی ہیں' اپنے خاندان کی مخصوص برائیوں نے بھی اس پر اثر انداز ہونا ہی ہوتا ہے اور حلقۂ احباب کی عاداتِ بد تو اور بھی زیادہ گہرا اثر چھوڑتی ہیں۔

ماحول کی ان چاروں قسموں میں سے پہلی تین قسموں کے بارے میں تو انسان بہت حد تک بے اختیار ہوتا ہے۔

جہاں تک عالم گیر برائیوں کا تعلق ہے۔ ہماری بے اختیاری کی تشریح یہ ہے کہ نہ ہم اپنی مرضی سے اس دنیا میں آئے تھے اور نہ اس سے کٹ کر زندگی گزارنا ہمارے لیے ممکن ہے۔ کیونکہ انسان ایک معاشرتی حیوان ہے۔ اس نے لازماً دوسروں کے ساتھ مل کر ہی

زندگی گزارنا ہوتی ہے اور ذرائع رسل ورسائل کے بے انتہا ترقی کر جانے کے باعث دنیا اب اس طرح سمٹ گئی ہے اور اس کے مختلف حصے ایک دوسرے کے اتنے قریب آ گئے ہیں کہ اس نے گویا ایک کنبے کی شکل اختیار کر لی ہے۔ جس طرح کسی گھرانے کے ایک فرد کے اعمال باقی سب افراد کو متاثر کرتے ہیں۔ اسی طرح دنیا کے ایک کونے میں جو کچھ ہوتا ہے، اس کے اثرات برق رفتاری کے ساتھ اس کے دوسرے کونوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر موجودہ زمانے کی شدید قسم کی مادہ پرستی یورپ اور امریکہ سے نکلی تھی، مگر ہم دیکھ سکتے ہیں کہ اب یہ مادہ پرستی دنیا کے تقریباً ہر ملک کو متاثر کر رہی ہے۔ کم وبیش ہر ملک کی یہی کیفیت ہے کہ اس کی غالب آبادی صرف مال ودولت اور دنیاوی عزت وجاہ کے پیچھے دوڑ رہی ہے۔ روح کی بلندی، اخلاق کی اصلاح اور موت کے بعد کی دائمی زندگی میں عزت وجاہ حاصل کرنے کی خواہش صرف خال خال لوگوں ہی کے دل میں رہ گئی ہے کیونکہ ہر طرف مادی سربلندی حاصل کرنے ہی کی دوڑ لگی ہوئی ہے۔ اس لیے جو بچہ، دنیا کے جس حصے میں بھی، شعور کی منزل میں داخل ہوتا ہے، وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہوتا ہے کہ مادی سربلندی ہی وہ شے ہے جسے کے لیے سعی وکوشش کرنی چاہیے۔

اب رہا برے ماحول کا دوسرا مفہوم یعنی وہ خرابیاں جو کسی خاص ملک میں پائی جاتی ہیں، تو ان کے معاملے میں بھی ہم بہت حد تک بے بس ہیں کہ ملک بھی انسان اپنی مرضی سے نہیں چنتا۔ جس ملک میں خدا کی طرف سے پیدا ہوئے ہو گئے۔ اگرچہ ہجرت کی جاسکتی ہے اور قومیت بدلی جاسکتی ہے مگر مشاہدہ بتاتا ہے کہ عملاً ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ بہت کم لوگ ہوتے ہیں جنہیں پرانی قومیت بدل کر کسی نئی قومیت کو اختیار کرنے کے وسائل و ذرائع حاصل ہوں یا جو جذباتی طور پر پرانے مانوس ماحول کو چھوڑ کر نئے نامانوس ماحول میں اپنے آپ کو فٹ کر سکتے ہوں۔ انسانوں کی غالب اکثریت اپنے اپنے علاقوں ہی سے

وابستہ رہتی ہے۔ اچھے ہوں یا برے۔ امیر ہوں یا غریب۔ ترقی یافتہ ہوں یا ترقی پذیر یا بالکل غیر ترقی یافتہ۔ اور پھر جہاں انسان رہتا چلا جاتا ہے، وہاں کی اچھائیاں اور برائیاں دونوں اس پر گہرا اثر ڈالتی رہتی ہیں۔

ماحول کی تیسری قسم یعنی اپنا کنبہ اور رشتے داریوں کا حلقہ تو ظاہر ہے کہ یہ بھی خدا ہی کا دیا ہوتا ہے۔ اس کے معاملے میں بھی انسان کے اپنے اختیار کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ جو خاندان خدا کی طرف سے مل جاتا ہے، اچھا ہو یا برا، اس سے کٹ جانا آسان کام نہیں ہوتا۔ اور پھر اسلام میں صلہ رحمی کی جو تاکید اور قطع رحمی پر جو وعید آئی ہے، اس کے پیشِ نظر رشتہ داروں سے تعلقات توڑنے سے پہلے ہزار مرتبہ سوچنا پڑتا ہے کہ آیا اس قطع تعلق کا شرعاً کوئی جواز ہے بھی یا نہیں۔ مشاہدہ بتاتا ہے کہ مختلف خاندانوں کی بھی اپنی اپنی خاندانی خصوصیات ہوتی ہیں اور وہ اسی طرح پیدا ہوتی ہیں کہ ایک دوسرے کے قریب رہنے والے ایک دوسرے کی عادات و اطوار کو اختیار کر لیتے ہیں۔ بعض خاندان بہ حیثیت خاندان شیخی خور اور خود پسند ہوتے ہیں۔ بعض بہ حیثیت خاندان فضول خرچ اور لاپروا ہوتے ہیں۔ بعض خاندان بہ حیثیت خاندان موٹی عقل کے مالک ہوتے ہیں۔ اگرچہ ہر خاندان میں دوسری قسم کے لوگ بھی پائے جاتے ہیں۔ مگر عموماً افراد خاندان کی اکثریت خاندانی خصوصیات کی حامل ہوتی ہے۔

ہاں ماحول کی چوتھی قسم البتہ ایسی ہے جس میں انسان اپنے اختیار سے کام لے سکتا ہے اور وہ ہے احباب اور ملنے ملانے والوں کا حلقہ۔ یہ حلقہ ظاہر ہے کہ پیدائشی طور پر نہیں ملتا بلکہ انسان اسے خود ہی چنتا ہے اور اگر یہ حلقہ برا ہو اور اس کی اصلاح نہ کی جا سکتی ہو تو اسے کسی بہتر حلقے سے بدلا بھی جا سکتا ہے۔ چنانچہ صالحین نے اس حلقے کو چننے کے بارے میں بہت کچھ نصائح فرمائی ہیں اور تزکیہ نفس کی مہم کے سلسلے میں یہ نصیحتیں بہت مفید

ثابت ہو سکتی ہیں۔ حضرت علیؓ نے برے لوگوں کی دوستی سے پرہیز کرنے کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا ہے:

''نفس پرست کے ساتھ نشست و برخاست ایمان کو فراموش اور شیطان کو حاضر کر دیتی ہے۔''

''اگر کوئی قابل شخص دوستی کے لیے نہ ملے تو نا اہل سے دوستی نہ کر۔''

''کنجوس سے نہ ملو کیونکہ وہ تمہیں تمہاری ضرورتوں سے بھی روک دے گا۔''

''بدکار سے دوستی نہ کرنا، وہ تو معمولی قیمت پر بھی تمہیں بیچ دے گا۔''

''جھوٹے سے میل جول ٹھیک نہیں، وہ تو سراب ہے کہ دور کو قریب اور قریب کو دور کر دے گا۔ اپنے کو بیگانہ اور بیگانے کو اپنا کر دکھائے گا۔''

ایسے ہی سید عبدالقادر جیلانیؒ کا ارشاد ہے:

''تیرے سب سے بڑے دشمن تیرے برے ہم نشین ہیں۔''

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو حجاج کے ظلم کے باعث اس سے بہت نفرت تھی۔ آپؒ کا عہد آنے تک حجاج خود تو فوت ہو چکا تھا، مگر اس کے ملازم اور اس کے قبیلے کے لوگ ابھی موجود تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ ان لوگوں کو کوئی عہدہ نہیں دیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے کسی شخص کو کوئی عہدہ دیا اور بعد میں پتہ چلا کہ وہ شخص حجاج کا عامل رہ چکا ہے۔ آپ نے اس کو عہدے سے موقوف کر دیا۔ اس نے معذرت پیش کی کہ میں نے حجاج کی ماتحتی میں بہت کم مدت کے لیے کام کیا ہے۔ مگر آپ نے اس عذر کو قبول نہ کیا اور فرمایا کہ ''بری صحت ایک دن کی بھی بڑی ہوتی ہے۔''

حضرت معروف کرخیؒ کا مقولہ ہے۔ ''گناہ کرنے والے سے میل جول رکھنا گناہ پر راضی ہونا ہے اور گناہ پر راضی ہونا گناہ کرنے کے برابر ہے۔''

مولانا رومؒ نے ایک حکایت بیان کی ہے کہ ایک دفعہ ایک بادشاہ کا باز شاہی محل سے اڑ کر ایک بڑھیا کی جھونپڑی میں چلا گیا۔ بڑھیا اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور پھر اسے پکڑ کر کہنے لگی کہ ”اے خوبصورت پرندے، تو کس نااہل کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ ہائے اس ظالم نے تیری قدر نہ جانی۔ تیرے ناخن اور پر کس قدر لمبے ہو گئے ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے باز کے پاؤں باندھ کر اس کے پر اور ناخن کاٹ ڈالے (اور اس طرح اپنی طرف سے اس کی قدر دانی کرتے ہوئے اسے بے دست و پا بنا کر رکھ دیا) مولانا روم فرماتے ہیں:

جاہل از با تو نماید ہمدلی
عاقبت زحمت زند از جاہلی

(جاہل اگرچہ تجھ سے دوستی جتائے مگر اپنی جہالت کے باعث بالآخر تجھے تکلیف ہی دے گا)

اتنے میں بادشاہ بھی باز کو ڈھونڈتا ڈھونڈتا آ گیا۔ اس نے باز کا یہ حال دیکھا تو بے اختیار رو دیا اور کہا کہ یہ تیری بے وفائی کی سزا ہے۔

ہر کہ با جاہل بود ہمراز باز
آں رسد با او کہ با آں شہباز

(جو شخص کسی جاہل کی صحبت اختیار کرے گا۔ انجامِ کار اس کا وہی حال ہو گا، جو اس باز کا ہوا)

باقی رہیں برے ماحول کی اول الذکر تین شکلیں یعنی وہ خرابیاں جو عالمگیر ہوتی ہیں یا وہ جو ملک گیر ہوتی ہیں یا وہ جو اپنے خاندان میں پھیلی ہوئی ہوتی ہیں، تو بظاہر تو ان سے بچ جانا ممکن نہیں ہوتا، کیونکہ جیسے کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ ہم ان سے بھاگ کر کہیں جا نہیں سکتے۔ تاہم یہ کہنا بھی غلط ہے کہ ان کا کوئی علاج ہی نہیں کیونکہ اگرچہ ہم نہ دنیا کو چھوڑ

سکتے ہیں نہ اپنے اپنے ممالک کو، نہ اپنے اپنے خاندان کو، مگر یہ تو ہو سکتا ہے کہ ہم اپنے اندر اتنی اخلاقی طاقت پیدا کر لیں کہ ان کے ساتھ رہتے ہوئے بھی ان کے اثرات سے زیادہ سے زیادہ بچے رہیں اور یہ طاقت پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ خرابیِ نفس کے اول الذکر تینوں اسباب کے تدارک کی پوری کوشش کی جائے۔ یعنی اگر ہم غفلت سے بچے رہیں۔ دل میں پیدا ہونے والی حبِ دنیا اور حبِ خواہشات کو اسلام کی مقرر کردہ حدود اعتدال پر رکھیں اور تاریخ انسانی اور زمانۂ حال میں پیش آنے والے واقعات سے عبرت حاصل کرتے رہیں تو انشاء اللہ ہم برے ماحول کے برے اثرات سے بہت حد تک بچے رہیں گے۔

* * *

تزکیہِ نفس
کے لیے
عملی جدوجہد

محاسبۂ نفس

تزکیۂ نفس کی ضرورت اور اہمیت کے پیش نظر یہ امر سخت تعجب انگیز ہے کہ ہم لوگ اس ضروری کام سے کس درجہ غافل ہیں۔ ہم میں غالب اکثریت انہیں لوگوں کی ہے جو کبھی بھی یہ ماننے کو تیار نہیں ہوں گے کہ ان میں بعض میلانات اور عادات ایسی پائی جاتی ہیں جو دینی اور اخلاقی لحاظ سے قابلِ اعتراض ہیں یا وہ ایسی خوبیوں سے تہی دامن ہیں جو دین اور اخلاق کو مطلوب ہیں----- اب اگر ہم میں سرے سے کوئی نقص موجود ہی نہیں تو پھر تزکیۂ نفس کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے بھلا----- اپنے نفس کا تزکیہ تو صرف وہی شخص کر سکتا ہے جس میں اتنی فراخ حوصلگی موجود ہو کہ وہ اپنے مخصوص نقائص کو دیکھ سکے اور اعتراف کر سکے کہ ہاں مجھ میں یہ برائیاں موجود ہیں، اور ساتھ ہی وہ اتنا فلاح پسند بھی ہو کہ اپنے نقائص کو دور کرنے اور ان کی جگہ خوبیاں پیدا کرنے کی تڑپ بھی رکھتا ہو۔ ایسے ہی شخص سے توقع رکھی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو برائیوں سے پاک کرنے کے لیے جدوجہد کرے گا۔ تزکیۂ نفس پر جو کچھ بھی لکھا جاتا ہے، وہ درحقیقت اسی قسم کے انسانوں کے فائدے کے لیے لکھا جاتا ہے۔ ورنہ جسے اپنی برائیاں سرے سے نظر ہی نہ آتی ہوں اسے یہ بتانے کا کیا فائدہ ہے کہ کردار کی کمزوریوں کو یوں اور یوں رفع کیا جا سکتا ہے۔ اس کے کردار میں تو کوئی کمزوری ہے ہی نہیں، تو پھر وہ کاہے کے لیے ایسی باتیں پڑھنے یا سننے پر وقت ضائع کرے، جن کا تعلق، اس کے خیال میں، خود اس سے نہیں بلکہ دوسرے لوگوں سے ہے۔

تزکیہ نفس کون کر سکتا ہے

لہٰذا تزکیۂ نفس کے لیے عملی جدوجہد کا آغاز ہی اس شے سے ہوتا ہے کہ اپنے آپ کا حساب کتاب لیا جائے کہ ہم میں کیا کیا نقائص موجود ہیں اور ہم کن کن خوبیوں سے تہی دامن ہیں۔ یہ کوئی خوشگوار کام نہیں ہے تاہم اگر ہم ایک سچے مسلمان کی ذہنیت پیدا کر لیں تو شاید یہ اتنا ناخوشگوار بھی نہ رہے جتنا ہم اپنی خود پسندی کے باعث اسے سمجھتے ہیں۔

بلاشبہ یہ بڑا مشکل کام ہے کہ اپنے نقائص کا اعتراف کیا جائے' چاہے وہ جی ہی جی میں کیوں نہ ہو۔ مگر آخر یہ مشکل بات ان لوگوں کے لیے آسان ہو ہی گئی تھی جو دل سے اس بات کے خواہشمند تھے کہ انہیں دین اور دنیا دونوں کی کامیابی حاصل ہو۔ صالحین کی زندگیوں میں بے شمار ایسی مثالیں ملتی ہیں جو اس بات کو واضح کر دیتی ہیں کہ وہ لوگ اسی دُھن میں رہتے تھے کہ اپنے نقائص سے زیادہ سے زیادہ واقفیت حاصل کریں تا کہ نفس کو ان سے پاک کر سکیں۔

حضرت عمرؓ کو اپنے نقائص سے واقفیت حاصل کرنے کی اتنی خواہش رہتی تھی کہ ایک دن جب حضرت سلمان فارسیؓ آپؓ کی ملاقات کو آئے تو ان سے کہنے لگے کہ اے سلمانؓ ' میری وہ باتیں جو تمہیں بری معلوم ہوتی ہوں' مجھے سچ سچ بتا دو۔ حضرت سلمانؓ نے کہا کہ مجھے اس سے معاف رکھیے۔ مگر حضرت عمرؓ نے اصرار کیا کہ نہیں ضرور بتاؤ۔ جب آپؓ نے بہت زور دیا تو حضرت سلمانؓ نے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ آپؓ کے دسترخوان پر ایک وقت میں دو قسم کا کھانا ہوتا ہے اور آپ کے پاس دو پیراہن ہیں۔ ایک دن کا اور دوسرا رات کا۔ چونکہ واقعتاً یہ دونوں باتیں درست نہیں تھیں۔ اس لیے حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اے سلمانؓ ' یہ دونوں باتیں تو نہیں ہیں۔ اچھا کچھ اور دیکھا یا سنا ہو' تو وہ بتا دو۔ اس پر حضرت سلمانؓ نے عرض کیا کہ نہیں اور کچھ نہیں۔

حضرت عمرؓ کے ذیل کے مقولے واضح کر دیتے ہیں کہ آپ کو اپنے نقائص معلوم

اصلاح اصلاح لیے ایسا
سچا دوست ہونا چاہیے

کرنے کا کس قدر خیال لگا رہتا تھا۔ فرماتے ہیں:

''جو عیب سے واقف کرے وہ دوست ہے۔''

''خدا اس کا بھلا کرے جو میرے عیب میرے پاس تحفۃً بھیجتا ہے۔''

''مجھے وہ آدمی سب سے زیادہ پسند ہے جو مجھے میرے نقائص بتائے۔''

مولانا اشرف علی تھانویؒ نے مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے بارے میں ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

''سید الطائفہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ نے جب ردِ بدعات پر کچھ رسالے لکھے تو اہلِ بدعت کی طرف سے سب و شتم کی بوچھاڑ ہوئی۔ بعض مشہور اہلِ بدعت کی طرف سے بہت سے رسالے ان کے خلاف سب و شتم سے بھرے ہوئے یکے بعد دیگرے شائع ہوئے تھے۔ حضرت گنگوہی کی بینائی اس وقت تک نہیں رہی تھی۔ مولانا محمد یحییٰ صاحب کاندھلوی، جو حضرت گنگوہیؒ کے خادم خاص اور معتمد تھے، آنے والی ڈاک پڑھ کر سناتے اور پھر جواب لکھنے کی خدمت بھی انہیں کے سپرد تھی۔ ان میں وہ رسالے بھی ہوتے تھے جو ان حضرات کی طرف سے آتے تھے۔ کچھ دن ایسے گزرے کہ مولانا محمد یحییٰ نے ایسا کوئی رسالہ پڑھ کر نہ سنایا تو حضرت گنگوہیؒ نے پوچھا کہ مولوی یحییٰ، کیا ہمارے دوست نے ہمیں یاد کرنا چھوڑ دیا ہے۔ بہت دنوں سے ان کا رسالہ نہیں آیا۔ مولانا محمد یحییٰ نے عرض کیا کہ رسالے تو کئی آتے ہیں مگر وہ مجھ سے پڑھے نہیں جاتے۔ آپ نے اول تو فرمایا کہ ارے میاں، کہیں دور کی گالی بھی لگا کرتی ہے۔ پھر فرمایا کہ وہ ضرور سناؤ۔ ہم تو اس نیت سے سنتے ہیں کہ ان کی کوئی بات قابلِ قبول ہو تو قبول کریں۔ ہماری کسی غلطی پر صحیح تنبیہ کی گئی ہو تو اپنی اصلاح کریں۔ (مجالس حکیم الامت، صفحہ ۳۴)

اگر ایسے عالی مرتبت لوگوں کو بھی اس کی ضرورت تھی کہ اپنے عیوب معلوم کریں،

اور ان کی اصلاح کریں، تو پھر ہم جیسے لوگ کس شمار قطار میں ہیں کہ ہم اپنے آپ کو عیوب سے پاک تصور کر لیں۔

عین ممکن ہے کہ اپنے چاہنے والوں کی ان تمام اچھی آراء کے باوجود جو وہ ہمارے متعلق رکھتے ہیں، ہم درحقیقت حسد کی بیماری میں مبتلا ہوں اور یہ جو ہمیں لوگوں میں بہت سے نقائص نظر آتے رہتے ہیں، اس کی تہہ میں ہماری یہی قبیح عادت کام کر رہی ہو۔

عین ممکن ہے کہ ہم خود پسندی اور غرورِ نفس کے مرض کا شکار ہوں اور یہ جو لوگوں کی ذرا ذرا سی نکتہ چینی ہمیں آپے سے باہر کر دیتی ہے۔ یہ اسی مرض کے باعث ہو۔

اس میں کوئی ناممکن بات نہیں کہ ہمارے دل میں دنیاوی عزت و جاہ حاصل کرنے کی شدید تمنا ہو اور یہ جو بظاہر اللہ کی راہ میں چلتے ہوئے بھی ہمیں یہ خواہش بے چین کیے رہتی ہے کہ ہماری اہمیت کو تسلیم کیا جائے۔ ہماری رائے کو ترجیح دی جائے اور ہماری طرف خصوصی توجہ دی جائے۔ یہ اسی چھپے ہوئے جذبہ حرصِ جاہ کے باعث ہو۔ ورنہ جس کا مقصد واقعی خدا کی خوشنودی ہو، اسے اس بات کی پروا کیوں ہو کہ اسی جیسے کمزور عاجز انسان اس کی بڑائی کو تسلیم کرتے ہیں یا نہیں کرتے ---- شاید کہ ہم نے خدا کی راہ کو چنا ہی اس لیے ہو کہ ہم اہمیت چاہتے تھے اور چونکہ ہمیں وہ ذرائع اور وسائل حاصل نہیں تھے جو ہمیں دنیوی میدان میں اہمیت دلواتے، اس لیے ہم نے دینی میدان کو چن لیا، اس توقع میں کہ شاید یہیں ہمیں وہ اہمیت حاصل ہو جائے جو دنیا پرستوں نے نہیں دی۔

یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ ہم زود رنج، غصیلے، جھگڑالو، شکی مزاج اور بدگمان قسم کے آدمی ہوں اور یہ جو ذرا ذرا سی بات پر ہمارے تعلقات اپنے ہی ساتھیوں سے خراب ہو جاتے ہیں اور جس کا سارا الزام ہم دوسروں کے سر پر ڈال دیتے ہیں۔ یہ درحقیقت ہماری اپنی ان بری عادات ہی کا نتیجہ ہو۔

اس میں قطعی کوئی تعجب انگیز بات نہیں کہ ہم بے سمجھ، بے تدبیر، کوتاہ بین، جلد باز اور جذباتی قسم کے انسان ہوں اور جن معاملات کے بگڑ جانے کا الزام ہم اپنے سوا ہر ایک پر لگاتے رہتے ہیں، وہ درحقیقت ہماری اپنی جلد بازی اور بے تدبیری کے باعث بگڑتے ہوں۔

یہ سب کچھ ممکن ہے اور اس سے بہت زیادہ کچھ بھی ممکن ہے۔ آخر ہم بشر ہیں اور بشر کے ساتھ ایک مستقل شر لگی ہوئی ہے۔ وہی دشمن ازلی، جو ازل سے اس بات کے درپے ہے کہ بشر کو دوزخ کا سزاوار بنا کر چھوڑے۔ لہٰذا ہماری خیر اسی میں ہے کہ اگر اس نے ہمارے نفس کے اندر خرابیاں پیدا کر ہی دی ہیں تو ہم ان خرابیوں کو پہچانیں، ان سے اچھی طرح واقفیت بہم پہنچائیں، جی ہی جی میں ان کا اعتراف کرتے رہیں اور ان کی اصلاح کے لیے جدوجہد میں مصروف رہیں۔ نہ کہ سرے سے ان کے وجود کا انکار کر کے انہیں اور زیادہ پلنے بڑھنے کا موقع بہم پہنچائیں۔ شیطان کے لیے اس سے زیادہ اور کون سی بات خوش کن ہو سکتی ہے کہ نہ ہم اپنی خرابیوں کو معلوم کریں، نہ ان کی اصلاح کر کے شیطان کی کوششوں کو ضائع کریں۔

دنیا میں بہت سے کام ایسے ہیں جنہیں روایتی طور پر بہت مشکل سمجھا جا سکتا ہے مگر وہ درحقیقت مشکل نہیں ہوتے۔ بس سوچنے کا ایک خاص انداز ہوتا ہے جو انہیں مشکل بنا دیتا ہے۔ اگر سوچ کا وہ انداز کسی طرح بدل جائے تو وہی مشکل کام بڑے خوشگوار طریقے سے آسان ہو جاتے ہیں۔

مثال کے طور پر بعض لوگوں کی خود پسندی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ اپنے طرزِ عمل پر کسی کے ذرا سے جائز اعتراض کو بھی وہ اپنی عزتِ نفس پر بہت بڑا حملہ خیال کر لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک عزتِ نفس اور غیرت کا مفہوم یہی ہے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے۔ ہر چھوٹے بڑے معاملے میں فخر و غرور سے کام لیا جائے اور انکسار کے پاس بھی نہ پھٹکا

جائے۔ ایسے لوگوں کو اگر زندگی میں اپنی کسی غلطی پر معافی مانگنا پڑ جائے تو یہ ان کے لیے موت سے کم نہیں ہوتا۔ وہ اپنے بڑے سے بڑے دینی اور دنیوی نقصان کو گوارا کر لیں گے مگر معافی مانگنے کی ذلت کو گوارا نہیں کریں گے‘ کیونکہ اس بات کا اعتراف کرنا کہ ہم نے کوئی غلطی کی ہے اور پھر عاجز بن کر اس غلطی پر اظہار افسوس کرنا ان کے مخصوص طرزِ فکر کے لحاظ سے اتنی بڑی ذلت ہے کہ وہ کسی طرح بھی اپنے آپ کو یہ ذلت سہنے کے لیے آمادہ نہیں کر سکتے۔

اب اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ جن لوگوں کے ذہن میں ان کا اپنا آپ اتنا بڑا نہیں ہوتا۔ جو سمجھتے ہیں کہ ہم غلطیوں سے بالا نہیں ہیں‘ جو جھوٹی آن پر ایمان نہیں رکھتے‘ جو منکسر المزاج ہیں اور جو یقین رکھتے ہیں کہ یہاں معاف کروا لینا‘ وہاں سزا پانے سے بدرجہا بہتر ہے‘ ایسے لوگوں سے جب کوئی خطا ہو جاتی ہے تو وہ بڑے آرام سے معافی مانگ لیتے ہیں۔ نہ انہیں معافی مانگتے ہوئے ذلت کا احساس ہوتا ہے اور نہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ غلطی کا اعتراف کر لینا لوگوں کی نگاہوں میں ہیٹا ہونا ہے۔ نہ صرف یہ کہ معافی مانگ لینے کا خیال ان کے لیے جان لیوا نہیں ہوتا بلکہ انہیں معافی مانگ لینے ہی میں راحت ملتی ہے۔

اب پھر اپنی کسی غلطی کی معافی مانگ لینا فی نفسہٖ تو کوئی محال کام نہ ہوا۔ یہ تو ایک خاص قسم کی طرزِ فکر ہے جو اسے محال بناتی ہے۔ اگر وہ طرزِ فکر بدل جائے تو معافی مانگ لینا خود بخود ہی آسان ہو جائے گا۔

کوئی غریب یا کم رتبہ آدمی اگر کسی امیر یا بڑے رتبے والے آدمی کے آگے گستاخانہ زبان چلائے تو اگر وہ بڑا آدمی حلم سے خالی ہوگا تو اس گستاخی پر اس کے غیظ و غضب کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہے گا۔ مطلق العنان بادشاہوں کی زندگیوں میں ایسی بے شمار مثالیں ملتی ہیں کہ ذرا ذرا سی بات پر خدمت گاروں اور درباریوں کے قتل کے احکام صادر کر دیے اس کے برعکس جن حکمرانوں کا خیال یہ تھا کہ اختیارات حاصل ہوتے ہوئے بھی حلم و

عفو سے کام لینا حکمران کی ایک بہت بڑی خوبی ہے۔ وہ بعض اوقات اپنے معمولی معمولی ملازموں کی بڑی بڑی غیر معمولی گستاخیاں کمال خندہ پیشانی سے نظر انداز کر دیتے تھے۔ بنوعباس کا ساتواں خلیفہ مامون اپنے بعض عقائد کے باعث راسخ العقیدہ مسلمانوں کو ناپسند تھا۔ اس کے علاوہ اس نے امام احمد بن حنبلؒ کے ساتھ کچھ ایسا سلوک روا رکھا، جسے ظلم و زیادتی سمجھا گیا۔ تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ زندگی کے عام معاملات میں وہ بڑا حلیم تھا۔ اپنے خادموں کے معاملے میں بھی اس کا رویہ اتنا مہربانانہ تھا کہ اس کے حلم وعفو کے واقعات پڑھ کر تعجب ہوتا ہے۔ ایک دن جب اس نے اپنے کسی غلام کو ''یا غلام'' کہہ کر پکارا، تو وہ غلام سخت برافروختہ ہوا اور پاس آکر چیخنے لگا کہ یہ آپ کیا ہر وقت ''یا غلام'' ''یا غلام'' کی رٹ لگائے رہتے ہیں۔ آخر اس ''یا غلام'' ''یا غلام'' کی کوئی حد بھی ہے---- غلام کی اس گستاخی کے جواب میں مامون بالکل خاموش رہا اور بولا تو صرف یہ بولا کہ خوش مزاجی بھی ایک عیب ہے کہ اس سے خادم گستاخ ہو جاتے ہیں!۔

باپ کی وفات کے بعد جب سلطنت امین اور مامون کے پاس آئی تو دونوں بھائیوں میں جنگ چھڑ گئی۔ اس جنگ کے دوران امین ہلاک ہو گیا اور ساری سلطنت مامون کے قبضے میں آگئی۔ ایک دفعہ مامون دریائے دجلہ کے کنارے بیٹھا تھا، سامنے قنات کھنچی ہوئی تھی کہ ایک کسان سامنے سے گزرا اور بلند آواز سے کہنے لگا کہ مامون اپنے بھائی کو قتل کر کے ہم لوگوں کی نگاہوں میں کبھی معزز نہیں ہو سکتا۔ مامون نے یہ بات سن کر کچھ خفگی کا اظہار نہ کیا، صرف مسکرا دیا اور حاضرین کو مخاطب کر کے بولا کہ کیا تم لوگ کوئی ایسی ترکیب بتا سکتے ہو جس سے میں اس جلیل القدر آدمی کی نگاہ میں معزز بن سکوں۔

اپنے سامنے گستاخیاں کرنے والوں اور اپنے مخالفین کو معاف کر دینے میں اسے اتنا مزہ ملتا کہ وہ خود کہا کرتا تھا کہ ''مجھے عفو میں اتنی لذت ملتی ہے کہ اس پر ثواب ملنے کی امید

نہیں ۔ اگر لوگوں کو میرے عفو کا اندازہ ہو جائے تو جرائم کر کر کے میرے مقرب بنیں ۔ ’’

ایک خط میں اس نے لکھا کہ ’’شریف کی پہچان یہ ہے کہ اپنے سے اونچے کو دبائے اور زیر دست سے خود دب جائے ۔‘‘

اب اس صورتِ حالات سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اپنے سے کم رتبہ والے آدمی کی گستاخیوں پر درگذر کر جانا فی نفسہٖ کوئی محال کام نہیں ہے ۔ بس ایک خاص قسم کی سوچ اسے محال بناتی ہے ۔ جن لوگوں کی سوچ اس کے برعکس ہو وہ نہایت آسانی سے درگذر کر لیتے ہیں ۔

اگرچہ یہ کام بھی بے انتہا مشکل سمجھا جاتا ہے کہ انسان اپنی کسی برائی کا اقرار کر لے ۔ لیکن اگر انسان اپنی طرز فکر ایسی بنالے کہ اسے لوگوں کی اچھی رائے سے بڑھ کر اپنا اچھا انجام محبوب ہو جائے تو پھر وہ اپنی برائیوں پر پردے ڈالنے اور انہیں اپنے آپ سے بھی چھپانے کے بجائے اس بات کا خواہش مند ہو جائے گا کہ اسے اس کی برائیاں معلوم ہوں تاکہ وہ ان کی اصلاح کر کے زیادہ سے زیادہ خوش انجامی حاصل کر سکے ۔ جیسے کہ خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروقؓ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی مثالیں اوپر بیان ہو چکی ہیں ۔

قصۂ کوتاہ تزکیۂ نفس کا اولین قدم یہ معلوم کرنا ہے کہ ہمارے نفس میں کیا کیا خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں اور وہ کن کن خوبیوں سے تہی دامن ہے ۔ محاسبہ کا مطلب ہے حساب لینا ۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہم وقتاً فوقتاً اپنے نفس کا محاسبہ کرتے رہیں ۔ کہ اس نے کہاں تک خرابیوں سے کنارہ کشی کی ہے اور کس حد تک خوبیوں کو اپنایا ہے ۔

حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن آدمؑ کے بیٹے کے پاؤں اس وقت تک سرک نہیں سکیں گے جب تک اس سے پانچ چیزوں کے بارے میں سوال نہیں کر لیا جائے گا ۔

۱۔ اس کی عمر کے بارے میں کہ اس نے اسے کن کاموں میں صرف کیا'

۲۔ اس کی جوانی کے بارے میں کہ اس نے اسے کن مشاغل میں پرانا کیا'

۳۔۴۔ اس کے مال کے بارے میں کہ اس نے اسے کن طریقوں سے حاصل کیا اور کن مصارف پر صرف کیا۔

۵۔ اور اس بات کے بارے میں کہ جو علم اس نے حاصل کیا' اس پر کہاں تک عمل کیا۔ (ترمذی)

قبل اس کے کہ وہ نہ ٹلنے والا دن آجائے' جب ہم سے ان پانچ چیزوں کے بارے میں حساب لیا جائے' ضروری ہے کہ موجودہ زندگی میں ہم خود' ہر روز' اپنے آپ سے ان کے بارے میں حساب لیتے رہیں۔ اسی کا نام ہے محاسبہ نفس' اور خدا ترس ہستیوں نے اس محاسبہ نفس کے بارے میں بہت کچھ نصیحتیں کی ہوئی ہیں۔

حضرت شدادؓ بن اوس سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دانا وہ ہے جو اپنے نفس کا محاسبہ کرے' اور موت کے بعد کے لیے عمل کرے اور عاجز وہ ہے جو اپنے نفس کو خواہشوں کے پیچھے لگائے اور اللہ سے امیدیں باندھے............ حضرت عمرؓ بن خطاب کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ اپنے نفسوں کا حساب لو قبل اس کے کہ تم سے حساب لیا جائے...... (نیز فرمایا کہ) قیامت کے دن حساب اسی پر آسان ہوگا جو دنیا میں اپنے نفس کا حساب لیتا رہے گا----- میمون بن مہران کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے کہا کہ بندہ اس وقت تک پرہیز گار نہیں ہوسکتا جب تک اپنے نفس کا اس طرح حساب نہ لے جس طرح اپنے شریک کا لیتا ہے کہ اس نے کھانا کہاں سے لیا اور لباس کہاں سے حاصل کیا۔ (ترمذی)

حضرت علیؓ فرماتے ہیں: ''جس نے اپنے نفس کا جائزہ لیا' وہ نفع میں رہا۔ جس

نے غفلت کی وہ گھاٹے میں رہا اور جو خدا سے ڈرا، وہ بے خوف ہو گیا۔"

جناب حسن البناء شہیدؒ اپنے ساتھیوں کو ہدایات دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"توبہ و استغفار کرتے رہیے۔ بڑے بڑے گناہ تو ایک طرف چھوٹی غلطیوں سے بھی بچیئے۔ سونے سے پہلے کچھ وقت ایسا رکھیے جس میں آپ اپنے نفس کا محاسبہ کر سکیں کہ آپ میں کون کون سی برائیاں اور کون کون سی اچھائیاں ہیں۔ وقت کی حفاظت کیجئے۔ کیونکہ اصل زندگی تو وقت ہی ہے۔ ایک لمحہ بھی بے کار نہ گزاریے اور شبہے والی چیزوں سے بچیئے تاکہ آپ حرام کے مرتکب نہ ہونے پائیں۔"

سونے سے پہلے اپنے نفس کا محاسبہ کرنا ایک ایسا عمل ہے جس کے اصل فوائد کا تبھی پتہ چلتا ہے جب انسان روزانہ بلاناغہ یہ کام کرتا رہے۔ اپنے آپ کا حساب لینے کے لیے پانچ اہم سوال تو وہی ہیں جو اوپر حضرت ابن مسعودؓ کی روایت میں درج ہیں یعنی یہ کہ:

☆ عمر کن کاموں میں صرف ہو رہی ہے،

☆ جوانی کن اشغال میں ختم ہو رہی ہے یا ہو گئی ہے،

☆ مال کن طریقوں سے کمایا جا رہا ہے،

☆ مال کن راہوں پر صرف کیا جا رہا ہے اور

باقی اپنے مخصوص حالات اور میلانات و عادات کی روشنی میں مزید سوالات بھی مرتب کیے جا سکتے ہیں۔

مثلاً اگر معلوم ہو چکا ہے کہ طبیعت میں غصہ حدِ اعتدال سے بہت زیادہ ہے تو پھر اپنے آپ سے سوال کریں کہ آج دن بھر اس غصے پر کہاں تک قابو رکھا جا سکا ہے اور کتنی بار دوسروں کی حقیقی یا وہمی تلخ کلامی کے جواب میں صبر سے خاموشی اختیار کی گئی ہے۔

اگر آپ جان چکے ہیں کہ مزاج میں اپنے آپ کو بڑا سمجھنے کی بیماری زور پکڑ چکی

ہے تو پھر غور کریں کہ آج کہاں تک اس حقیقت کو ذہن نشین کیا جاسکا ہے کہ بڑائی صرف وہ ہے جو خدا کی نظروں میں ہو اور یہ کہ انسانوں کی نگاہوں میں بڑا بننے کی خواہش اس خطرے میں مبتلا کر دیتی ہے کہ انسان خدا کی نگاہوں میں ذلیل ہو جائے اور یہ بھی دیکھیں کہ آج کہاں تک اپنے دل کو یقین دلایا جاسکا ہے کہ جو امن و عافیت گمنام رہنے میں ہے۔ وہ مشہور و معروف ہونے میں نہیں ہے۔

اگر پتہ چل چکا ہے کہ زبان بے قابو ہے اور موقع بے موقع پڑ پڑ بولے چلی جاتی ہے تو پھر غور کریں کہ دن بھر میں کتنے مواقع ایسے آئے ہیں جب آپ نے اس فتنے کو لگام دے کر روک لیا ہے اور اسے کسی طعن و تشنیع کی، کسی چغلی اور غیبت کی، کسی بہتان طرازی کی، کسی افترا پردازی کی اور کسی بے تحقیق بات کو آگے چلانے کی اجازت نہیں دی۔

محاسبۂ نفس کے سلسلے میں ایک ضروری بات، جو پیش نظر رہنی چاہیے، یہ ہے کہ شروع شروع میں جب انسان یہ عمل شروع کرتا ہے تو کافی مدت تک اسے روز مایوسی سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ روزانہ اپنا محاسبہ کرتے ہوئے اسے یہی احساس ہوتا ہے کہ وہ تو اپنی ذرا سی بھی اصلاح نہیں کرسکا۔ مگر اس سے دل شکستہ ہو جانے کے بجائے محاسبۂ نفس کے اس عمل کو صبر سے جاری رکھنا چاہیے اور اس میں ناغہ نہیں آنے دینا چاہیے۔ بیشک روز آپ جتنے سوالات اپنے آپ سے کریں۔ سب کے جواب میں آپ کو اپنا آپ یہی بتائے کہ تم تو ابھی وہیں ہو جہاں سے تم نے آغاز کیا تھا۔ پھر بھی ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔ بس اپنا محاسبہ جاری رکھنا چاہیے۔ انشاء اللہ توقع سے بہت جلد وہ وقت آجائے گا، جب ان سوالات کے حوصلہ افزا جوابات ملنے شروع ہو جائیں گے اور تزکیۂ نفس کے سلسلے میں یہ عمل ایک بڑا موثر قدم ثابت ہوگا۔ جب انسان بار بار اپنا جائزہ لیتا ہے کہ ہم نے یہ کام کیا ہے یا نہیں کیا، تو پھر غیر ارادی طور پر اس کام کو کرنے کی قوت پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہے اور بار بار اپنے سوالوں کے

جواب میں نہیں نہیں سن کر جو شرمندگی ہوتی ہے وہ ہاں، ہاں کہہ سکنے کی راہ کو صاف کرتی ہے۔

جناب بناءؒ نے یہ جو فرمایا ہے کہ بڑے بڑے گناہ تو ایک طرف، چھوٹی چھوٹی غلطیوں سے بھی بچیے، تو اس سلسلے میں بھی چند باتیں ذہن نشین کر لینی چاہئیں گناہوں کو دو حصوں میں بانٹا گیا ہے۔ کبیرہ گناہ اور صغیرہ گناہ یعنی بڑے بڑے گناہ اور چھوٹی چھوٹی خطائیں۔ اب جہاں تک اللہ کی نافرمانی کا تعلق ہے، کبیرہ ہوں یا صغیرہ، نافرمانی تو دونوں ہی میں پائی جاتی ہے۔ اس لیے صغیرہ سے یہ مراد نہیں کہ ان گناہوں کو کرنے سے کوئی حرج واقع نہیں ہوتا۔ حرج تو ان صغیرہ گناہوں کا ارتکاب کرنے سے بھی ہوتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ حرج اتنا شدید نہیں ہوتا، جتنا کبیرہ گناہوں کا۔ مثلاً آپ کسی بے گناہ شخص کو تھپڑ ماردیں یا کسی بے گناہ شخص کو قتل کر دیں۔ گناہ تو دونوں صورتوں میں ہوگا۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ دونوں گناہ ایک درجے کے نہیں ہوں گے۔ کسی بے گناہ کے تھپڑ کھا لینے سے معاشرے میں وہ غم واندوہ اور وہ تباہ کن اثرات پیدا نہیں ہوں گے جو کسی بے گناہ کے مقتول ہو جانے سے ہوں گے۔

تاہم اس حقیقت کے باوجود کہ چھوٹے چھوٹے گناہ اتنے مہلک نہیں ہوتے جتنے بڑے بڑے گناہ۔ چھوٹے چھوٹے گناہوں سے بھی بچے رہنے کی تاکید اس لیے کی جاتی ہے کہ اول تو گناہ چھوٹے ہوں یا بڑے، ہیں تو گناہ ہی۔ دوسرے اس لیے کہ چھوٹے گناہوں میں بے پروائی سے مبتلا رہنے کے باعث جھجک دور ہوتی جاتی ہے اور پھر انسان بڑے بڑے گناہوں کو بھی اختیار کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اگر انسان صغائر یعنی چھوٹے گناہوں ہی سے محتاط رہے گا تو پھر توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ کبائر یعنی بڑے بڑے گناہوں سے تو اور بھی زیادہ دور رہنے کی کوشش کرے گا۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں:

''جس گناہ کو صغیرہ یعنی چھوٹا گناہ کہا جاتا ہے وہ بڑے گناہ کے مقابلے میں چھوٹا ہے۔ ورنہ ہر گناہ اس حیثیت سے کہ اس میں اللہ اور رسول ؐ کی نافرمانی ہے' بڑا گناہ ہی ہے۔ جیسے پھونس کے چھپر میں بڑا انگارہ اس کے لیے مہلک ہے۔ اسی طرح چھوٹی سی چنگاری کا بھی وہی انجام ہے کہ وہ بھی جب بھڑک اٹھتی ہے تو انگارہ بن جاتی ہے۔ اسی لیے گناہوں میں صغیرہ اور کبیرہ کی تقسیم باہمی اضافت و نسبت کے اعتبار سے ہے۔ صغیرہ گناہوں کو بھی بے پروائی سے کرنا اپنی ہلاکت کو دعوت دینا ہے۔''

علامہ ابن نجیم نے اپنے ایک رسالے میں صغائر اور کبائر کی فہرست دی ہے۔ یہاں وہ ساری تو نقل نہیں کی جا سکتی۔ ہاں کبیرہ گناہوں اور صغیرہ گناہوں میں سے کچھ نمایاں گناہوں کی لسٹ پیش کر دی جاتی ہے۔

کبیرہ گناہ

☆ شرک

☆ بدکاری۔

☆ لواطت۔

☆ شراب یا کوئی اور نشہ پیدا کرنے والی شے پینا یا کھانا۔

☆ چوری کرنا۔

☆ پاکدامن عورتوں پر بدکاری کا الزام لگانا۔

☆ ناحق کسی کو قتل کرنا۔

☆ گواہی کو چھپانا' جب کہ اس کے سوا اور کوئی گواہ نہ ہو۔

☆ جھوٹی گواہی دینا۔

☆ جھوٹی قسم کھانا۔

☆ کسی کا مال غصب کرنا۔

☆ مقابلے کی قدرت رکھتے ہوئے میدان جہاد سے بھاگنا۔

☆ سود کھانا۔

☆ یتیم کا مال کھانا۔

☆ رشوت لینا۔

☆ رشتے داروں سے تعلقات توڑنا یا ان سے بدسلوکی کرنا۔

☆ حضورؐ کی طرف جھوٹی باتیں منسوب کرنا۔

☆ رمضان میں بلا عذر روزہ توڑ دینا۔

☆ ناپ تول میں کمی کرنا۔

☆ کسی فرض نماز کو اپنے وقت سے مقدم یا مؤخر کرنا۔

☆ بغیر کسی عذر کے زکوٰۃ یا روزہ کو اپنے وقت پر ادا نہ کرنا۔

☆ استطاعت رکھتے ہوئے فرض حج ادا کیے بغیر مر جانا سوائے اس کے کہ حج کی

☆ وصیت کر جائے اور اس کا انتظام چھوڑ جائے۔

☆ کسی مسلمان کو ظلماً نقصان پہنچانا۔

☆ جادو سیکھنا اور سکھانا اور اس پر عمل کرنا۔

☆ مضطر ہوئے بغیر مردار جانور کا گوشت کھانا۔

☆ غیبت کرنا۔

☆ جوا کھیلنا۔

☆ خودکشی کرنا یا اپنے کسی عضو کو خود تلف کر دینا۔

☆ کسی کو گناہ پر آمادہ کرنا یا کسی کو گناہ کرنے میں امداد دینا۔

☆ کسی حاکم کا حق سے عدول کرنا۔

☆ زمین میں فساد پھیلانا۔ وغیرہ وغیرہ۔

صغیرہ گناہ

☆ کسی انسان یا جانور پر لعنت کرنا۔

☆ کسی مسلمان کی ہجو کرنا۔

☆ کسی مسلمان سے بلا عذر تین دن سے زیادہ روٹھے رہنا۔

☆ مرد کو ریشمی لباس پہننا۔

☆ اکڑ کر اور اترا کر چلنا۔

☆ کسی فاسق کے پاس اٹھنا بیٹھنا۔

☆ مکروہ اوقات میں نماز پڑھنا یعنی طلوع و غروب اور نصف النہار کے وقت۔

☆ عورت کا بغیر محرم کے سفر کرنا بہ مجبوری ہجرت کرنا پڑے تو وہ اس سے مستثنٰی ہے۔

☆ سودا بیچتے وقت اس کے عیب کو چھپانا۔

☆ شراب کو اپنے گھر میں رکھنا۔

☆ شوقیہ کتا پالنا۔

☆ جمعے کی اذان کے بعد خرید و فروخت کرنا۔

☆ کسی کے سودے پر سودا کرنا۔

☆ کسی کی منگنی پر منگنی کا پیغام دینا۔

☆ نماز میں دائیں بائیں یا آسمان کی طرف دیکھنا۔

☆ مسجد میں دنیا کی باتیں کرنا۔

☆ زکوٰۃ ردی مال سے ادا کرنا۔

☆ بیوی کو ایک وقت میں ایک سے زیادہ طلاقیں دے دینا۔

☆ قاضی کا مدعی اور مدعا علیہ کے ساتھ یکساں سلوک نہ کرنا۔

☆ سونے چاندی کے برتن استعمال کرنا۔

☆ کسی مخالفِ اسلام قوت کے ہاتھ ہتھیار فروخت کرنا۔

☆ لوگوں کا راستہ تنگ کر کے کھڑا ہونا یا راستے میں بیٹھ جانا۔

☆ اذان کی آواز سن کر گھر میں بیٹھ کر اقامت کا انتظار کرنا۔

☆ اپنی اولاد کو چیز دینے میں برابری نہ کرنا۔

☆ غیر کی زمین میں بغیر اس کی اجازت کے چلنا۔

☆ غصب کی ہوئی زمین سے کھانا۔

☆ غصب کی ہوئی زمین میں داخل ہونا۔

☆ کسی جانور کا مثلہ کرنا یعنی ناک کان وغیرہ کاٹنا۔

☆ نماز میں کپڑے یا بدن کے ساتھ کھیل کرنا۔ وغیرہ وغیرہ۔

☆ جیسے کہ بیان کیا جا چکا ہے۔ صغیرہ سے یہ ہرگز مراد نہیں کہ ان کے بارے میں لاپروائی اختیار کی جائے۔ کیونکہ یہ لاپروائی کبائر کا ارتکاب کرنے کے خطرے میں مبتلا کر دیتی ہے۔

امام غزالیؒ صغیرہ گناہوں کی مضرت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”یوں تو گناہوں سے توبہ کرنا ضروری ہے‘ مگر کبیرہ گناہوں سے توبہ کرنا تو نہایت ہی ضروری ہے اور یہ معلوم ہو چکا ہے کہ صغیرہ گناہ بھی اصرار کرنے سے کبیرہ ہو جاتا ہے۔ بلکہ صغیرہ گناہ جب بار بار کیا جاتا ہے تو ایک مرتبہ کوئی کبیرہ گناہ کر لینے کی بہ نسبت قلب کو زیادہ سیاہ کر دیتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی سخت پتھر پر ایک ایک قطرے کا

متواتر ٹپکنا اور ایک بارگی موسلا دھار بارش کا برس جانا۔ یہ ظاہر ہے کہ قطرہ باوجودیکہ حقیر اور بہت ہی بے وقعت چیز ہے، مگر بار بار پڑنے کی وجہ سے ایک نہ ایک دن پتھر میں بھی سوراخ کر دیتا ہے، برخلاف موسلا دھار مینہ کے کہ اگرچہ وہ کئی لاکھ قطروں کا مجموعہ ہے مگر یکبارگی برسنے سے اس کا وہ اثر نہ ہوگا جو ایک قطرے نے آہستہ آہستہ کر دکھایا تھا۔ اسی طرح چھوٹا گناہ آہستہ آہستہ دل پر جو اثر کرتا ہے وہ کبیرہ گناہ کے یکبارگی اثر کی بہ نسبت بہت زیادہ اندیشہ ناک ہوتا ہے اور اس کی کئی وجوہ ہیں۔

اول یہ کہ صغیرہ گناہ کی ذہن میں وقعت نہیں ہوتی اور اس کو معمولی گناہ سمجھ کر بے پروائی کی جاتی ہے برخلاف کبیرہ گناہ کے کہ اس کی بڑائی کے سبب امید ہے کہ اس سے بچنے اور باز آجانے کی طرف توجہ ہو جائے......

دوسرا سبب یہ ہے کہ صغیرہ گناہ کو بسا اوقات انسان نعمت سمجھتا ہے اور خوش ہوتا ہے۔ چنانچہ لوگوں کو کہتے سنا گیا ہے کہ:

دیکھا میں نے اس کو کیونکر جواب دیا،
دیکھا میں نے اس سے کیسا بدلہ لیا،
دیکھا میں نے کیسے اس کی آبرو خاک میں ملا دی،
دیکھا میں نے اسے کیسے دھوکہ دیا۔

اور ظاہر ہے کہ گناہ پر خوش ہونا زیادہ مضرت رساں اور قلب کو زیادہ سیاہ کرنے والا ہوتا ہے۔

تیسرا سبب یہ ہے کہ صغیرہ گناہ کا ارتکاب کرنے والا اکثر حق تعالیٰ کی پردہ پوشی کو اپنی کرامت اور بزرگی سمجھنے لگتا ہے یعنی خیال کرتا ہے کہ میں خدا کے نزدیک مرتبے والا شخص ہوں کہ میرے گناہ ظاہر نہیں ہوئے، اور یہ خبر نہیں کہ خدا کی طرف سے ڈھیل دی جا

رہی ہے تاکہ گناہ زیادہ ہو جائیں اور یک لخت دھر پکڑا جائے اور اسفل السافلین میں جھونک دیا جائے۔

(4) چوتھا سبب یہ ہے کہ صغیرہ گناہ کا ارتکاب کرنے والا اس کے صغیرہ ہونے کی بناء پر اسے لوگوں میں ظاہر اور شائع کرتا پھرتا رہتا ہے۔ حالانکہ حدیث میں آیا ہے کہ تمام گناہ بخش دیے جائیں گے مگر گناہوں کا اعلان اور افشاء کرنے والے لوگ نہیں بخشے جائیں گے۔

5 پانچویں، اگر کسی عالم، صوفی سے یعنی کسی ایسے انسان سے، جس کی لوگ پیروی کرتے ہیں، کوئی صغیرہ گناہ سرزد ہوتا ہے تو اس کا اثر اور بھی زیادہ برا پڑتا ہے۔ کیونکہ عام لوگ اسے دیکھ کر اس گناہ میں بے باکانہ مبتلا ہو جاتے ہیں اور اس طرح گناہ کا ایک سلسلہ قائم ہو جاتا ہے۔ گویا یہ صغیرہ گناہ اتنا دراز ہو جاتا ہے کہ اس کے مرنے کے بعد بھی باقی رہتا ہے۔ اس کی دیکھا دیکھی جن لوگوں نے بھی اس گناہ کو اختیار کیا ہو، سب کا وبال اس کے نامۂ اعمال میں درج ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ باقی رہنے والا گناہ ختم ہو جانے والے گناہ سے بدتر ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس گناہ کی بقا اس کے صغیرہ ہونے کی وجہ ہی سے ہوئی ہے۔ پس خوش قسمت ہے وہ شخص جو اپنے مرنے کے وقت اپنے گناہ بھی دنیا سے لے جائے۔''

(تبلیغ دین از امام غزالیؒ)

جہاں تک جناب بناءؒ کی اس نصیحت کا تعلق ہے کہ:

''شبہے والی چیزوں سے بچیے تاکہ آپ حرام کے مرتکب نہ ہونے پائیں۔''

خود حضورؐ ہی کی ایک حدیث اس کی اچھی طرح وضاحت فرما دیتی ہے:

حضرت نعمانؓ بن بشیر بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے اور ان دونوں کے درمیان کچھ شبہے والی چیزیں ہیں، جنہیں بہت سے لوگ نہیں جانتے۔ پس جس نے ان شبہے والی چیزوں سے

پرہیز کی، اس نے اپنے دین اور اپنی آبرو کو بچالیا۔ اور جو کوئی ان شبہے والی چیزوں میں پڑ گیا، وہ حرام میں پڑ گیا۔ اس کی مثال اس چرواہے جیسی ہے، جو (اپنے جانور کو) شاہی چراگاہ کے اردگرد چراتا ہے۔ قریب ہے کہ وہ (جانور) اس (شاہی چراگاہ) کے اندر چرنے لگے۔ آگاہ رہو ہر بادشاہ کی ایک مخصوص چراگاہ ہوتی ہے (جس میں دوسرے لوگ اپنے جانور نہیں چرا سکتے) آگاہ رہو کہ اللہ کی مخصوص چراگاہ وہ کام ہیں جنہیں اس نے حرام قرار دے دیا ہے......" (بخاری و مسلم)

امام محمدؒ بن سیرین تابعی فرماتے تھے کہ پرہیز گاری نہایت آسان شے ہے۔ آپ سے پوچھا گیا کہ وہ کیسے۔ آپ نے فرمایا کہ جس چیز میں شک معلوم ہو اسے چھوڑ دو۔

مطرف بن عبداللہ تابعیؒ کے پاس چند خارجی آئے اور انہیں دعوت دی کہ ہمارے عقائد قبول کر لیجئے۔ اس پر آپ نے جواب دیا کہ اگر میرے دو نفس ہوتے تو ایک نفس سے تمہارے عقائد مان لیتا اور دوسرے کو محفوظ رکھتا۔ جو کچھ تم کہتے ہو اگر وہی ہدایت ہوتا تو دوسرے نفس سے بھی تمہاری پیروی کر لیتا اور اگر وہ گمراہی ہوتا تو اگر ایک نفس ہلاک ہو جاتا تو کم از کم دوسرا تو محفوظ رہتا۔ لیکن نفس تو ایک ہی ہے۔ اس لیے اس کو میں دھوکے کی جگہ نہیں لگا سکتا۔ (طبقات ابن سعد)

واضح رہے کہ انسان بالکل ہی شیطان نہ بن جائے، ورنہ برے اعمال دل کو بے چین تو کیے رہتے ہیں اور انسان حتی الامکان انہیں لوگوں سے چھپائے رکھنے کا خواہشمند رہتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی گناہ کی یہی تعریف فرمائی ہے۔

حضرت نواسؓ بن سمعان بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے حضورؐ سے نیکی اور گناہ کے بارے میں دریافت کیا، تو آپؐ نے فرمایا کہ "نیکی اچھے خلق کا نام ہے اور گناہ وہ ہے جو تیرے دل میں کھٹک پیدا کرے اور تو اس بات کو ناپسند کرے کہ لوگوں کو اس کا علم ہو۔"

(ترمذی)

یاایھا الناس کلوا حلالًا طیبًا

جن اعمال کو خدا نے ''گناہ'' کا نام دیا ہے، وہ کھلے ہوں یا چھپے، ہر حال میں حرام ہیں اور ہر فلاح پسند انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنے نفس کا محاسبہ کرتا رہے کہ کہیں وہ ان محرمات کا عادی تو نہیں ہوتا جارہا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بری عادات کو دور کرنا بڑا کٹھن کام ہے۔ نفس کو جب گناہ کی چاٹ لگ جاتی ہے تو اسے آسانی سے روکا نہیں جاسکتا۔ مگر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ لوگوں سے اپنی خرابیوں کو چھپانے اور ان کے سامنے اپنے آپ کو خوبیوں والے ظاہر کرنے کے لیے ایسے ایسے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں اور ایسی ایسی ذہنی اور قلبی اذیتیں سہنی پڑتی ہیں کہ اس کے مقابلے میں گناہ کا چھوڑ دینا آسان ہوتا ہے۔ روز اپنا حساب کتاب لیتے رہنے سے نفس میں اصلاح کی طرف میلان بڑھتا جاتا ہے اور جب انسان کے اپنے دل میں اصلاح کی تڑپ پیدا ہو جائے تو یہ راہ آسان سے آسان تر ہوتی جاتی ہے۔

اس کے برعکس اگر اپنے دل ہی میں یہ خواہش نہ ہوگی تو سمجھانے بجھانے والوں کی کوششوں کے باوجود کسی خیر کی توقع نہیں۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں:

''جو خود اپنی اصلاح نہ چاہے پیغمبر بھی اس کی اصلاح نہیں کر سکتے۔''

اپنے دل میں اصلاح کی خواہش نہ ہو تو باہر سے قانون کا ڈنڈا اور معاشرتی دباؤ بھی بہت حد تک بے جان اور غیر مؤثر ہو جاتے ہیں۔ اگر ہم خود برائیوں سے بچنا نہیں چاہتے اور صرف قانون کا خوف اور لوگوں کی انگشت نمائیاں ہی ہمیں روک رہی ہیں تو پھر یہ رکنا کوئی پائیدار حیثیت حاصل نہیں کر سکے گا۔ کیونکہ زندگی میں ہزار مقامات ایسے آئیں گے جب بغیر قانون کی زد میں آئے اور بغیر معاشرے میں رسوا ہوئے ہم ہزار گناہ کر سکیں گے۔ اس وقت پھر کون سی شے ہمیں گناہوں سے بچا سکے گی۔

ایک شخص رات گئے اپنے گھر کے دروازے اچھی طرح بند کر کے کسی اندرونی

کونے میں بیٹھ کر شراب پی رہا ہے۔ وہاں قانون نے کیا کر لینا ہے اور معاشرے کو کیسے پتہ چلے گا کہ بند دروازوں کے اندر کیا ہو رہا ہے۔

بعض منصف اتنے ہوشیار واقع ہوتے ہیں کہ اگر ان کے سامنے بیس مقدمے پیش ہوئے ہیں تو ان میں اٹھارہ کے فیصلے وہ ٹھیک ٹھیک انصاف کے مطابق کر دیں گے اور بقیہ دو میں رشوت لے لیں گے۔ اب باوجود اس حقیقت کے کہ انہوں نے بددیانتی کا ارتکاب کیا ہے، معاشرہ ان کی تعریفیں کرتا نہیں تھکتا، کیونکہ وہ اٹھارہ مقدمات جن کے فیصلے انصاف کے مطابق ہوئے ہیں، اسے اتنی نیک نامی حاصل کر دیتے ہیں کہ جن دو مقدمات میں اس نے بددیانتی کی ہوتی ہے، عموماً ان کا پتہ بھی نہیں چلنے پاتا، اور جو شخص معاشرے میں نیک نام ہو، قانون بھی اس کے خلاف کم ہی حرکت میں آتا ہے۔

غرض کہ قانون اور معاشرتی دباؤ کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے، مگر جب تک دل کے اندر خداترسی اور شوقِ اصلاح نہ ہو، قانون اور معاشرتی دباؤ پوری پوری اصلاح کرنے سے قاصر رہتے ہیں اور اپنے نفس کا حساب کتاب لیتے رہنے سے خداترسی اور شوقِ اصلاح دونوں تیز ہوتے جاتے ہیں۔

محاسبۂ نفس کوئی بڑا مشکل کام نہیں ہے کہ انسان کو اس پر زیادہ وقت یا مال یا جسمانی قوت صرف کرنی پڑے۔ مگر اس کے اثرات حیرت انگیز ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس اپنے اعمال کے بارے میں لاپروا رہنا انسان کو غافل سے غافل تر بناتا چلا جاتا ہے۔ جس نے زندگی اس طرح گزار دی کہ کبھی شعوری طور پر سوچا ہی نہیں کہ ٹھیک کام کر رہا ہوں یا غلط۔ سیدھی راہ پر ہوں یا ٹیڑھی پر، جنت کا بندوبست کر رہا ہوں یا جہنم کا۔ اس کی زندگی بھی جاہلیت کی اور اس کی موت بھی جاہلیت کی۔ زندگی میں کیے جانے والے کاموں میں ایک بڑا ضروری اور اہم کام یہ ہے کہ اپنے نفس پر خود ہی محاسب بن کر بیٹھا جائے اور اس کا

مؤاخذہ کیا جاتا ہے۔

ایک دفعہ مولانا وجیہہ الدین یوسف نے حضرت برہان الدین غریب کی خدمت میں عرض کیا کہ میں جس قدر اپنے نفس کے عیبوں کو دور کرتا ہوں اسی قدر زیادہ عیب نظر آتے ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ یہ تو ایک انسان کا کمال ہے کیونکہ انسان کو جب کمال حاصل ہوتا ہے تو اس کی نظر اپنے ہی عیوب پر پڑتی ہے۔

حضرت احنف بن قیس تابعیؒ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ ان کی عبادت کا خاص وقت رات ہوتا تھا۔ جب سب لوگ میٹھی نیند کے مزے لے رہے ہوتے تو وہ اپنے رب کے حضور میں حاضر ہو کر اظہار بندگی کرتے۔ اسی وقت وہ اپنے اعمال کا جائزہ بھی لیا کرتے۔ وہ چراغ جلا کر اس کی لو پر انگلی رکھتے اور اپنے نفس سے خطاب کر کے کہتے کہ بتا تجھ کو فلاں فلاں کام کرنے پر کس چیز نے آمادہ کیا۔

واضح رہے کہ جس علاقے نے اپنے آزادی کو سلامت رکھنا ہو اس کی فوج حملہ آوروں کے مقابلے میں چوکنی رہتی ہے۔ انسان بھی ہر وقت ایک کینہ پرور دشمن کے حملوں کی زد میں ہے۔ اگر اسے اپنا ایمان عزیز ہے تو اسے بھی ہر وقت چوکنا رہنا پڑے گا۔ کسی علاقے کی فوج اگر سست اور لاپروا ہو جائے گی تو علاقہ تباہ ہو جائے گا۔ انسان بھی اگر اپنے اعمال و افعال کے معاملے میں سست اور لاپروا ہو جائے گا تو اس کے ایمان و اخلاق بھی تباہ ہو جائیں گے۔

* * *

ندامت‘ توبہ اور استغفار

حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں:

”جس گناہ کے بعد ندامت نہ ہو‘ اندیشہ ہے کہ اسلام سے باہر نہ کر دے۔“

ندامت دل کا وہ افسوس اور پشیمانی ہے جو کسی گناہ کا ارتکاب کر لینے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ جس میں یہ حسرت غالب ہوتی ہے کہ کاش کہ ہم نے یہ فعل نہ کیا ہوتا۔

جب تک دل کی حالت ایسی رہے کہ گناہ کے ارتکاب کے فوراً ہی بعد وہ ندامت کی اذیت سے دوچار ہو جائے‘ تب تک اس کی اصلاح کے مواقع موجود رہتے ہیں‘ مگر جب انسان ڈھٹائی کی اس منزل پر جا پہنچے کہ خرابیاں کرتا جائے اور ان پر ذرا بھی پشیمان نہ ہو تو پھر اس کی اصلاح کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔ الا ماشاء اللہ۔

توبہ کا مطلب ہے لوٹ آنا۔ انسان جب گناہ کا ارتکاب کر کے پشیمان ہوتا ہے اور عہد کرتا ہے کہ آئندہ ایسے نہیں کروں گا‘ تو گویا وہ نیکی کی طرف لوٹ آتا ہے اور جب وہ نیکی کی طرف لوٹ آتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اپنی ناراضی دور کر کے رحمت کے ساتھ اس کی طرف لوٹ آتا ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيمًا ۝
(النساء : ١٦)

”بیشک اللہ بہت توبہ قبول کرنے والا بڑا رحم فرمانے والا ہے۔“

استغفار کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی بخشش مانگنا۔ جب ہم اعمالِ بد کا ارتکاب کرتے ہیں، تو خدا تعالیٰ ہم سے ناراض ہو جاتا ہے اور ہم ان سزاؤں کے مستحق ہو جاتے ہیں جو ان برے اعمال کے لیے معیّن کر دی گئی ہیں۔ استغفار کرنے کا مدعا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور تضرع وزاری کی جائے کہ جو گناہ ہم کر چکے ہیں، وہ اپنی رحمت سے کام لیتے ہوئے ہمیں ان کی سزا نہ دے اور انہیں نظر انداز کر کے ہم سے راضی ہو جائے۔

① ② ③

تزکیۂ نفس کے لیے گناہوں پر نادم ہونا، توبہ اور استغفار کرتے رہنا لازمی امور ہیں اور ان کی مزید وضاحت کے لیے یہ دیکھنا مفید ہوگا کہ کلام الٰہی، احادیث نبویؐ اور سلف صالحین کے اقوال و بیانات میں ان کے بارے میں کیا کچھ فرمایا گیا ہے۔

ندامت: حضرت عقبہؓ بن عامر بیان کرتے ہیں کہ میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ ”نجات حاصل کرنے کا گر کیا ہے۔“ آپؐ نے فرمایا کہ ”اپنی زبان پر قابو رکھ اور چاہیے کہ تیرے گھر میں تیرے لیے گنجائش ہو اور اپنے گناہوں پر رویا کر۔“ (ترمذی)

جن گناہوں کا ارتکاب کیا جا چکا ہو، ان پر رونا انسان کو اس بات کے لیے تیار کرتا ہے کہ وہ آئندہ ایسی حرکت نہ کرے، جس کے باعث پھر رونا پڑ جائے۔

حضرت عبداللہؓ نے فرمایا کہ مومن اپنے گناہوں کو ایسے دیکھتا ہے گویا وہ کسی پہاڑ کے نیچے ہے اور ڈرتا ہے کہ یہ پہاڑ اس پر آ گرے گا اور بدکار اپنے گناہوں کو ایسے دیکھتا ہے گویا اس کی ناک پر مکھی بیٹھی ہو کہ یوں اشارہ کیا اور وہ اڑ گئی۔ (ترمذی)

اس روایت میں ایک متقی دل کی صحیح کیفیت کی عکاسی کی گئی ہے کہ مومن سے بتقاضائے بشریت اگر کوئی گناہ ہو بھی جاتا ہے تو وہ گناہ اسے اتنا بڑا لگتا ہے جیسے پہاڑ اور وہ

لرزتا ہے کہ اس کا عذاب اتنا بڑا ہوگا کہ اسے کچل کر رکھ دے گا۔ یہ کیفیت لازماً اس کے دل میں ندامت کا طوفان کھڑا کر دیتی ہے۔ اور وہ غم سے چور ہو جاتا ہے کہ کاہے کے لیے اتنا بڑا عذاب سمیٹ لیا۔ اس کے برعکس بدعمل شخص کو چونکہ اپنی کوتاہ بینی کے باعث گناہ کی شناعت اور اس کے عذاب کی پرواہی نہیں، اس لیے وہ ذرا بھی خوف نہیں کھاتا اور اپنے گناہ کی سزا کی کچھ پروا نہیں کرتا۔

چونکہ گناہ پر نادم ہونا ذریعہ بنتا ہے۔ توبہ کرنے کا اس لیے خود ندامت کو بھی توبہ کی ایک قسم شمار کیا گیا ہے۔

حضرت ابن معقل بیان کرتے ہیں کہ میں اپنے باپ کے ساتھ حضرت عبداللہؓ کے پاس گیا کیونکہ میں نے سنا تھا کہ وہ کہتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ندامت توبہ کی ایک قسم ہے۔ میرے باپ نے حضرت عبداللہؓ سے پوچھا کہ کیا آپ نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا تھا کہ ندامت توبہ کی ایک قسم ہے تو انہوں نے فرمایا کہ ہاں۔ (ابن ماجہ)

ایسے ہی حضرت مجدد الف ثانیؒ نے بھی فرمایا ہے کہ:

”گناہ کے بعد ندامت بھی توبہ کی ایک شاخ ہے۔“

بنو امیہ کے پانچویں خلیفہ عبدالملک نے ایک دفعہ مشہور تابعی حضرت سعید بن میبؒ سے کہا۔ ”ابو محمد، اب میری یہ حالت ہوگئی ہے کہ اچھا کام کرتا ہوں تو اس سے کوئی خوشی نہیں ہوتی اور اگر برا کام کرتا ہوں تو اس کا کوئی رنج نہیں ہوتا۔“

اس پر حضرت سعید بن میبؒ نے فرمایا کہ ”اب تمہارا قلب پورے طور پر مر چکا ہے۔“

توبہ: سورۃ التحریم آیت ۸ میں اہل ایمان کو توبہ کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ط عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ......	اے لوگو، جو ایمان لائے ہو، اللہ کے حضور میں توبہ کرو، خالص توبہ۔ بعید نہیں کہ اللہ تمہاری برائیاں تم سے دور کر دے اور تمہیں ایسی جنتوں میں داخل فرما دے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔

اس عبارت میں آنے والے الفاظ تَوْبَةً نَّصُوْحًا کی تشریح یوں کی گئی ہے:

"......نصح کے معنی عربی زبان میں خلوص اور خیر خواہی کے ہیں۔ خالص شہد کو عسل ناصح کہتے ہیں، جس کو موم اور دوسری آلائشوں سے پاک کر دیا گیا ہو۔ پھٹے ہوئے کپڑے کو سی دینے اور ادھڑے ہوئے کپڑے کی مرمت کر دینے کے لیے نَصَاحَةُ الثَّوْبُ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ پس توبہ کو نصوح کہنے کا مطلب لغت کے اعتبار سے یا تو یہ ہوگا کہ آدمی ایسی خالص توبہ کرے، جس میں ریا اور نفاق کا شائبہ تک نہ ہو یا یہ کہ آدمی خود اپنے نفس کے ساتھ خیر خواہی کرے اور گناہ سے توبہ کر کے اپنے آپ کو بدانجامی سے بچا لے یا یہ کہ گناہ سے اس کے دین میں جو شگاف پڑ گیا ہے، توبہ کے ذریعے سے اس کی اصلاح کر دے یا یہ کہ توبہ کر کے وہ اپنی زندگی کو اتنا سنوار لے کہ دوسروں کے لیے وہ نصیحت کا موجب ہو اور اس کی مثال دیکھ کر دوسرے بھی اس کی طرح اپنی اصلاح کر لیں۔

یہ تو ہیں توبۂ نصوح کے وہ مفہومات جو اس کے لغوی معنوں سے مترشح ہوتے ہیں۔ رہا اس کا شرعی مفہوم، تو اس کی تشریح ہمیں اس حدیث میں ملتی ہے جو ابن ابی حاتم نے زر بن حُبیش کے واسطے سے نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابیؓ بن کعب سے توبہ نصوح کا مطلب پوچھا تو انہوں نے کہا کہ میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی سوال کیا تھا، تو آپؐ نے فرمایا تھا:

''اس سے مراد یہ ہے کہ جب تم سے کوئی قصور ہو جائے تو اپنے گناہ پر نادم ہو۔ پھر شرمندگی کے ساتھ اس پر اللہ تعالیٰ سے استغفار کرو اور آئندہ کبھی اس فعل کا ارتکاب نہ کرو۔''

یہی مطلب حضرت عمرؓ، حضرت عبداللہؓ بن مسعود اور حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ سے بھی منقول ہے اور ایک روایت میں حضرت عمرؓ نے توبۂ نصوح کی تعریف یہ بیان کی ہے کہ توبہ کے بعد انسان گناہ کا اعادہ تو درکنار، اس کے ارتکاب کا ارادہ تک نہ کرے۔

(ابن جریر)

حضرت علیؓ نے ایک مرتبہ ایک بدو کو جلدی جلدی توبہ و استغفار کے الفاظ زبان سے ادا کرتے سنا تو فرمایا کہ یہ تُوْبَۃُ الْکَذَّابِین (بہت جھوٹوں کی توبہ) ہے۔ اس شخص نے پوچھا کہ پھر صحیح توبہ کیا ہے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ اس کے ساتھ چھ چیزیں ہونی چاہئیں:

۱۔ جو کچھ ہو چکا ہے اس پر نادم ہو۔

۲۔ اپنے جن فرائض سے غفلت برتی ہو، ان کو ادا کر۔

۳۔ جس کا حق مارا ہو، اس کو واپس کر۔

۴۔ جس کو تکلیف پہنچائی ہو، اس سے معافی مانگ۔

۵۔ آئندہ کے لیے عزم کر لے کہ اس گناہ کا اعادہ نہ کرے گا۔ اور

۶۔ اپنے نفس کو اللہ کی اطاعت میں گھلا دے، جس طرح تو نے اب تک اسے معصیت کا خوگر بنائے رکھا۔ اور اس کو طاعت کی تلخی کا مزا چکھا جس طرح اب تک تو اسے معصیتوں کی حلاوت کا مزا چکھاتا رہا ہے۔ (کشاف)

(تفہیم القران جلد ۳، صفحات ۳۰، ۳۱)

سورۃ النور، آیت ۳۱ میں اہل ایمان کو توبہ کرنے کی تاکید کی گئی ہے:

وَتُوْبُوْا اِلَی اللّٰہِ جَمِیْعًا اَیُّہَ	''اے مومنو، تم سب مل کر اللہ کے حضور
الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝	میں توبہ کرو۔ توقع ہے کہ فلاح پاؤ گے۔''

سورۃ الحجرات، آیت ۱۱ میں مسلمانوں کو ایک دوسرے کا مضحکہ اڑانے، ایک دوسرے پر طعنہ زنی کرنے اور ایک دوسرے کو برے القاب سے یاد کرنے سے منع فرما کر آخر میں یہ وعید فرمائی گئی ہے کہ:

وَمَنْ لَّمْ یَتُبْ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ	''اور جو لوگ توبہ نہ کریں گے تو وہی ظالم
الظّٰلِمُوْنَ ۝	ہیں۔''

توبہ کی فضیلت معلوم کرنے کے لیے ذیل کی آیات واحادیث کو دیکھ لینا کافی ہو گا۔ سورۃ المومن، آیات ۷،۸،۹ میں فرمایا گیا ہے:

''جو فرشتے کہ عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو فرشتے اس کے گرداگرد ہیں، وہ اپنے رب کی تسبیح وتحمید کرتے رہتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان والوں کے لیے استغفار کیا کرتے ہیں (اور دعا کرتے ہیں) کہ اے ہمارے پروردگار آپ کی رحمت اور علم ہر چیز کو شامل ہے، سو ان لوگوں کو بخش دیجیے جنھوں نے توبہ کر لی ہے اور آپ کے رستے پر چلتے ہیں اور ان کو جہنم کے عذاب سے بچا لیجیے۔ اور اے ہمارے پروردگار، ان کو ہمیشہ رہنے کی بہشتوں میں جن کا آپ نے ان سے وعدہ کیا ہے، داخل کر دیجیے اور ان کے ماں باپ اور بیبیوں اور اولاد میں سے جو لائق ہوں، ان کو بھی داخل کر دیجیے۔ بلاشک آپ زبردست (اور) حکمت والے ہیں۔ اور ان کو تکالیف سے بچائیے اور آپ جس کو اس دن کی تکالیف سے بچالیں تو اس پر آپ نے مہربانی فرمائی اور یہ بڑی کامیابی ہے۔''

سورۃ البقرہ، آیت ۲۲۲ میں ارشاد ہوا ہے:

اِنَّ اللّٰـهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ ''بے شک اللہ محبت رکھتا ہے توبہ کرنے والوں سے
وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ. اور محبت رکھتا ہے پاکیزگی اختیار کرنے والوں سے۔''

حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب بندہ بدکاری کرتا ہے تو وہ مومن نہیں ہوتا اور جب وہ چوری کرتا ہے تو وہ مومن نہیں ہوتا اور جب وہ (شراب) پیتا ہے تو وہ مومن نہیں ہوتا اور جب وہ (کسی کو) قتل کرتا ہے تو وہ مومن نہیں ہوتا۔

حضرت عکرمہؓ بیان کرتے ہیں کہ (اس پر) میں نے عبداللہؓ بن عباسؓ سے پوچھا کہ (ان صورتوں میں) ایمان اس سے کس طرح کھینچ لیا جاتا ہے۔ تو انہوں نے فرمایا کہ اس طرح۔ اور اپنی انگلیوں کو ایک دوسری میں ڈال کر پھر نکالا (اور پھر فرمایا کہ) پھر اگر وہ شخص توبہ کرے تو ایمان اس کی طرف لوٹ آتا ہے۔ اور پھر اپنی انگلیوں کو انگلیوں میں ڈالا۔ (بخاری)

سورۃ المطففین، آیت ۱۴ میں اللہ تعالیٰ قیامت کو جھٹلانے والوں کی قلبی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہے:

كَلَّا بَلْ سکتہ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا ہرگز نہیں بلکہ دراصل ان لوگوں کے دلوں پر
كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ. ان کے برے اعمال کا زنگ چڑھ گیا ہے۔

اس آیت میں جو لفظ رَانَ استعمال ہوا ہے، جس کا مطلب ہے کہ زنگ چڑھ گیا ہے، اس کی وضاحت حضورؐ کی ایک حدیث میں ملتی ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب بندہ کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ بنا دیا جاتا ہے۔ پھر جب وہ اس گناہ کو چھوڑ دیتا ہے اور استغفار کرتا ہے اور توبہ کرتا ہے تو اس کے دل کی صفائی کر دی جاتی ہے (اور

وہ نقطہ مٹ جاتا ہے) اور اگر وہ دوبارہ گناہ کرتا ہے تو اس نقطے کو بڑھا دیا جاتا ہے، یہاں تک کہ (آخر رفتہ رفتہ) وہ اس کے تمام دل پر چھا جاتا ہے اور یہی وہ رَان ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ذکر کیا ہے کہ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۔ (ترمذی)

خواجہ حسن بصریؒ فرماتے ہیں: ''جب بندہ گناہ کے بعد توبہ کرتا ہے تو اس سے خدا کے ساتھ اس کی قربت میں اضافہ ہوتا ہے۔''

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا فرمان ہے: ''بوڑھے آدمی کا توبہ کرنا عمدہ کام ہے لیکن جوان آدمی توبہ کرے تو یہ بہت ہی عمدہ کام ہے۔''

حضرت علیؓ فرماتے ہیں: ''آج کا دن بدن کو چھریرا بنانے والا ہے۔ کل کا دن دوڑ کے لیے مقرر ہو چکا ہے۔ سامنے جنت ہے اور آخر کار دوزخ۔ کیا تم میں کوئی ایسا نہیں ہے جو اپنی موت سے پہلے توبہ کر لے۔ کیا کوئی ہے جو روزِ بد سے پہلے اپنے لیے کوئی نیک کام کر لے۔''

حضرت بایزید بسطامیؒ فرماتے ہیں: ''جو نیکی فی الفور کسی نور یا علم کا پھل نہ دے اسے نیکی شمار نہ کر، اور جس گناہ کے بعد فی الفور خدا کا خوف اور توبہ میسر آ جائے اسے گناہ نہ گن۔''

حضرت عبداللہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندے کی توبہ سے اس آدمی سے بھی زیادہ خوش ہوتا ہے جو ایک سنسان، ہلاکت خیز بیابان میں ہے۔ اس کے ساتھ اس کی اونٹنی ہے جس پر اس کا کھانا اور پانی لدا ہے۔ وہ (وہاں) سو جائے اور جب جاگے تو دیکھے کہ وہ اونٹنی کہیں چلی گئی ہے۔ وہ اسے تلاش کرتا رہتا ہے (اور اس جگہ سے دور نکل جاتا ہے) یہاں تک کہ اسے پیاس لگ آتی ہے۔ پھر وہ (نا امید ہو کر اپنے آپ سے) کہتا ہے کہ اسی جگہ چلتا ہوں جہاں پہلے تھا

اور سو جاتا ہوں یہاں تک کہ مر جاؤں۔ پھر وہ مر جانے کے ارادے سے اپنا سر اپنی کلائی پر رکھ لیتا ہے (اور سو جاتا ہے) پھر جب جاگتا ہے تو (کیا دیکھتا ہے کہ) اس کی اونٹنی اس کے پاس کھڑی ہے اور اس کا زادِ راہ اور اس کا کھانا پانی بھی اونٹنی کے اوپر ہی ہے۔ جتنی خوشی ایسے شخص کو اپنی اونٹنی اور اپنا زادراہ پانے سے ہوتی ہے، اس سے زیادہ خوشی اللہ تعالیٰ کو ہوتی ہے جب (اس کا) مومن بندہ توبہ کرے۔ (مسلم)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدمؑ کے بیٹے کے پاس اگر سونے کی ایک وادی ہو تو وہ خواہش کرے گا کہ ایک وادی اور ہو اور انسان کا منہ صرف مٹی ہی پر کر سکتی ہے اور اللہ تعالیٰ اس شخص پر توجہ فرماتا ہے جو توبہ کرے۔ (مسلم)

حضرت ابوموسیٰؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ عزوجل رات کے وقت اپنا ہاتھ پھیلاتا ہے تاکہ دن کے وقت گناہ کرنے والا توبہ کر لے اور دن کے وقت اپنا ہاتھ پھیلاتا ہے تاکہ رات کے وقت گناہ کرنے والا توبہ کر لے (اور اللہ تعالیٰ اسی طرح ہر رات کو اور ہر دن کو ہاتھ پھیلاتا رہے گا) یہاں تک کہ سورج مغرب سے طلوع ہو (یعنی قیامت آجائے)۔ (مسلم)

حضرت عبداللہؓ بن مسعود بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی کو اللہ تعالیٰ سے زیادہ (اپنی) تعریف پسند نہیں ہے۔ اسی لیے اس نے اپنی تعریف خود کی ہے اور اللہ تعالیٰ سے زیادہ کوئی غیرت مند نہیں ہے۔ اسی لیے اس نے سب فحش باتوں کو حرام کر دیا ہے اور اللہ تعالیٰ سے زیادہ کسی کو عذر پسند نہیں ہے، اسی لیے اس نے کتاب نازل کی ہے اور رسول بھیجے ہیں۔ (مسلم)

حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے لوگو، اللہ کے حضور میں توبہ کرو۔ بے شک میں دن میں سو مرتبہ اس کے حضور میں توبہ کرتا

ہوں۔ (مسلم)

توبہ کی اس ساری فضیلت کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ بہت کم لوگوں کو اس کی توفیق ہوتی ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ امام غزالیؒ نے اس موضوع پر اظہارِ خیال کیا ہوا ہے جس کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ امام صاحبؒ نے بہت سے لوگوں کے توبہ کی طرف توجہ نہ کرنے کی پانچ وجوہ بتائی ہیں۔

۱۔ پہلی یہ کہ گناہ کی سزا عموماً فوراً دست بدست نہیں ملتی، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ گنہگار پھر گناہ کرتا چلا جاتا ہے کیونکہ سزا اسے دور نظر آتی ہے۔

اس کا علاج امام غزالیؒ نے یہ بتایا ہے کہ انسان کو سوچنا چاہیے کہ جو بات ایک نہ ایک دن ہو کر رہنی ہے وہ دور ہے ہی نہیں، وہ تو بالکل قریب ہے۔ کیا معلوم آج کا دن زندگی کا آخری دن ہی ہو۔ پھر یہ بھی سوچنا چاہیے کہ زندگی میں اس خوف کے مارے کہ آئندہ کسی دن افلاس نہ آ لے، انسان روزی حاصل کرنے کے لیے کتنی تگ ودو کرتا ہے تو کیا آخرت کی پائدار زندگی کی اسے اتنی بھی فکر نہیں ہے جتنی اس ختم ہو جانے والی ناپائدار زندگی کی۔

۲۔ توبہ نہ کرنے کا دوسرا سبب یہ ہے کہ غلط خواہشات کو پورا کرنے میں جو لذت ملتی ہے اس کو چھوڑنا منظور نہیں۔ اس کا علاج امام غزالیؒ یہ بتاتے ہیں۔ کہ ذرا غور تو کرو کہ اگر کسی بیماری کی حالت میں ٹھنڈا پانی تمہارے لیے مضر ہو اور طبیب اس سے منع کر دے تو تم اپنی زندگی بچانے کی خاطر اس نعمت کو بھی چھوڑ دیتے ہو، تو پھر جن اعمال وافعال کو خدا نے مضر بتا دیا ہے انہیں چھوڑنے کے لیے کیوں تیار نہیں ہوتے۔ کیا خدا اور خدا کا رسولؐ نعوذ باللہ کسی طبیب کے برابر بھی نہیں۔ اس کے علاوہ اگر تمہارا نفس اتنا لذت پسند ہے کہ حقیر ناپائدار دنیاوی لذتوں کو نہیں چھوڑ سکتا تو پھر آخرت کی دائمی نعمتوں کو چھوڑنا اور ہمیشہ کے لیے آگ میں جلنے کو کس طرح برداشت کرے گا۔

۳۔ توبہ نہ کرنے کا تیسرا سبب امام صاحبؒ یہ بتاتے ہیں کہ نفس کاہلی کا سبق پڑھاتا ہے کہ توبہ کرنے کی ایسی بھی کیا جلدی ہے' آج نہیں تو کل کرلیں گے۔ اسی طرح دن گزرتے جاتے ہیں' یہاں تک کہ موت سر پر آکھڑی ہوتی ہے۔ اس کا علاج امام غزالیؒ یہ بتاتے ہیں کہ سوچنا چاہیے کہ کل پتہ نہیں آئے گا بھی یا نہیں اور اگر آہی گیا تو جس نفس کو ہم آج نہیں زیر کرسکے وہ کل تو اپنی قبیح عادات پر اور بھی زیادہ پختہ ہو جائے گا۔ اس کی مثال یوں ہے کہ کسی سے کہا جائے کہ یہ درخت اکھاڑ دو۔ وہ کاہلی کا مارا کہے کہ اس سال تو نہیں آئندہ سال اکھاڑ دوں گا۔ ظاہر ہے ایک اور سال گزر جانے کے باعث درخت کی جڑیں اور بھی زیادہ مضبوط ہو جائیں گی' تو جواب نہیں اکھاڑا جا رہا وہ مزید مضبوط ہو جانے کے بعد کب اکھاڑا جاسکے گا۔

۴۔ چوتھا سبب یہ ہے کہ نفس یہ شوشہ چھوڑ دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو ہے ہی غفور رحیم' اسے ہمارے گناہوں کی پرواہی کیا ہے۔ جو کچھ بھی کریں وہ اپنی رحمت سے کام لیتے ہوئے ہمیں معاف ہی کردے گا۔ حالانکہ حدیث میں آیا ہے کہ دانا وہ ہے جو اپنے نفس کا محاسبہ کرے اور موت کے بعد کے لیے عمل کرے اور عاجز وہ ہے' جو نفس کو خواہشات کے پیچھے لگائے اور خدا سے امیدیں باندھے۔ (ترمذی)

۵۔ پانچواں سبب یہ ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص آخرت اور اس کی جزا اور سزا کو مانتا ہی نہ ہو۔ امام غزالیؒ اس کا علاج یہ بتاتے ہیں کہ اتنا تو سوچو کہ اگر تم جسمانی طور پر بیمار ہو جاؤ اور تمہیں علمِ طب سے واقفیت نہ ہو تو پھر لامحالہ تم طبیب ہی کی رائے پر بھروسہ کروگے اور اگر کوئی ایسی صورت ہو جائے کہ تمام اطباء ایک بات پر متفق ہو جائیں تو پھر تو تمہیں شک ہی نہیں گزرے گا کہ طبیب کی رائے غلط بھی ہوسکتی ہے۔ اب جس طرح حکیم ڈاکٹر جسمانی بیماریوں کے طبیب ہیں اسی طرح پیغمبر روحانی بیماریوں کے طبیب ہیں اور یہ سب طبیب

متفق القول ہو کر کہتے ہیں کہ آخرت ضرور ہونے والی ہے اور اس چند روزہ زندگی کا بدلہ ضرور ملنے والا ہے تو پھر آخر آخرت کے حق ہونے میں شک کرنے کی گنجائش کہاں رہتی ہے۔ (تبلیغ دین، از امام غزالیؒ")

توبہ کے بارے میں چند اور امور ایسے ہیں جنہیں پیشِ نظر رہنا چاہیے:

(١) "اول یہ کہ توبہ درحقیقت کسی معصیت پر اس لیے نادم ہونا ہے کہ وہ اللہ کی نافرمانی ہے، ورنہ کسی گناہ سے اس لیے پرہیز کا عہد کر لینا کہ وہ مثلاً صحت کے لیے نقصان دہ ہے یا کسی بدنامی کا یا مالی نقصان کا موجب ہے، توبہ کی تعریف میں نہیں آتا۔

(٢) دوسرے یہ کہ جس وقت آدمی کو احساس ہو جائے کہ اس سے اللہ کی نافرمانی ہوئی ہے، اسی وقت اسے توبہ کرنی چاہیے اور جس شکل میں بھی ممکن ہو بلا تاخیر اس کی تلافی کر دینی چاہیے، اسے ٹالنا مناسب نہیں ہے۔

(٣) تیسرے یہ کہ توبہ کر کے بار بار اسے توڑتے چلے جانا اور توبہ کو کھیل بنا لینا اور اسی گناہ کا بار بار اعادہ کرنا، جس سے توبہ کی گئی ہو، توبہ کے جھوٹے ہونے کی دلیل ہے۔ کیونکہ توبہ کی اصل روح گناہ پر شرمساری ہے اور بار بار کی توبہ شکنی اس بات کی علامت ہے کہ اس کے پیچھے کوئی شرمساری موجود نہیں ہے۔

(٤) چوتھے یہ کہ جو شخص سچے دل سے توبہ کر کے یہ عزم کر چکا ہو کہ پھر اس گناہ کا اعادہ نہیں کرے گا، اس سے اگر بشری کمزوری کی بناء پر اسی گناہ کا اعادہ ہو جائے تو پچھلا گناہ تازہ نہ ہو گا۔ البتہ اسے بعد والے گناہ پر پھر توبہ کرنی چاہیے اور زیادہ سختی کے ساتھ عزم کرنا چاہیے کہ آئندہ وہ توبہ شکنی کا مرتکب نہیں ہو گا۔

✓ پانچویں یہ کہ ہر مرتبہ جب معصیت یاد آئے توبہ کی تجدید کرنا لازم نہیں ہے۔ لیکن اگر اس کا نفس اپنی سابق گنہگارانہ زندگی کی یاد سے لطف لے رہا ہو تو بار بار توبہ کرنی چاہیے،

یہاں تک کہ گناہوں کی یاد اس کے لیے لذت کے بجائے شرمساری کی موجب بن جائے۔ اس لیے کہ جس شخص نے واقعی خدا کے خوف کی بناء پر معصیت سے توبہ کی ہو، وہ اس خیال سے لذت نہیں لے سکتا کہ وہ خدا کی نافرمانی کرتا رہا ہے: اس سے لذت لینا اس بات کی علامت ہے کہ خدا کے خوف نے اس کے دل میں جڑ نہیں پکڑی ہے۔"

(تفہیم القرآن، جلد ششم، صفحہ ۳۱، ۳۲)

سورۃ النساء آیت ۱۷، ۱۸ میں اللہ تعالیٰ نے توبہ کے بارے میں وضاحت کی ہے کہ:

"ہاں یہ جان لو کہ اللہ پر توبہ کی قبولیت کا حق انہی لوگوں کے لیے ہے جو نادانی کی وجہ سے کوئی برا فعل کر گزرتے ہیں اور اس کے بعد جلدی ہی توبہ کر لیتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی توبہ اللہ قبول کر لیتا ہے اور خدا بڑا علم رکھنے والا اور دانا ہے، مگر توبہ ان لوگوں کے لیے نہیں ہے جو برے کام کیے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت کا وقت آ جاتا ہے۔ اس وقت وہ کہتا ہے کہ اب میں نے توبہ کی اور اسی طرح توبہ ان کے لیے بھی نہیں ہے جو مرتے دم تک کافر ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے تو ہم نے دردناک سزا تیار کر رکھی ہے۔"

جامعہ اشرفیہ کے بانی مفتی محمد حسنؒ فرماتے ہیں کہ: "توبہ اگرچہ تریاق ہے مگر اس سے گناہ کی ہمت نہیں ہونی چاہیے۔ جیسے تریاق اگر ہاتھ آ جائے تو سانپ سے چھیڑ کرنا بیوقوفی ہے۔ اس طرح توبہ کے بھروسے پر گناہ کرنا سخت غلطی ہے۔"

حضرت شقیق بلخیؒ فرماتے ہیں: "بدترین شخص وہ ہے جو توبہ کی امید پر گناہ کرے اور زندگی کی امید پر توبہ۔"

توبہ کے بارے میں ایک اور وضاحت، جس کا جاننا ضروری ہے، یہ ہے کہ کوئی

بڑے سے بڑا گھناؤنا گناہ بھی ایسا نہیں جس کے بعد توبہ نہ ہو سکتی ہو بشرطیکہ انسان سچے دل سے نادم ہو اور آئندہ اس گناہ سے بچے رہنے کا پختہ عہد کرے۔ نیز یہ کہ توبہ کا دروازہ قیامت تک کھلا ہے۔ چاہے کوئی شخص عمر بھر گناہ کرتا رہا ہو موت سامنے آ حاضر ہونے سے پہلے جب بھی وہ اپنے کیے پر سچے دل سے شرمسار ہوگا‘ وہ توبہ کر سکتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مغرب سے سورج طلوع ہونے سے پہلے پہلے جس شخص نے بھی توبہ کر لی‘ خدا اس کی توبہ قبول فرمائے گا۔‘‘ (مسلم)

حضرت شقیق بلخیؒ کے پاس ایک بوڑھا آیا اور کہنے لگا کہ توبہ کرتا ہوں مگر بہت دیر سے آیا ہوں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اب بوڑھا ہو کر توبہ کرنے لگا ہوں۔ اس پر حضرت شقیقؒ نے فرمایا کہ موت سے پہلے آ جانا دیر نہیں ہے۔

جب انسان اپنے آپ کو کسی گناہ سے باز رکھتا ہے تو دل بہت تکلیف محسوس کرتا ہے۔ اسی طرح جو شخص واقعی سچے دل سے اپنے گناہ پر نادم ہوتا ہے‘ اس کا دل بھی اپنے کیے پر شرمندگی اور رنج و غم کے مارے سخت قسم کی اذیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ اذیت جو ندامت کے باعث ہوتی ہے‘ اتنی شدید ہوتی ہے کہ اگر وہ بروقت اپنے آپ کو گناہ سے روک لیتا تو اس کا دل اس سے کم اذیت محسوس کرتا۔ اس حقیقت کو حضرت عمر فاروقؓ نے اس طرح واضح فرمایا ہے کہ:

’’توبہ کی تکلیف سے گناہ چھوڑ دینا آسان ہے۔‘‘

توبہ کے سلسلے میں ایک اور ضروری بات یہ ہے کہ سچی توبہ کی کچھ شرائط ہوتی ہیں‘ جو اگر پوری نہ ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ توبہ میں خلوص نہیں۔ بعض بزرگوں نے اپنے اپنے خیال کے مطابق توبہ کی شرائط بیان فرمائی ہیں۔

امام نودیؒ فرماتے ہیں کہ توبہ کی تین شرائط ہیں:

☆ اولاً، تو گناہ سے باز آجائے،

☆ ثانیاً، تو گناہ پر نادم ہو،

☆ ثالثاً، تو اس بات کا عہد کرے کہ پھر وہ گناہ نہیں کرے گا،

اور اگر گناہ حقوق العباد کے متعلق ہے تو پھر ایک چوتھی شرط یہ ہے کہ جس بندے کا حق چھینا تھا، اس کا حق ادا کرے یا اس سے معاف کرائے۔

خواجہ معین الدین چشتیؒ فرماتے ہیں: ”توبہ کے چند مقامات ہیں:

۱۔ جاہلوں سے دور رہنا،

۲۔ باطل کو ترک کرنا،

۳۔ منکروں سے روگردانی کرنا،

۴۔ محبوب سے محبت رکھنا،

۵۔ خیرات کرنا،

۶۔ توجہ کو درست کرنا،

۷۔ مظالم کو رد کرنا۔“

ایک دفعہ کسی شخص نے حضرت جنید بغدادیؒ سے توبہ کے بارے میں سوال کیا۔ آپ نے فرمایا کہ توبہ میں تین باتیں ہونی چاہئیں:

۱۔ ندامت۔

۲۔ اس بات کا مصمم ارادہ کہ آئندہ، خدا کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کریں گے۔

۳۔ ماضی میں کیے ہوئے گناہوں کے کفارے کا خیال۔

توبہ کی ان شرائط کو سامنے رکھیے اور پھر دیکھئے کہ ہم میں سے بہت سے لوگ لفظ

توبہ کو کس کس سیاق وسباق میں استعمال کرتے ہیں۔ کیا مضحکہ خیز ہوتا ہے وہ منظر جب کوئی خاتون بیٹھی اپنی تعریفوں کے پل باندھ رہی ہوتی ہیں یا کسی کی غیبت میں مصروف ہوتی ہیں یا کسی کے اخلاق اور چال چلن پر حملے کر رہی ہوتی ہیں اور ساتھ ساتھ کانوں کو ہاتھ لگا کر کہتی جاتی ہیں کہ:

"ہائے، توبہ توبہ کر کے کہتی ہوں!"

یہ کس قماش کی توبہ ہے جو گناہ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر اس کے ساتھ ساتھ چلتی ہے بلکہ آگے ہو کر اسے اپنی رہنمائی میں چلاتی ہے۔

توبہ تو وہ اظہارِ ندامت ہے جو گناہ کے بعد کیا جاتا ہے۔ یہ توبہ کی کون سی قسم ہے جو گناہ سے پہلے ہی آدھمکتی ہے اور اس کے آنے کی راہ صاف کرتی ہے کیونکہ

"ہائے توبہ توبہ کر کے کہتی ہوں۔"

پہلے کہا جاتا ہے اور اس کے بعد وہ قابلِ اعتراض بات کی جاتی ہے۔ جس پر توبہ کی فضیلت کے سلسلے میں حضرت عمرؓ کا ایک بیان بڑا مؤثر ہے۔ آپؓ فرماتے ہیں:

"اگر غیب دانی کے دعوے کا خیال نہ ہوتا تو میں کہتا کہ پانچ اشخاص جنتی ہیں:

۱۔ جو محتاج عیالدار مگر صابر ہو،
۲۔ وہ عورت جس کا خاوند اس سے راضی اور خوش ہو،
۳۔ وہ عورت جس نے اپنے خاوند کو مہر معاف کر دیا ہو،
۴۔ وہ جس کے والدین اس سے خوش ہوں ----- اور
۵۔ وہ جو اپنے گناہوں سے سچی توبہ کرے۔"

استغفار: سورۃ النساء آیت ۱۱۰ میں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو مغفرت مانگنے کی طرف ابھارتے ہوئے فرمایا:

"اگر کوئی شخص برا فعل کر گزرے یا اپنے نفس پر ظلم کر جائے اور اس کے بعد اللہ سے مغفرت مانگے، تو وہ اللہ کو بہت بخشنے والا بہت رحم کرنے والا پائے گا۔"

سورۃ النساء ہی کی آیت ۱۰۶ میں استغفار کی تلقین کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے:

وَاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝

"اور اللہ سے بخشش مانگو۔ بے شک اللہ بڑا بخشنے والا، بڑا رحم فرمانے والا ہے۔"

سورۃ المؤمن آیت ۳ میں اللہ تعالیٰ کی جو صفات بیان کی گئی ہیں۔ وہ یہ ہیں:

غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ؕ ذِي الطَّوْلِ ؕ

"گناہ کا بخشنے والا ہے اور توبہ قبول کرنے والا ہے، سخت سزا دینے والا ہے، قدرت والا ہے۔"

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ گمراہ قوموں کو جب خدا کے عذاب سے ڈرایا جاتا تھا تو وہ ڈرنے کے بجائے اس عذاب کو دعوت دینے کو تیار ہو جاتی تھیں۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے گزرنے والے کئی انبیاء کو ان کی قوموں نے یہی چیلنج دیا کہ اچھا پھر لے آؤ ہم پر وہ عذاب جس سے تم ہمیں ڈرا رہے ہو۔ ایسی ہی بات قریشِ مکہ نے بھی کی تھی۔ سورۃ الانفال آیت ۳۲ میں بیان ہوا ہے کہ کفارِ مکہ کہتے ہیں کہ:

"اے خدا، اگر یہ (اسلام) واقعی حق ہے اور تیری ہی طرف سے ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا دے یا کوئی دردناک عذاب ہم پر لے آ۔"

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا کہ جب تک تم ان کے درمیان موجود تھے خدا نے ان پر عذاب نازل نہیں کرنا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا ہے کہ خدا کا یہ قاعدہ نہیں ہے کہ لوگ استغفار کر رہے ہوں اور وہ ان پر عذاب نازل کر دے۔ ظاہر ہے کہ کافر تو استغفار نہیں کرتے تھے، مگر جب حضورؐ مکے میں تھے تو دوسرے مسلمان بھی وہیں تھے، جو خدا کے حضور میں استغفار کرتے تھے۔ لہٰذا حضورؐ کے وہاں رہنے

کے باعث اور اللہ کے حضور میں استغفار کرنے والوں کے باعث وہاں عذاب نازل نہ کیا گیا۔ گویا عذاب سے بچاؤ کے اسباب دو تھے۔ حضورؐ کی وہاں موجودگی اور وہاں رہنے والوں میں سے ایک جماعت کا استغفار کرنا۔ اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت علیؓ فرماتے ہیں:

”زمین پر خدا کے عذاب سے دو پناہیں تھیں۔ ان میں ایک تو اٹھالی گئی، لہٰذا اب دوسری سے وابستہ رہو۔ وہ پناہ جو اٹھالی گئی، وہ نبی کریمؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک تھی اور جو پناہ باقی ہے وہ استغفار ہے۔“

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ سے اپنے گناہوں کی بخشش مانگتے رہنا خدا کے عذاب سے بچنے کا ایک ذریعہ ہے۔

سورہ آل عمران آیت ۱۷ میں متقی لوگوں کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

”یہ لوگ صبر کرنے والے ہیں، راست باز ہیں، فرمانبردار ہیں، اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے ہیں اور رات کی آخری گھڑیوں میں استغفار کرنے والے ہیں۔“

کلام پاک اور احادیث نبویؐ میں فرشتوں کے بارے میں جو معلومات ملتی ہیں ان سے پایا جاتا ہے کہ شیطان کے بالکل برعکس فرشتے انسان کے بڑے بہی خواہ اور ہمدرد ہیں۔

سورۃ الشوریٰ آیت ۵ میں بیان فرمایا گیا ہے:

......وَالْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ ؕ	”اور فرشتے اپنے رب کی تسبیح و تحمید کرتے ہیں اور اہلِ زمین کے لیے استغفار کرتے ہیں۔“

حضرت ابوبکرؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے

سنا کہ جب کوئی شخص کوئی گناہ کر لیتا ہے، پھر اٹھتا ہے اور پاکی اور طہارت حاصل کرتا ہے، پھر نماز پڑھتا ہے، پھر (اپنے اس گناہ پر) اللہ تعالیٰ سے بخشش مانگتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے بخش دیتا ہے۔ پھر حضورؐ نے یہ آیت پڑھی:

وَالَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَۃً اَوْ ظَلَمُوْآ اَنْفُسَھُمْ ذَکَرُوا اللّٰہَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِھِمْ ...... اس آیت کو آخر تک پڑھا۔ (ترمذی)

حضورؐ نے جو آیت تلاوت فرمائی، وہ سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۱۳۵ ہے۔ جس میں متقی لوگوں کی صفات بتائی گئی ہیں۔ آیت کا ترجمہ درج ذیل ہے:

''اور جو ایسے ہیں کہ اگر کبھی کوئی فحش کام ان سے سرزد ہو جاتا ہے یا (کسی گناہ کا ارتکاب کر کے) وہ اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو معاً انہیں اللہ یاد آ جاتا ہے اور وہ اس سے اپنے گناہوں کی بخشش مانگنے لگتے ہیں اور اللہ کے سوا اور کون ہے جو گناہ معاف کر سکتا ہو----- اور وہ دیدہ و دانستہ اپنے کیے پر اصرار نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کی جزا ان کے رب کے پاس یہ ہے کہ وہ ان کو معاف کر دے گا اور انہیں ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ کیا ہی اچھا بدلہ ہے نیک عمل کرنے والوں کے لیے۔''

حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو کوئی استغفار کرنے کو لازم پکڑ لے، خدا اس کے لیے ہر تنگی سے نکلنے کی راہ پیدا کر دے گا اور اسے ہر غم سے مخلصی دے گا اور اس کو وہاں سے رزق عطا کرے گا جس طرف اس کا گمان بھی نہیں گیا ہوگا۔ (ابوداؤد)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم دعا کیا کرتے تھے کہ خدایا مجھے ان لوگوں میں سے کر جو نیک کام کرتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں اور جب برا

کام کرتے ہیں تو استغفار کرتے ہیں۔ (ابن ماجہ)

استغفار کے متعلق یہ سمجھ لینا کہ انسان کوئی بڑا گناہ کرے تبھی اس کو استغفار کی حاجت ہوتی ہے، درست نہیں۔ حضور رسالتمآب ﷺ سے بڑھ کر خدا سے ڈرنے والا اور خدا کا اطاعت شعار اور کون ہو سکتا ہے، مگر استغفار کے معاملے میں آپ کا بھی یہ حال تھا کہ:

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ ”خدا کی قسم میں دن میں ستر بار سے زیادہ اللہ سے استغفار کرتا ہوں اور اس کے حضور میں توبہ کرتا ہوں۔“ (بخاری)

حضرت ثوبانؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنی نماز سے فارغ ہوتے تو تین بار استغفار کرتے اور کہتے اَللّٰھُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْکَ السَّلَامُ تَبَارَکْتَ یَا ذُالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ۔

ولید راوی بیان کرتے ہیں کہ میں نے اوزاعی سے دریافت کیا کہ حضورؐ استغفار کیسے کرتے؟ وہ بولے کہ آپؐ یوں کہتے کہ اَسْتَغْفِرُ اللّٰہ اَسْتَغْفِرُ اللّٰہ۔ (مسلم)

حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک نشست سے اٹھنے سے پہلے آپؐ کی یہ دعا سو بار گنی جاتی۔

رَبِّ اغْفِرْلِیْ وَتُبْ عَلَیَّ اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ۔

(اے میرے رب مجھے بخش دے اور میری توبہ قبول کر، بے شک تو ہی ہے بڑا توبہ قبول کرنے والا، بڑا رحم فرمانے والا) (ترمذی)

علی بن ربیعہ بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ کے پاس سواری کے لیے ایک چوپایہ لایا گیا۔ جب آپؓ نے رکاب میں پاؤں رکھا تو کہا۔ بسم اللہ۔ پھر جب اس کی پشت پر بیٹھ گئے تو کہا۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ۔ پھر کہا۔ سُبْحَانَ الَّذِیْ

سَخَّرَ لَنَا ھٰذَا وَمَا کُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ وَاِنَّا اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ۔ (میں پاکی بیان کرتا ہوں اس کی جس نے اسے ہمارے لیے مسخر کیا اور ہم تو اس پر قادر نہیں ہو سکتے تھے اور بے شک ہم اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں) پھر تین بار اَلْحَمْدُ لِلّٰہ کہا، تین بار اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہا اور یہ پڑھا:

سُبْحَانَکَ اِنِّیْ قَدْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْلِیْ فَاِنَّهٗ لَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ ۔ (میں تیری پاکی بیان کرتا ہوں۔ بے شک میں نے اپنے آپ پر ظلم کیا پس مجھے بخش دے۔ بے شک کوئی نہیں جو گناہوں کو بخشے سوائے تیرے)

پھر آپ ہنس پڑے۔ پس میں نے عرض کیا کہ اے امیر المومنین، آپ کس بات پر ہنسے۔ بولے کہ میں نے رسول خدا ﷺ کو دیکھا کہ آپؐ نے ایسے ہی کیا، جیسے میں نے کیا ہے اور پھر آپؐ ہنس پڑے۔ میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہؐ آپ کس بات پر ہنسے۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ بے شک تمہارا رب اپنے بندے سے تعجب کے ساتھ خوش ہوتا ہے، جب بندہ یہ کہتا ہے کہ رَبِّ اغْفِرْلِیْ ذُنُوْبِیْ اِنَّهٗ لَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ غَیْرُکَ ۔ (اے میرے رب میرے گناہ بخش دے۔ بے شک کوئی نہیں جو گناہوں کو بخشے سوائے تیرے)۔ (ترمذی)

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ جسے چار چیزیں مل گئیں، وہ چار چیزوں سے محروم نہیں رہتا۔

۱۔ دعا کے بعد حاجت روائی سے،

۲۔ توبہ کے بعد قبولیت سے،

۳۔ استغفار کے بعد مغفرت سے، اور

۴۔ شکر کے بعد زیادتی نعمت سے۔

قصہ مختصر یہ کہ بشر سے اگر بتقاضائے بشریت کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو اگر وہ اپنے نفس کا تزکیہ کرنے کا خواہش مند ہے تو وہ لازماً ندامت سے دوچار ہوگا اور اس کے

لیے ضروری ہے کہ اس گناہ سے توبہ کرے اور جو کچھ کر چکا ہے اس کے عذاب سے بچنے کے لیے خدا سے مغفرت چاہے۔

گناہوں کے تباہ کن اثرات کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک اور راہ بھی رکھی ہے جسے کفارہ کہتے ہیں۔ شریعت نے بعض گناہوں کے لیے بعض معین کفارے بتائے ہیں۔ مثلاً جو شخص بغیر عذر شرعی کے رمضان کا کوئی روزہ رکھ کر توڑ ڈالے‘ اس کا کفارہ یہ ہے کہ مسلسل ساٹھ روزے رکھے۔ ایسے ہی بعض دوسرے گناہوں کے بھی مخصوص کفارے بتا دیے گئے‘ جو کبھی محتاجوں کو کھانا کھلانے کی شکل میں ادا ہوتے ہیں‘ کبھی انہیں کپڑے پہنانے کی شکل میں‘ کبھی روزے رکھنے کی شکل میں‘ کبھی غلام آزاد کرنے کی شکل میں‘ وغیرہ وغیرہ۔ کفارہ ادا کر دینے کا نفسیاتی اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان دوبارہ اس خرابی کا ارتکاب کرتے ہوئے جھجکتا ہے۔ معین کفاروں کے علاوہ ایک عام بات یہ بتا دی گئی ہے کہ اگر کوئی خرابی ہو جائے تو اس کے بعد کوئی اچھائی کر لو۔ وہ اچھائی اس خرابی کو مٹا دے گی۔ سورہ ہود‘ آیت ۱۱۴ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

...... اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ ”درحقیقت نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔“

حضرت ابوذرؓ اور حضرت معاذؓ بن جبل سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم جہاں بھی ہو اللہ سے ڈرتے رہو اور گناہ کے بعد نیکی کر لیا کرو۔ وہ اسے مٹا دیتی ہے اور لوگوں کے ساتھ اچھے خلق سے پیش آیا کرو۔ (ترمذی)

حضرت علیؓ فرماتے ہیں: مصیبت زدہ کی فریاد رسی اور کسی مبتلائے رنج کی تکلیف کو دور کرنا بڑے گناہوں کے کفاروں میں سے ہے۔“

حضرت شقیق بلخیؒ فرماتے ہیں: ”زبردست گناہوں کا کفارہ زیردستوں کی امداد اور درماندگان کی دستگیری ہے۔“

* * *

۳۔ ضبطِ نفس

تزکیۂ نفس کا اہم ترین مرحلہ یہ ضبطِ نفس ہی ہے یعنی اپنے دل اور دل میں پیدا ہونے والی خواہشات اور ان خواہشات کو پورا کرنے والے اعضاء و جوارح سب پر قابو حاصل ہو۔

ہر انسان کی کیفیت ہے کہ بعض عادات پختہ ہو چکی ہیں اور بعض اعمال کی سرے سے عادت ہی نہیں ہے۔ اب جو عادات پختہ ہو چکی ہیں' ان میں اچھی عادات بھی ہیں اور بری بھی۔ اور جن اعمال کی سرے سے عادت ہی نہیں ہے ان میں بھی برائی سے دو چار ہو جاتا ہے جس کی اسے عادت تو نہیں ہوتی مگر وہ اس کے لیے ایسی پر کشش ہو جاتی ہے کہ وہ اس کا ارتکاب کر گزرتا ہے۔ تزکیہ نفس کا تقاضا یہ ہے کہ پختہ عادات میں سے انہیں چھانٹ لیا جائے جو بری ہیں انہیں دور کرنے کی جدوجہد کی جائے اور جن اعمال کی عادت نہیں ان میں سے وہ چن لیے جائیں جو اچھے ہیں اور انہیں اختیار کرنے کی سعی کی جائے اور اپنے ایمان اور ارادے میں اتنی طاقت پیدا کی جائے کہ برائی کی کشش اپنا اثر کھو بیٹھے ----- یہ سب کام بہت مشکل ہیں۔ پختہ عادات کو دور کرنا اور نئی عادات اختیار کرنا اور برائی کی کشش سے بچ نکلنا' ان میں سے کوئی شے ممکن نہیں جب تک ضبطِ نفس سے کام نہ لیا جائے۔ خصوصاً بری عادات تو ایک ایسی چیز ہیں جو انسان کو بہت حد تک بے بس کر کے رکھ دیتی ہیں۔

حضرت علیؓ کا ارشاد ہے کہ: ''عادت پر غالب آنا فضیلت کا کمال ہے۔''

صوفیاء کے ہاں مختلف سلسلے قائم ہیں، جن میں ایک سلسلہ نقشبندیہ ہے۔ ایک دفعہ کسی نے مولانا اشرف علی تھانویؒ سے پوچھا کہ نقشبندیہ سلسلے میں سلوک طے کرنے کا کیا مطلب ہے۔ آپ نے فرمایا: ''انسان کے اندر اچھے خصائل بھی ہیں اور برے بھی، اور حکم ہے کہ اچھے خصائل کو اختیار کرو اور برے خصائل سے بچو۔ اچھے خصائل کے حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان پر اس قدر عمل کرو کہ کرتے کرتے اس کے عادی ہو جاؤ۔ مثلاً صبر کی جگہ صبر اور شکر کی جگہ شکر، غرض ہر موقع پر اچھے خصائل پر عمل ہونے لگے اور اس کی اتنی مشق ہو کہ طبیعت میں رچ جائے اور فطرتِ ثانیہ بن جائے۔ اب رہے برے خصائل یعنی اخلاقِ ذمیمہ، تو ان سے بچے کیونکہ ان پر عمل نہ کرنے کی سخت تاکید ہے۔ دل میں برے خصائل کا تقاضا ہو تو ہو مگر ان پر عمل ہرگز نہ کرے۔ عمل نہ کرنا گو ادنیٰ درجہ ہے مگر نجات کے لیے کافی ہے۔ کمال کا درجہ تو یہی ہے کہ برے خصائل پر نہ صرف یہ کہ عمل نہ کرے بلکہ ان کے خلاف عمل کرے اور بہ جبر اپنے کو اس کا عادی بنائے۔ جیسے کسی کی اچھی حالت کو دیکھ کر یا کسی کے جاہ و منصب کی خبر سن کر دل میں حسد کی آگ بھڑک اٹھے، تو اس صورت میں اگر صرف یہ کرے کہ حسد کے مقتضاء پر عمل نہ کرے تو یہ نجات کے لیے کافی ہے، مگر کمال کا درجہ حاصل کرنے کے لیے قدم آگے بڑھانا ہوگا۔ مثلاً جس شخص سے حسد کیا جا رہا ہے، اس کے متعلق دل میں تقاضا تو ہو رہا ہے کہ اس کا جاہ و منصب، مال و دولت وغیرہ چھن جائے اور وہ مفلس قلاش، اور ذلیل ہو جائے مگر بہ جبر ان جذبات کے خلاف کرنا ہوگا۔ یعنی اس شخص کے جاہ و منصب اور دولت و ثروت کے برقرار رہنے کی دعا اور تدابیر کرنی ہوں گی، اور اگر اس شخص میں کوئی عیب ایسا ہے جس کے ظاہر کر دینے سے اس کی ذلت و رسوائی ہوگی اور اس کا جاہ و منصب بھی چھن جائے گا اور اس عیب کو ظاہر کرنے پر قدرت بھی ہے تو اس عیب کو ظاہر نہیں کرنا ہوگا بلکہ اچھی طرح چھپانا ہوگا۔ بس یہی مطلب ہے سلوک طے کرنے کا۔''

جو کچھ حکیم الامت نے سلوک طے کرنے کے سلسلے میں فرمایا ہے اسی کو ضبطِ نفس کے سلسلے میں آزما لیجیے۔ جب کسی برے کام کی خواہش دل میں زور پکڑے تو ایک تو یہ ہے کہ اس خواہش کو پورا نہ کیا جائے اور دوسرے یہ کہ ایک قدم اور آگے بڑھ کر اس کے خلاف کرنے کی کوشش کی جائے۔ مثال کے طور پر فرض کر لیجیے کہ کسی نے ہمارے ساتھ زیادتی کی۔ اب ایک تو یہ ہے کہ ہم اسے معاف کر دیں اور دوسرا یہ کہ نہ صرف اسے معاف کریں بلکہ اور زیادہ فراخ حوصلگی سے کام لیتے ہوئے اس پر احسان بھی کریں۔ یہ دوسرا قدم پہلے قدم کو نسبتاً آسان کر دے گا۔

ویسے یہ آسانی نسبتاً ہی ہو گی فی نفسہٖ نہیں ہو گی، کیونکہ لفظ ضبطِ نفس کو زبان سے ادا کر لینا تو آسان ہے مگر نفس کو عملاً نظم اور ضبط کے اندر لانا بے انتہا مشکل کام ہے۔ کسی بری عادت کو جڑ سے اکھاڑنا ہو یا کسی اچھی عادت کو پیدا کرنا ہو یا نفس کو کسی نئے گناہ سے بچانا ہو، ہر صورت میں دل پر بے انتہا جبر کرنا پڑتا ہے جس سے لازماً بہت تکلیف ہوتی ہے، مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس عالمِ آب و گل میں رہتے ہوئے زندگی کے جس پہلو میں بھی انسان کوئی اچھائی حاصل کرنا چاہے، تکلیف اٹھائے بغیر حاصل نہیں ہوا کرتی۔ یہ واضح ہو چکا ہے کہ گناہ نام ہی ان اعمال کا ہے جو انسانیت کے لیے مضر ہیں۔ اب جب ہم دل پر جبر کر کے اسے اس کی مرضی کے خلاف چلا رہے ہوتے ہیں تو بظاہر تو ہم اسے مشقت اور تکلیف میں مبتلا کر رہے ہوتے ہیں مگر درحقیقت ہم اسے اس مشقت سے بہت زیادہ مشقت دینے والے انجام سے بچا رہے ہوتے ہیں۔

مفتی محمد حسن صاحبؒ فرماتے ہیں: ”نفس کو لگام دے کر رکھنا چاہیے۔ اس کو گناہ کی ذلت سے آشنا نہ ہونے دیں۔ ہمت کر کے اپنے آپ کو گناہ سے روکیں۔ اگرچہ نفس کو لگام دینے سے مشقت ہوتی ہے۔ اندر سے تقاضا ہوتا ہے گناہ کرنے کا، مگر گناہ کرنے سے

انسان اس سے زیادہ اور بڑی مشقت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔"

حضرت فضالہؓ بن عبید سے روایت ہے کہ میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا۔ "مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرے۔" (ترمذی)

یہ نفس کے ساتھ جہاد کرنا کیا ہے؟ یہی کہ جب نفس کوئی ایسا کام کرنا چاہے جو خدا تعالیٰ کی رضا کے خلاف ہو تو اسے سختی سے روکا جائے اور پوری کوشش کی جائے کہ وہ گناہ کی راہ پر چلنے نہ پائے۔

نفس کے ساتھ جہاد کرنے کی اہمیت ظاہر کرتے ہوئے حضرت ابوبکر صدیقؓ فرماتے ہیں:

"کافروں کے ساتھ جہاد کرنا چھوٹا جہاد ہے مگر نفس کے ساتھ جہاد کرنا بڑا جہاد ہے۔"

نفس کے خلاف جہاد کرنا وہی جدوجہد ہے جو ہم اپنے آپ کو برائیوں سے بچانے اور بھلائیوں کا عادی بنانے کے لیے کرتے ہیں۔

جناب ابو محمد مرتعشؒ سے کسی شخص کی کرامت بیان کی گئی کہ وہ تو ہوا میں اڑ لیتا ہے۔ اس پر انہوں نے فرمایا کہ یہ کوئی کمال نہیں ہے۔ کمال تو یہ ہے کہ انسان ہوائے نفس کی مخالفت کرے۔ یہ ہوا میں اڑنے سے کہیں زیادہ افضل ہے۔

مشہور تابعی حضرت سعید بن مسیبؒ رات گئے تہجد کا ارادہ کرتے تو اپنے نفس کو مخاطب کر کے فرماتے: "اے برائیوں اور بدیوں کے سر چشمے اٹھ۔ میں تجھے اس اونٹ کی طرح خستہ کر کے چھوڑوں گا جو خستگی اور درماندگی کے باعث چلنے میں لڑکھڑاتا ہے۔"

الاخوان المسلمون کے بانی جناب حسن البناء شہیدؒ اپنے ساتھیوں کو ہدایات دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

”اپنے نفس کے ساتھ اتنا مجاہدہ کیجئے کہ اسے مطیع کرنا آسان ہو جائے۔ نگاہوں کو جھکا کر رکھیے، توجہ پر کنٹرول کیجئے۔ نفسانی خواہشات کا مقابلہ کیجئے۔ انہیں ہمیشہ حلال و پاکیزہ کی رغبت دلایئے اور ان کے اور حرام کاموں کے درمیان حائل ہو جایئے۔“

شراب، ہر نشہ آور اور بے خود کر دینے والی چیز اور اسی قسم کے دوسرے تمام مشروبات سے مکمل طور پر پرہیز کیجئے۔ ان سے پوری طرح بچئے۔

برے ساتھیوں، غیر صالح دوستوں اور نافرمانی اور گناہ کے مقامات سے دور رہیے۔

فواحش کے قریب جانے کے بجائے ان کا مقابلہ کیجئے اور عیش و عشرت اور سہل پسندی ہرگز اختیار نہ کیجئے۔“

ضبطِ نفس کے سلسلے میں ایک اور اہم بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ برائی سے بچنا تو ویسے ہی بہت ضروری ہے مگر جن برائیوں کو ہم دوسروں میں دیکھتے ہیں، تو ان پر ملامت کرتے ہیں۔ ان سے بچنے میں تو ہمیں اور زیادہ کوشش کرنی چاہیے۔ یہ کیسی مضحکہ خیز بات ہے کہ وہی شے جب دوسروں میں دیکھی جائے تو اسے نفرت انگیز قرار دیا جائے مگر خود کو اس سے بچانے کے لیے کوئی سعی نہ کی جائے۔

بہت سے لوگ ایسے دیکھے جاتے ہیں جو واویلا مچاتے رہتے ہیں کہ غلط قسم کی سفارشیں نااہلوں کو فوائد پہنچا رہی ہیں اور حقداروں کے حقوق تلف کر رہی ہیں، مگر ان کا اپنا حال یہ ہوتا ہے کہ جب کوئی ضرورت آ پڑتی ہے تو وہ خود بھی اسی سفارش کا دروازہ کھٹکھٹا کر اپنا کام نکلوا لیتے ہیں۔ اس وقت وہ یہ نہیں سوچتے کہ اب بھی تو کسی حقدار کا حق تلف ہوا ہی ہوگا۔

اسی طرح کئی ”پرہیزگار“ ایسے ہیں جو راشی افسروں پر لعنتیں بھیجتے نہیں تھکتے، مگر

اپنی نااہل اولاد کو ان کے حق سے زیادہ دلوانے کے لیے یا انہیں کسی جرم کی سزا سے بچانے کی خاطر وہ خود بے تکلف رشوتیں دیتے ہیں اور اس بات کو بالکل بھول جاتے ہیں کہ راشی افسر آخر اسی معاشرے میں خرابی پیدا کر سکتے ہیں جہاں رشوت دینے والے موجود ہوں۔

بہت سے "انصاف پسند" ایسے دیکھنے میں آتے ہیں کہ جب کوئی صاحب اقتدار اپنے سرکاری اقتدار سے کام لیتے ہوئے اپنے عزیزوں، رشتہ داروں کو بے انصافانہ طور پر عہدے بانٹنا شروع کرتا ہے تو وہ اس کے طرزِ عمل کو ملک و قوم کے لیے تباہی کا پیغام قرار دیتے ہیں اور اسے "کنبہ پروری" کے جرم کا مجرم گردانتے ہیں۔ لیکن اگر حالات کی تبدیلی اقتدار کا کوئی حصہ انہیں بھی بہم پہنچا دے تو پھر وہ بھی بے تکلف اسی کنبہ پروری کو اختیار کر لیتے ہیں، مگر اس کا نام "صلہ رحمی" رکھ کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم کوئی برائی نہیں کر رہے۔ حالانکہ یہ ٹھیک وہی "کنبہ پروری" ہوتی ہے جس کی وہ پہلے مذمت کرتے رہے ہوتے ہیں۔

اس سلسلے میں حضرت علیؓ کا ایک فرمان بڑا دل پذیر ہے۔ آپؓ فرماتے ہیں:

"سب سے زیادہ احمق وہ شخص ہے جو دوسروں کی ذلیل صفات کو تو برا جانے مگر خود ان پر جما ہوا ہو۔"

نفس کو برائیوں سے روکنا اور بھلائیوں پر آمادہ کرنا وہ کام ہے جس کی پوری مشکلات کا اندازہ اسی وقت ہوتا ہے جب انسان عملاً اس جدوجہد میں مصروف ہو اور ضروری ہے کہ اس جدوجہد کو شروع کرتے ہی یہ ذہن نشین کر لیا جائے کہ جو کام کرنے چلے ہیں، وہ بہت مشکل ہے۔ جب ہم مشکل کام کو مشکل سمجھ کر شروع کریں گے تو ایک تو ہم ذہنی طور پر مشکلات سہنے کے لیے تیار ہوں گے اور دوسرے وہ بندوبست کرنے کی کوشش کریں گے جو مشکلات کو کچھ آسان کر سکے۔ لیکن اگر ہم نادانوں کی طرح ایک مشکل کام کو آسان

سمجھتے ہوئے اس میں کود پڑے تو پھر جب مشکلات آئیں گی تو ہمارے ذہنی طور پر ان کے لیے تیار نہ ہونے کے باعث وہ کام ہمیں محال لگنا شروع ہو جائے گا اور عجب نہیں کہ ہم ہمت ہی ہار بیٹھیں۔

ضبطِ نفس کی مشکلات کے سلسلے میں مولانا حالی کے چند اشعار بڑے مؤثر ہیں۔ آپ فرماتے ہیں:

ہم سمجھتے تھے کہ نفسِ دوں ہمارے بس میں ہے　　گر کبھی حملے پہ اس کے غالب آجاتے تھے ہم
پر جو دیکھا غور سے وہ بھبکیاں تھیں نفس کی　　جن کو نادانی سے حملے اس کے ٹھہراتے تھے ہم
جب کیا حملہ دیے سب عقل نے ہتھیار ڈال　　زورِ بازو پر ہمیشہ جس کے اتراتے تھے ہم

شاعر کہتا ہے کہ چھوٹی موٹی خواہشاتِ نفس کو دبا کر ہم یہ سمجھ بیٹھے کہ گویا ہم نے پورے طور پر نفس پر قابو پا لیا ہے۔ حالانکہ وہ خواہشات بس کمزور کمزور سی خواہشات ہی تھیں۔ پھر جب نفس نے اپنی پوری طاقت سے ہم پر حملہ کیا اور زوردار خواہشات نے ہمیں آگھیرا تو ہماری عقل چکرا کر رہ گئی اور ہم نفس کا ذرا بھی مقابلہ نہ کر سکے۔

واضح رہے کہ اچھائیاں ضروری نہیں کہ سب کی سب ہمارے مزاج سے مناسبت ہی رکھتی ہوں۔ عین ممکن ہے کہ اپنی فطرت اور مزاج کے لحاظ سے ہم برائیوں کی طرف زیادہ میلان رکھتے ہوں، بہ نسبت نیکیوں کے۔ لہٰذا ان برائیوں کی طرف میلان رکھنے والے مزاج کو گھیر گھار کر نیکیوں کی طرف لانا کوئی ایسا کام نہیں جسے ٹھنڈے آرام آرام سے کیا جا سکے۔ لہٰذا شروع ہی میں دل کو سمجھا دینا چاہیے کہ شیطان سے مقابلہ ہوگا اور ضرور ہوگا اور سخت ہوگا۔ پس اے دل، تم اس مقابلے کے لیے تیار ہو جاؤ۔

انسان شیطان نہیں ہے کہ اس میں صرف برائی ہی برائی ہو، تاہم وہ فرشتہ بھی نہیں ہے کہ اس میں صرف اچھائی ہی اچھائی ہو، نہ وہ بے جان چیز ہے کہ اس میں جذبات و

حسیات موجود ہی نہ ہوں۔ وہ تو انسان ہے، آدمؑ کا بیٹا، جس میں برائی اور اچھائی دونوں کے مادے موجود ہیں اور بے شمار جذبات و حسیات بھی ہیں۔ عام حالات میں بھی برائی کا مادہ اس پر غالب آنے کی کوشش کرتا رہتا ہے، مگر جب وہ کوئی نیک کام شروع کرے، اس وقت تو شیطان خصوصی طور پر چست و ہوشیار ہو کر اس کے برائی کے مادے کو ابھارنے کی سعی میں مشغول ہو جاتا ہے۔ اب یہ انسان کا اپنا کام ہے کہ وہ اسے ابھرنے نہ دے اور اس کے خلاف جدوجہد جاری رکھے تاکہ وہ اس کے نیکی کے پروگرام میں حارج نہ ہو سکے۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ کی خدمت میں کسی شخص نے عرض کیا کہ کوئی ایسی صورت ہو کہ نفس کے اندر گناہ کا تقاضا ہی پیدا نہ ہو۔ اس پر انہوں نے فرمایا کہ: ”کیا تم دیوار بننا چاہتے ہو؟ تقاضا تو پیدا ہو گا مگر تمہارا کام اس پر عمل نہ کرنا ہے۔ چند دفعہ کے مقابلے اور نفس کے خلاف کرنے سے نفس خود بخود ہی ڈھیلا پڑ جاتا ہے اور کمزور ہو جاتا ہے۔“

اس زندگی میں اللہ تعالیٰ نے جہاں مشکلات پیدا کی ہیں وہاں ساتھ انہیں آسان کرنے کے اسباب بھی پیدا کر دیئے ہیں۔ ضبطِ نفس کی مہم کا بھی یہی حال ہے۔ اگر ذیل کے چند اصولوں کو پیشِ نظر رکھا جائے گا، تو توقع ہے کہ یہ مشکل کام نسبتاً آسان ہو جائے۔

ا۔ دل کی اصلاح: برائی ہو یا اچھائی، ان کا اصل سرچشمہ انسانی دل ہے۔ نیکی ہو یا بدی پہلے اسی میں پیدا ہوتی ہے، اس کے بعد وہ اعضا و جوارح کو عمل میں لاتی ہے۔ لہٰذا تزکیۂ نفس کے سلسلے میں سب سے پہلا عملی کام دل بدلانا ہے۔ دل میں نیکی کی خواہش، محبت اور احترام پیدا کرنا ہے۔

حضرت نعمانؓ بن بشیر حضورؐ سے روایت بیان کرتے ہیں، جس کے آخر میں حضورؐ نے دل کی اہمیت بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

”......آگاہ رہو کہ جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے، جب وہ درست ہوتا ہے تو سارا جسم درست رہتا ہے اور جب وہ بگڑ جاتا ہے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے۔ آگاہ رہو کہ وہ (ٹکڑا) دل ہے۔“ (بخاری و مسلم)

ضبطِ نفس کے سلسلے میں سب سے پہلے دل کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے کہ دل میں خدا، رسولؐ کی محبت، آخرت کی جوابدہی کا احساس اور نیکی کا احترام بیٹھے۔ دل کو پورا یقین ہو جائے کہ نیکی ہی میں نجات ہے، دل کا ایمان ہو کہ برائی مجھے رسوائی اور تکلیف کے سوا کچھ نہیں دے گی۔ دل ہی تو وہ اصل شے ہے جو برائی کی طرف کشش محسوس کرتا ہے۔ اس کو پاکی کی تربیت دے کر درست کریں تاکہ وہ پھر ادھر زیادہ کشش محسوس ہی نہ کرے۔

بعض لوگ ایسے دیکھے جاتے ہیں کہ جو دل کی حالت سے بے خبر رہتے ہیں اور ظاہر طور پر ایسے اعمال اختیار کرنے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں جنہیں اعمالِ صالحہ کہا جاتا ہے۔ مگر یہ بے بنیاد عمارت بدلے ہوئے حالات کے جھکڑوں کا ذرا بھی مقابلہ نہیں کر سکتی اور کسی وقت دھڑام سے نیچے آ رہتی ہے۔ جس کا دل ایمان و یقین سے بھرا ہوا ہے اس کا تھوڑا عمل بھی زیادہ خیر و برکت کا باعث بن جاتا ہے کیونکہ اس میں ثبات ہوتا ہے۔ مگر جہاں دل ہی بے یقینی میں مبتلا ہو وہاں اوپرے طور پر چاہے نیکی کی راہ میں کتنی ہی سرگرمی کیوں نہ دکھائی جا رہی ہو اس سرگرمی کو پائیداری حاصل نہیں ہوتی۔ کیا پتہ کس وقت وہ بے یقینی اور ایمان کی کمزوری اسے ان سرگرمیوں سے ہٹا کر پھر دوسری راہوں کی طرف پھیر لے جائے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”اللہ تعالیٰ تمہارے جسموں کو نہیں دیکھتا اور نہ تمہاری صورتوں کو دیکھتا ہے بلکہ وہ تو تمہارے دلوں

کو دیکھتا ہے۔" (مسلم)

لہٰذا جس برائی کو بھی دور کرنا مطلوب ہے، دل میں اس کی نفرت بٹھائیں اور جس نیکی کو بھی اختیار کرنا مقصود ہے، دل میں اس کی محبت اور اس کی اہمیت کا احساس گہرا کریں۔ دل میں ناپاک خواہشوں کا پیدا ہو جانا تقاضائے بشریت ہے مگر ان خواہشوں کا دل میں آرام سے بیٹھے رہنا، پھلنا پھولنا، ہر طرف اپنے پنجے گاڑتے چلے جانا، یہ انسان کی اپنی نالائقی اور غفلت ہے۔ بری خواہشات تو پیدا ہوں گی ہی، مگر انسان کا فرض ہے کہ دل کو ان سے پاک کرنے کی سعی جاری رکھے تاکہ وہ وہاں جڑیں مضبوط نہ کر سکیں۔ امام جعفر صادقؒ دل کی پاکی کی اہمیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"حقیقی تقویٰ یہ ہے کہ جو کچھ تیرے دل کے اندر ہے اگر تو اسے کھلے ہوئے طباق کے اندر رکھ دے اور اس کو لے کر بازار کا گشت لگائے تو اس میں ایک چیز بھی ایسی نہ ہو جس کو اس طرح آشکارا کرنے میں تجھے شرم محسوس ہو یا کوئی اس پر حرف گیری، نکتہ چینی یا انگشت نمائی کر سکے۔"

بہت ممکن ہے کہ بعض لوگ یوں سوچتے ہوں کہ یہ معیار صرف بڑے بڑے متقی لوگوں اور اولیاء اللہؒ ہی کے لیے ممکن ہے۔ ہم عام انسان اس تک نہیں پہنچ سکتے، مگر یہ شے ذہن نشین رہنی چاہیے کہ نیکی کے معاملے میں معیار بہرحال بلند ہی ہونا چاہیے تاکہ اگر انسان اس تک نہ بھی پہنچ سکے تو اس کے قریب قریب پہنچنے کی صورت میں بھی وہ نیکوکاری ہی کے میدان میں ہو۔

۲۔ فوائد کا تصور: ضبطِ نفس کو آسان کرنے والی دوسری شے یہ ہے کہ نیک اعمال سے حاصل ہونے والے اخروی فوائد کو وقتاً فوقتاً ذہن میں تازہ کیا جاتا رہے اور نفس کو زیر کرنے میں جو تکلیف ہو اسے برداشت کرنے کے اجر کا تصور کر لیا جائے۔ یہ تصور دل کو نیکی کی راہ پر

ڈالنے کے سلسلے میں حیرت انگیز اثرات پیدا کرتا ہے۔ ذرا خیال کیجئے کہ آخر اللہ تعالیٰ نے کلام پاک میں کیوں بار بار بہشت اور اس کی نعمتوں کا ذکر فرمایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان طبعی طور پر فلاح پسند واقع ہوا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اسے فوائد حاصل ہوں۔ ذرا خیال کیجئے کہ دنیوی زندگی میں فوائد حاصل کرنے کی خاطر ہم کیا کیا پاپڑ نہیں بیلتے۔ آڑے وقت کے لیے پس انداز کرنے کی خاطر، انسان کتنی مشقت کرتا اور تنگی سہتا ہے۔ حالانکہ ان مقاصد کا لازماً حاصل ہو ہی جانا ضروری نہیں ہوتا۔ چنانچہ ایمان و اخلاق کے معاملے میں بھی اگر انسان ذہن میں اس خیال کو تازہ رکھے کہ جتنی تکلیف اٹھائیں گے اتنے ہی انشاء اللہ زیادہ اجر کے مستحق ہوں گے۔ تو یہ شے ضبطِ نفس کو آسان کر دے گی۔

ایک صاحبِ دل بزرگ کا فرمان ہے: ”جب نفس میں گناہ کا تقاضا پیدا ہو تو سمجھ جاؤ کہ لوٹ کا وقت آ گیا ہے۔“

مطلب یہ ہے کہ اس تقاضے کو دبانے میں تکلیف ہوگی۔ یہ تکلیف اللہ کی راہ میں ہوگی۔ لہٰذا یہ اجر کا باعث بنے گی--- اس طرح نیکوکار لوگ برائی کی خواہش کو بھی بھلائی حاصل کرنے کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔

انسان اپنی غفلت کو جھٹک کر ذرا مستقبل پر غور و فکر کرنے کی طرف توجہ دے تو اسے احساس ہو جائے کہ آگے کتنا لمبا سفر درپیش ہے۔ پہلے موت کا مرحلہ، جو خدا جانے کتنا تکلیف دہ ہوگا۔ پھر برزخ کی زندگی، جو خدا معلوم کتنی لمبی ہوگی۔ پھر قیامت کے احوال، انسانی اعمال کا تولا جانا، انسان کا پل صراط سے گزرنا، اس کی خوش بختی یا بدبختی کا فیصلہ ہونا، پھر کوئی دائمی ٹھکانہ، جو خدا معلوم آرام دہ ہوگا یا اذیت رساں--- انسان ان لازمی طور پر آنے والے حالات و واقعات کو ذہن میں بار بار تازہ کرتا رہے اور یہ حقیقت ذہن نشین کرے کہ نیک اعمالی اور خدا کی راہ میں اٹھائی ہوئی مشقت ان مرحلوں میں کتنی مددگار ہوگی، تو ضبط

نفس کی راہیں اس کے لیے خود بخود ہی آسان ہوتی چلی جائیں گی۔ حضورؐ نے واضح الفاظ میں فرمایا ہوا ہے کہ مومن کی راہ میں جو مشقت بھی آئے اور چھوٹی سے چھوٹی تکلیف، جسے وہ برداشت کرے، اس کے گناہوں کو جھاڑنے کا باعث بن جاتی ہے۔

حضرت ابو سعید خدریؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ مسلمان کو جو کچھ تکان، مرض، فکر، حزن، تکلیف اور غم لاحق ہوتا ہے، حتیٰ کہ ایک کانٹا لگ جانے سے بھی اسے جو تکلیف ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ اس کے بدلے میں اس کے گناہ معاف فرما دیتا ہے۔ (بخاری، مسلم)

جب صورت یہ ہے تو پھر وہ تکلیف جو دل کو برائی سے روکنے کے سلسلے میں ہوتی ہے، جو اجر اپنے ساتھ لاتی ہے وہ یقیناً اس قابل ہے کہ اسے حاصل کرنے کی خاطر دل پر جبر کرنے کی تکلیف کو بخوشی برداشت کیا جائے۔ منزل اگر خوشگوار ہو تو اس کا تصور سفر کی مشقتوں کو زیادہ محسوس نہیں ہونے دے گا۔ کسی نکتے پر توجہ مرکوز کر کے کچھ دیر غور و فکر کرتے رہنا اعمال پر بڑا خوشگوار اثر ڈالتا ہے۔ اپنے دل کو قابو میں رکھنے سے انسان بے شمار دینی اور دنیوی ہلاکتوں سے بچ جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کر کے اس امن و سکون کو حاصل کر لیتا ہے جس کے بعد کسی قسم کی بدامنی اور بے سکونی کا وجود نہیں ہے--- لہٰذا اگر ہم اس ابدی راحت کو وقتاً فوقتاً تصور میں لاتے رہیں تو ضبطِ نفس کی راہ کی مشکلات صرف اس تصور ہی سے بہت حد تک آسان ہوتی چلی جائیں گی۔

استقامت اور مداومت عمل: ضبط نفس کو آسان بنانے والی تیسری چیز استقامت اور مداومتِ عمل ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ جو نیک کام شروع کیا جائے اس کے سلسلے میں پھر سستی برتنے اور ناغہ کرنے سے پرہیز کی جائے۔ اور جس برے کام کو چھوڑ دیا جائے، پوری پوری سعی کی جائے کہ پھر اس کا ارتکاب نہ ہونے پائے۔

ایک صاحب کو بدقسمتی سے شراب نوشی کی عادت پڑ چکی تھی۔ بیوی کی مسلسل کوششوں کے باعث آخر وہ اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ اس لعنت کو چھوڑ دیں گے۔ چند ہفتے ایسے گزرے جن میں انہوں نے اپنی توبہ کو پورے طور قائم رکھا اور ترکِ مےنوشی کے ابتدائی دنوں کی تکلیف بھی برداشت کر لی۔ اب توقع تو یہ تھی کہ ہر آنے والا دن ان کے لیے اپنی توبہ پر قائم رہنے کے عمل کو آسان تر بناتا جائے گا۔ مگر اس کنبے کی بے نصیبی کہ انہیں دنوں ان کا کوئی ہم نوالہ، ہم پیالہ دوست باہر سے آدھمکا اور پرانی دوستی کے واسطے دے دے کر انہیں مجبور کیا کہ بس ایک دفعہ اس کے ساتھ بیٹھ کر مےنوشی کر لیں اور اس کے بعد پھر پکی توبہ کر لیں۔ مگر اس ایک دفعہ کے بعد پھر پکی تو کیا کچی توبہ کی بھی نوبت نہ آئی۔ کیونکہ اس توبہ شکنی نے انہیں پھر اس قابل نہ چھوڑا کہ دوبارہ عزم و ارادہ سے کام لے سکیں۔ شراب چھوڑنے سے لے کر توبہ توڑنے تک جتنی تکلیف انہوں نے برداشت کی تھی، سب ضائع ہو گئی اور وہ ازسرِ نو اس قبیح عادت کے چنگل میں گرفتار ہو گئے۔ حالانکہ جس طرح ابتدائی تکلیف کا دور بخیر و خوبی گزر چکا تھا، اگر وہ اپنی بات پر قائم رہتے اور اس شیطان صفت دوست کے ورغلانے میں نہ آتے تو وہ اس شیطانی عمل پر فتح پا ہی چکے تھے، لیکن استقامت کی کمی نے اُن کا کیا دھرا ضائع کر دیا۔

حضرت جنید بغدادیؒ کے متعلق ایک حکایت بیان کی جاتی ہے کہ ایک دفعہ اُنہوں نے ایک شخص کو سُولی پر لٹکا ہوا دیکھا اور پوچھا کہ اس نے کیا جرم کیا تھا۔ لوگوں نے بتایا کہ یہ ڈاکو ہے۔ اول چوری میں اس کا داہنا ہاتھ کاٹا گیا، مگر پھر بھی یہ چوری سے باز نہ آیا تو بایاں پاؤں کاٹا گیا۔ پھر بھی باز نہ آیا تو سُولی کی نوبت آئی۔

حضرت جنیدؒ یہ سُن کر آگے بڑھے اور اس کے پاؤں کو آنکھوں سے لگایا اور بوسہ دیا۔ لوگوں نے حیرت سے پوچھا کہ یہ کیا بات ہے۔ حضرت جنیدؒ نے فرمایا کہ میں نے اس

استقلال - ۱

کے پاؤں کو بوسہ نہیں دیا بلکہ اس کے استقلال اور استقامت کے وصف کو بوسہ دیا ہے جو اس کے نفس میں تھا، اگرچہ اس بیوقوف نے اسے شر و معصیت میں استعمال کیا اور اس کی بجا طور پر سزا پائی۔ مگر ہم یہ سوچتے ہیں کہ کاش ہمیں بھی نیکی اور طاعت کے معاملے میں ایسی ہی استقامت نصیب ہو جائے۔

عزم بالجزم میں اللہ تعالیٰ نے بڑی برکت اور طاقت رکھی ہوئی ہے۔ جو شخص اپنی اچھی بات پر اڑ جانے کی قوت رکھتا ہو، مشکلات خود بخود اس کے آگے سر جھکا دیتی ہیں۔ نفس کا بہت ساز ور تو اسی وقت ٹوٹ جاتا ہے جب انسان عزم کر لیتا ہے۔ پھر اس کے بعد اگر وہ نفس کے چند حملوں کو پسپا کر لے تو بقول حکیم الامت ؒ:

''چند دفعہ کے مقابلے اور نفس کے خلاف کرنے سے نفس خود بخود ہی ڈھیلا پڑ جاتا ہے اور کمزور ہو جاتا ہے۔''

یہی حالت اچھی عادات کے ڈالنے کی ہے۔ جو نیک کام شروع کیا ہے اس پر مداومت کریں۔ حتیٰ الامکان اس میں ناغہ نہ ہونے دیں۔ نہ اس کے خلاف ہونے دیں۔ اس مداومت کی خیر و برکت سے نفس بہت جلد اس نیکی سے مانوس ہو جائے گا۔ مثال کے طور پر کسی شخص نے اپنے آپ کو نماز کا پابند بنانے کا عزم کیا ہے۔ اب نماز کی پابندی ایک ایسی شے ہے کہ اگر بچپن سے اس کا عادی نہیں بنایا گیا تو بڑے ہو کر اس کا پابند ہونا بے انتہا مشکل ہوتا ہے۔ دن میں پانچ مرتبہ آرام یا کام یا کسی دلچسپ گفتگو کو چھوڑ کر اُٹھنا اور وضو کر کے نماز ادا کرنا اُن طبائع کو بہت گراں گزرتا ہے جو سہل پسند ہوں اور جنہیں شروع سے اس بات کی عادت نہ ڈالی گئی ہو کہ اپنے روزمرہ کے کاموں کو نماز پنجگانہ کی اوقات کی روشنی میں منضبط کریں۔ مشاہدہ اور تجربہ بتاتا ہے کہ ابتدائی چند دن تو انسان جوش و خروش کے باعث اتنی تکلیف محسوس نہیں بھی کرتا، مگر جب جوش ذرا مدھم پڑتا ہے تو پھر یہ پانچ وقت کی

پابندی زیادہ مشکل معلوم ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ جیسے ہی نماز کا وقت آتا ہے، دل حیلے بہانے ڈھونڈنے شروع کر دیتا ہے۔ کبھی کوئی اس وقت کیا جانے والا کام ازحد ضروری محسوس ہونے لگتا ہے، کبھی کوئی پاس آ کر بیٹھا ہوا مہمان کافی عذر معلوم ہونے لگتا ہے، کبھی کوئی اُس وقت پڑھی جانے والی کتاب ضرورت سے زیادہ دلچسپ لگنی شروع ہو جاتی ہے، کبھی اردگرد کوئی ایسی دل پسند گفتگو ہو رہی ہوتی ہے جسے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ کبھی شیطان دل میں وسوسے پیدا کرنے لگتا ہے کہ آخر اس نماز کا فائدہ کیا ہوگا جسے پڑھنے کو جی نہیں چاہ رہا۔ بسا اوقات ایسے ہوتا ہے کہ ابھی اُٹھتے ہیں، ابھی اُٹھتے ہیں، سوچتے سوچتے ہی وقت گزر جاتا ہے۔

یہی وہ فیصلہ کن وقت ہوتا ہے جب انسان یا تو اپنے نفس پر فتح پا لیتا ہے یا پھر اس سے بُری طرح مار کھا جاتا ہے۔ ایسے اوقات میں اگر تو اس نے اپنے اس نیک عمل پر مداومت برتی اور سب کاموں اور دلچسپیوں کو جھٹک کر اٹھ کھڑا ہوا اور جی کے چاہنے اور نہ چاہنے کو قطعی نظرانداز کر کے اپنے فرض کو ادا کر لیا تو اب اس کا حیلہ جو نفس اس کے مقابلے میں دن بدن کمزور ہوتا جائے گا، یہاں تک کہ نماز کی پابندی کی راہ میں کسی قسم کی کوئی رکاوٹ پیدا کرنے کے قابل نہیں رہے گا۔ لیکن اگر انسان بدقسمتی سے کمزوری کا شکار ہو گیا اور ایک نماز کا بھی ناغہ کر دیا تو اب نماز کی پابندی کی منزلِ مقصود اس سے اور بھی زیادہ دُور ہو جائے گی۔

جہاں تک اُن نیک اعمال کا تعلق ہے جو فرائض کی حیثیت رکھتے ہیں، ان میں مداومت نہ برتنا تو باقاعدہ گناہ ہے۔ جی چاہے یا نہ چاہے فرض تو ادا کرنا ہی ہوگا۔ جس عمل کو خدا نے لازمی کر دیا ہو، جی کی کیا اوقات ہے کہ اس میں اپنے چاہنے یا نہ چاہنے کا سوال اٹھائے۔ باقی رہے وہ نیک اعمال جو نوافل کی حیثیت رکھتے ہیں، تو ان میں بھی مداومت برتنا ازحد پسندیدہ ہے۔ کسی نیکی پر مداومت برتنا نفس کے زور کو توڑنے اور اس نیکی کی راہ

میں آنے والی مشقت کو گھٹانے بلکہ ختم کرنے کا ایک کامیاب نسخہ ہے۔ جو کام باقاعدگی اور پابندی کے ساتھ بار بار کیا جاتا رہے گا، وہ چاہے کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو، اس مداومت کی برکت سے آسان ہو کر رہے گا۔ مداومتِ عمل کی فضیلت اسی سے ظاہر ہے کہ خود حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر عمل کیے رکھا اور اس کی تعریف بھی فرمائی۔

حضرت عائشہؓ نے حضورؐ کے بارے میں ایک روایت بیان کی ہے جس کے آخر میں حضورؐ نے فرمایا ہے کہ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب عمل وہ ہے جس پر مداومت برتی جائے۔ اگرچہ وہ چھوٹا ہی ہو۔ (بخاری)

حضرت عبداللہؓ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ اے عبداللہؓ، فلاں کی طرح نہ ہو جانا کہ وہ (پہلے) رات کو عبادت کیا کرتا تھا، پھر اس نے رات کی عبادت چھوڑ دی۔ (نسائی)

برائی کو آغاز ہی سے دبا دینا: ضبطِ نفس کی مشکلات کو کم کرنے والی چوتھی شے یہ ہے کہ برائی کو زیادہ قوی ہی نہ ہونے دیا جائے کہ پھر اس کو دبانے میں نفس کے خلاف زیادہ جدوجہد کرنی پڑے۔ آخر ہر شے پہلے پیدا ہوتی ہے اور پھر پلتی بڑھتی ہے اور عام اصول یہی ہے کہ جب چیز پیدا ہوتی ہے تو حالتِ کمزوری میں ہوتی ہے۔ پھر جیسے جیسے وہ پلتی بڑھتی جاتی ہے، طاقت حاصل کرتی جاتی ہے۔ اگر وہ شے ایسی ہے جسے فنا کر دینے ہی میں انسانیت کا فائدہ ہے تو پھر عقل مندی یہی ہے کہ اس کی کمزوری کی حالت ہی میں اسے ختم کرنے کی کوشش کی جائے، ورنہ اگر وہ نشو و نما پاتی گئی تو جس تناسب سے اس کی طاقت بڑھے گی اسی تناسب سے اسے زیر کرنا مشکل ہوتا جائے گا۔ شیخ سعدیؒ کی گلستان میں ایک شعر۔

سرِ چشمہ شاید گرفتن بہ میل
چوں پُر شد نشاید گذشتن بہ پیل

(جب چشمہ پھوٹتا ہے تو اس کا منہ اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ ایک سلائی سے بھی اُسے بند کیا جا سکتا ہے، مگر جب وہ پُر ہو جاتا ہے تو پانی کی اتنی کثرت ہو جاتی ہے کہ ہاتھی کے اُوپر بیٹھ کر بھی اسے عبور نہیں کیا جا سکتا)

لہٰذا ضبطِ نفس کو آسان بنانے کے لیے اہم ترین چیز یہ ہے کہ نفس کو اتنا مشتعل ہی نہ ہونے دیا جائے کہ پھر اس پر قابو پانا مشکل ہو جائے۔

بسا اوقات ایسے ہوتا ہے کہ دل میں کسی کے خلاف غصہ تو ہوتا ہے مگر بس اتنا ہی ہوتا کہ ذرا ہمت سے کام لیں تو دبایا بھی جا سکتا ہے۔ اب اگر اس غصے کو اسی سٹیج پر روک لیں تو نفس کے خلاف کوئی غیر معمولی مجاہدہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوگی اور غُصے پر قابو حاصل ہو جائے گا۔ لیکن اگر ہم ایسا نہ کریں اور یہی چاہیں کہ اُس شخص کے سامنے غصے کا اظہار کر ہی دیں تو پھر اظہار کر دینے کے باعث باہمی خصومت اتنی بڑھ جائے گی اور دل کا غصہ بڑھتے بڑھتے طیش کی اس انتہا پر پہنچ جائے گا کہ اب اس پر قابو پانا ناممکن ہو جائے گا--- اس انتہا پر پہنچ کر پھر انسان اپنے نفس کے آگے عاجز و مجبور ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ سمجھتا بھی ہے کہ اس صورتِ حالات نے اُسے صرف نقصان ہی پہنچانا ہے، مگر نفس اس کے مقابلے میں اتنا طاقتور، ہو چکا ہوتا ہے کہ وہ اسے ''غیرت'' اور ''عزتِ نفس'' کے چکروں میں پھنسا کر اشتعال کی ٹیڑھی راہوں ہی پر چلاتا چلا جاتا ہے اور باہمی صلح صفائی اور درگذر کی صاف، کشادہ اور آرام دہ شاہراہ کی طرف نہیں آنے دیتا۔

اب اگر شروع ہی میں اُس تھوڑے سے غصے کو دبا لیا ہوتا اور معاملے کو اس حد تک خراب ہونے ہی نہ دیا ہوتا، تو بس تھوڑی ہی سی کوشش نفس کو زیر کر سکتی تھی۔

اسی مثال سے دوسری برائیوں کو قیاس کر لیجئے۔ ہمارے بچے ہمارے اپنے ہاتھوں میں پلتے بڑھتے ہیں۔ اگر شروع ہی سے انہیں اچھی عادات ڈالنے کی کوشش شروع

کر دیں تو نسبتاً تھوڑی محنت سے وہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے' لیکن اگر شروع میں بے توجہی برتتے رہیں' یہاں تک کہ جب وہ بعض بُری عادات کے عادی ہو چکے ہوں تو پھر اُن کی اصلاح کا کام شروع کریں' تو اب یہ معاملہ بے انتہا مشکل ہوگا اور یہ بھی بعید نہیں کہ اب انتہائی کوشش کر کے بھی ہم انہیں درست نہ کر سکیں۔

درخت جتنے پرانے ہو چکے ہوں اور اُن کی جڑیں جتنی مضبوط ہو چکی ہوں انہیں اکھاڑنا اتنا ہی زیادہ مشکل ہو جائے گا۔ حالانکہ یہی درخت جب نرم و نازک پودوں کی شکل میں تھے' تو انہیں تھوڑا سا زور لگا کر اکھاڑا جا سکتا تھا۔ یہی حال انسان کی عادات' میلانات اور جذبات کا ہے۔ ناپسندیدہ جذبات ابھی ابتدائی مراحل ہی میں ہوں تو انہیں روک لینا چاہیے کیونکہ جب وہ انتہائی مراحل میں داخل ہو گئے' تو پھر خطرہ یہی ہے کہ وہ ہمارے قابو میں آنے کے بجائے ہمیں کو اپنے قابو میں کر لیں گے۔

خرابیاں چاہے وہ ہوں جن کا تعلق کردار کی کمزوری سے ہے یا وہ ہوں جن کا تعلق چال چلن کی خرابی سے ہے یا وہ ہوں جن کا منبع حرص اور لالچ ہے' خرابی کی کوئی بھی قسم ہو' آخر وہ آغاز ہی میں تو انتہا پر بھی نہیں پہنچ جاتی' بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مضبوط ہوتی اور شدت پکڑتی ہے۔ بس اُسے اسی وقت پکڑ لینا چاہیے' جب وہ ابھی کمزوری کی حالت میں ہوتی ہے تاکہ نہ وہ طاقتور اور شدید ہو' نہ اسے دبانے کے لیے نفس کے خلاف کوئی غیر معمولی جدوجہد کرنی پڑے۔

چور' چوری کرتا رہتا ہے پھر کہیں جا کر پکا چور بنتا ہے۔ جوئے باز ایک مدت گزرنے کے بعد ہی پکا جواری کہلایا جا سکتا ہے۔ شرابی کچھ عرصہ شراب پیتا رہے گا' پھر اُس اسٹیج پر پہنچے گا' جہاں پہنچ کر شراب اس کے لیے لازمۂ حیات بن جائے گی۔ فسق و فجور میں مبتلا لوگ بھی ان راہوں پر چلتے رہتے ہیں' پھر ایک خاص سٹیج پر آ کر وہ پکے فاسق و فاجر بنتے

ہیں--- یہ تو ہوئے خاص خاص گناہ۔ وہ عام خطائیں جو ہم صبح و شام کرتے رہتے ہیں، ان میں بھی صورت یہی ہے کہ آغاز میں سے کسی غلطی کو پکڑ لیا جائے تو وہ آسانی سے قابو میں آجائے گی، اور اگر اسے پھیلنے دیا جائے گا تو پھر وہ خم ٹھونک کر سامنے آ کھڑی ہو گی کہ لو اب ذرا مجھے دبا کر تو دیکھو!

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اصل خرابی شروع ہونے سے کچھ پہلے ہی حرمت کی حدود باندھ دی ہیں تاکہ انسان خرابی کی اس حد تک نہ جا پہنچے جہاں پہنچنے کے بعد پھر اس کا نفس اس کے قابو میں آئے گا ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ معاشرت میں نکاح کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اجنبی عورتوں اور مردوں کے درمیان حجاب اور حیاء کی دیواریں کھڑی کر دی گئی ہیں۔ مالی معاملات میں زکوٰۃ کو فرض کی حیثیت دی گئی ہے۔ سود کو حرام کر دیا گیا ہے۔ باہمی انسانی تعلقات کے سلسلے میں بدلہ لے لینے کو جائز کر دینے کے باوجود زیادتی کو حرام کیا گیا ہے اور عفو و درگذر کو بہت بڑی فضیلت دے دی گئی ہے--- اس سے اللہ رؤف و رحیم کی مراد انسانوں کو تنگی میں مبتلا کرنا نہیں ہے بلکہ یہ اصول قائم کر کے اس نے انسانوں کے لیے یہ بندوبست فرمایا ہے کہ وہ برائیوں کی اسی ابتدائی سٹیج ہی میں رہیں جہاں نفس پر قابو پانا آسان ہوتا ہے۔

جہاں بروقت نکاح کر لینے کو ضروری سمجھا جائے گا اور اجنبی مرد اور عورتیں بے ضرورت، بے جا طور پر، باہم خلط ملط نہیں ہوں گے، وہاں لوگوں کے چال چلن کے خراب ہو جانے کا امکان بہت کم ہو گا، کیونکہ جذبات کے حد سے زیادہ مشتعل ہو جانے کے مواقع بہت کم ہوں گے۔

جہاں زکوٰۃ باقاعدگی سے دی جائے گی اور سود خوری سے پرہیز کی جائے گی، وہاں دولت کی حرص اس طرح بے لگام نہیں ہونے پائے گی کہ پھر اُسے قابو میں لایا ہی نہ

جا بنتے۔

جہاں لوگ عفو و درگذر کی فضیلت کو سمجھ لیں گے اور ایک دوسرے کو معاف کر دیا کریں گے، وہاں باہم ایک دوسرے پر ظلم و زیادتی کرنے کا جذبہ بہت کم ہو جائے گا۔

اور یہ سب نتائج اسی لیے پیدا ہوں گے کہ شہوانی خواہشات، حب زر اور باہمی عناد کے معاملات میں انسانوں کو ابتدائی مراحل ہی میں روک لیا گیا ہوگا اور ان مرحلوں میں داخل ہی نہیں ہونے دیا گیا ہوگا، جہاں پہنچ کر پھر جذبات اتنے تند ہو جاتے ہیں کہ نفس کو زیر کرنا محال ہو جاتا ہے۔ اسی حقیقت کو شیخ سعدیؒ نے اس طرح بیان فرمایا کہ جو چشمہ پھیل کر اتنا بڑا ہو جاتا ہے کہ ہاتھی پر چڑھ کر بھی اسے عبور نہیں کیا جا سکتا۔ اسے اگر شروع ہی میں بند کر لیا جاتا تو ایک سلائی بھی اسے بند کر دینے کے لیے کافی ہو سکتی تھی!

* * *

۴۔ زبان کی حفاظت

ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ سفر کر رہے تھے کہ راستے میں آپ نے ایک بوڑھی خاتون کو دیکھا، جو ایک درخت کے تنے کے پاس بیٹھی تھیں اور بڑی پریشان حال نظر آ رہی تھیں۔ حضرت عبداللہؒ ان کے پاس گئے اور کہا:

اَلسَّلَامُ عَلَیْکِ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ۔

خاتون نے جواب میں قرآن مجید کی ایک آیت پڑھ دی۔

سَلَامٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِیْمٍ ۔(ان کو پروردگار مہربان کی طرف سے سلام فرمایا جائے گا) (یٰسین: ۵۸)

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ نے کہا: ''خدا آپ پر رحمت کرے، آپ یہاں کیا کر رہی ہیں۔''

خاتون نے جواب میں پھر قرآن کی ایک اور آیت پڑھ دی۔

مَنْ یُّضْلِلِ اللّٰہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ ط (جس کو اللہ رہنمائی سے محروم کر دے اس کے لیے پھر کوئی رہنما نہیں ہے) (الاعراف: ۱۸۶)

مطلب یہ تھا کہ میں راستہ بھول گئی ہوں۔

حضرت عبداللہؒ نے پوچھا کہ آپ کہاں جا رہی ہیں۔

بوڑھی خاتون نے واضح طور پر کسی مقام کا نام لینے کے بجائے کلام پاک کی ایک

اور آیت پڑھ دی۔

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا. (بنی اسرائیل:۱)	(پاک ہے وہ جو لے گیا ایک رات اپنے بندے کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک)

مراد یہ تھی کہ میں مکہ معظمہ سے بیت المقدس کی طرف جا رہی ہوں۔

حضرت عبداللہؓ نے دیکھا کہ وہ خاتون کسی بات کا بھی جواب عام زبان میں نہیں دیتی تھیں بلکہ ہر سوال کے جواب میں قرآن کی کوئی ایسی آیت پڑھ دیتیں جس سے اس سوال کا جواب نکل آتا تھا۔

حضرت عبداللہؓ نے پوچھا۔ ”آپ کب سے یہاں پڑی ہیں؟“

بوڑھی خاتون نے جواب دیا:

ثَلٰثَ لَیَالٍ سَوِیًّا۔ (مریم:۱۱۰) (پیہم تین رات)

یعنی متواتر تین راتوں سے یہاں بیٹھی ہوں۔

حضرت عبداللہؓ نے کہا: ”آپ کے پاس کوئی کھانے پینے کی چیز تو ہے نہیں تو پھر آپ نے یہ عرصہ کیسے گزارا۔“

خاتون نے کہا:

هُوَ يُطۡعِمُنِیۡ وَیَسۡقِیۡنِ. (الشعراء:۷۹) (وہ مجھے کھلاتا ہے اور مجھے پلاتا ہے)

مطلب یہ کہ خدا کسی نہ کسی ذریعے سے رزق پہنچا دیتا ہے۔

حضرت عبداللہؓ نے سوال کیا: ”آپ وضو کس چیز سے کرتی ہیں۔“

بوڑھی خاتون نے جواب میں کہا:

فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا (پھر پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے تیمم کر
طَيِّبًا. (النساء:۴۳) لو)

یعنی چونکہ میرے پاس پانی نہیں اس لیے میں تیمم کر لیتی ہوں۔

حضرت عبداللہؓ نے ان کے سامنے کھانا پیش کیا اور کہا کہ یہ کھا لیجئے۔ اس پر خاتون بولیں:

ثُمَّ اَتِمُّوْا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ۔ (البقرہ:۱۸۷) (پھر رات تک اپنا روزہ پورا کرو)

یعنی میں روزے سے ہوں۔

حضرت عبداللہؓ بولے: ”یہ رمضان کا مہینہ تو نہیں ہے۔“

خاتون نے جواب دیا:

وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ (اور جو اپنی خوشی سے کوئی بھلائی کا کام
عَلِيْمٌ. (النساء:۴۳) کرے گا تو اللہ اس کی قدر کرنے
والا اور اسے جاننے والا ہے)

مراد یہ تھی کہ میں نے نفلی روزہ رکھا ہوا ہے۔

حضرت عبداللہؓ نے کہا: ”مگر سفر میں تو روزہ افطار کر لینے کی اجازت ہے۔“

بوڑھی خاتون میں جواب میں کہا:

وَاِنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ (لیکن اگر تم سمجھو تو تمہارے حق میں
تَعْلَمُوْنَ٥ (البقرہ : ۱۸۴) یہی اچھا ہے کہ روزہ رکھو)

حضرت عبداللہؓ بولے کہ جس طرح میں آپ سے بات کرتا ہوں۔ اسی طرح آپ مجھ سے باتیں کیوں نہیں کرتیں۔

خاتون نے کہا:

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ. (ق : ۱۸)

(وہ کوئی لفظ منہ سے نکالنے نہیں پاتا مگر اس کے پاس ہی ایک تاک لگانے والا تیار ہے)

خاتون کی مراد یہ تھی کہ چونکہ انسان جو کچھ زبان سے نکالتا ہے اس کے لیے خدا کے ہاں جواب دہ ہے، اس لیے میں قرآن کی زبان میں بات کرتی ہوں تا کہ کوئی قابلِ اعتراض بات میرے منہ سے نہ نکلے۔

حضرت عبداللہؓ نے پوچھا: ”آپ کس قبیلے سے تعلق رکھتی ہیں۔“

خاتون نے جواب میں پھر قرآن کی آیت پڑھی۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ۝

(بنی اسرائیل:۳۶)

(کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا تمہیں علم نہ ہو۔ یقیناً آنکھ، کان اور دل سب ہی کی باز پرس ہونی ہے)

مطلب یہ کہ میرے قبیلے کا نام معلوم کر کے تم نے کیا لینا ہے۔

حضرت عبداللہؓ نے معذرت کی کہ مجھ سے غلطی ہوئی۔ معاف کر دیجیے۔

خاتون نے معافی کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ؕ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ. (یوسف:۹۲)

(آج تم پر کوئی گرفت نہیں، اللہ تمہیں معاف کرے)

حضرت عبداللہؓ نے خاتون کو امداد پیش کرتے ہوئے کہا کہ میری اونٹنی حاضر ہے، اگر اس پر بیٹھنا چاہیں تو بیٹھ جائیں۔ آپ جہاں کہیں گی، پہنچا دوں گا۔

بوڑھی خاتون نے اس پیش کش کو قبول کرتے ہوئے گویا اظہارِ تشکر کے طور پر کہا:

وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ط (اور جو نیک کام تم کرو گے، وہ اللہ کے
(البقرہ: ۱۹۷) علم میں ہوگا)

یعنی خدا تمہیں اس نیکی کا اجر دے گا۔

حضرت عبداللہؒ نے کہا: "اچھا پھر سوار ہو جائیے۔"

یہ کہہ کر انہوں نے اپنی اونٹنی بوڑھی خاتون کے قریب بٹھا دی۔ خاتون نے کہا:

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ (مومنوں سے کہیں کہ اپنی نگاہیں نیچی
اَبْصَارِهِمْ. (النور۔۳۰) رکھیں)

سُبْحٰنَ الَّذِىْ سَخَّرَلَنَا هٰذَا وَمَا (اس کی ذات پاک ہے جس نے ان
كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ ٥ وَاِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا چیزوں کو ہمارے بس میں کر دیا اور ہم تو
لِمُنْقَلِبُوْنَ ٥ (الزخرف: ۱۳، ۱۴) ایسے نہ تھے جو ان کو قابو میں کر لیتے)

یہ سن کر حضرت ابن مبارکؒ نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ جب بوڑھی خاتون اُونٹنی پر بیٹھنے لگیں تو اونٹنی بدک گئی اور ان کے کپڑے کجاوے میں اُلجھ کر پھٹ گئے۔ اس پر وہ بولیں:

وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا (اور تم کو جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے وہ
كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ. تمہارے اپنے ہاتھوں کے کیے ہوئے
(الشوریٰ: ۳۰) کاموں سے پہنچتی ہے)

اس پر حضرت عبداللہ بن مبارکؒ نے اونٹنی کے گھٹنے باندھ دیے اور خاتون اس پر سوار ہو گئیں۔

اب حضرت ابن مبارکؒ نے اونٹنی کی نکیل پکڑ لی اور بلند آواز سے حدی خوانی کرتے ہوئے اونٹنی کو تیز تیز چلانے لگے۔ اس پر خاتون نے اونٹنی کے اُوپر سے پکارا:

وَاقۡصِدۡ فِیۡ مَشۡیِکَ وَاغۡضُضۡ (اور اپنی رفتار میں اعتدال اختیار کر اور
مِنۡ صَوۡتِکَ ط (لقمٰن:۱۹) اپنی آواز کو پست کر)

یہ سن کر حضرت ابن مبارکؒ آہستہ آہستہ چلنے لگے اور اپنی آواز بھی پست کر لی۔

اب بوڑھی خاتون نے یوں کہا:

فَاقۡرَءُوۡا مَا تَیَسَّرَ مِنَ الۡقُرۡاٰنِ ط (سو تم جتنا قرآن آسانی سے پڑھا جا
(المزمل:۲۰) سکے پڑھ لیا کرو)

مراد یہ تھی کہ اشعار پڑھنے کے بجائے قرآن پڑھو۔

کچھ دُور جا کر حضرت عبداللہ بن مبارکؒ نے اُن خاتون سے پوچھا کہ کیا آپ کے شوہر ہیں۔ اس پر وہ بولیں:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَسۡئَلُوۡا عَنۡ (اے ایمان لانے والو! ایسی باتیں نہ
اَشۡیَآءَ اِنۡ تُبۡدَلَکُمۡ تَسُؤۡکُمۡ۔ پوچھا کرو جو تم پر ظاہر کر دی جائیں۔ تو
(المائدہ:۱۰۱) تمہیں ناگوار ہوں)

مطلب یہ تھا کہ اس سوال کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اس پر حضرت عبداللہ بن مبارکؒ خاموش ہو گئے اور چلتے چلتے قافلے میں جا پہنچے۔ انہوں نے بوڑھی خاتون سے دریافت کیا کہ کیا قافلے میں آپ کا کوئی عزیز یا رشتہ دار ہے۔ خاتون نے جواب دیا:

اَلۡمَالُ وَالۡبَنُوۡنَ زِیۡنَةُ الۡحَیٰوةِ (مال اور بیٹے دنیوی زندگی کی ایک
الدُّنۡیَا۔ (الکھف:۴۶) زینت ہیں)

حضرت ابن مبارکؒ سمجھ گئے کہ قافلے میں اُن کے بیٹے ہیں۔ انہوں نے پھر کہا کہ ان کا کچھ پتہ بتائیں تو میں انہیں تلاش کروں۔ خاتون نے کہا:

وَعَلٰمٰتٍ ؕ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ. (النحل:١٦)	(علامتیں رکھ دیں اور تاروں سے بھی لوگ ہدایت پاتے ہیں)

مطلب یہ تھا کہ وہ قافلے کے رہبر ہیں۔ حضرت عبداللہؓ نے اُن کے نام پوچھے تو خاتون بولیں:

وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا۝ (النساء:١٢٥)	(اور اللہ نے ابراہیمؑ کو دلی دوست بنا لیا)
وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا۝ (النساء:١٦٤)	(اللہ نے موسیٰؑ سے اس طرح گفتگو کی جس طرح گفتگو کی جاتی ہے)
يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ؕ (مریم:١٢)	(اے یحییٰؑ کتاب کو مضبوطی سے پکڑ لو)

حضرت عبداللہؓ نے ان تینوں ناموں کو پکارنا شروع کیا تو قافلے میں سے تین نوجوان نکل کر ان کے پاس آ گئے۔ اُنہوں نے اپنی ماں کو اونٹنی سے اُتارا اور حضرت ابن مبارکؒ سے ملے۔ اب اُن خاتون نے اپنے بیٹوں سے مخاطب ہو کر کہا۔

فَابْعَثُوْا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ. (الكهف:١٩)	(اب اپنے میں سے کسی کو چاندی کا یہ سکہ دے کر شہر بھیجو اور وہ دیکھے کہ سب سے اچھا کھانا کہاں ملتا ہے۔ وہاں سے کچھ کھانے کے لیے لائے)

مراد یہ تھی کہ حضرت ابن مبارکؒ کو کچھ لا کر کھلاؤ۔ ان میں سے ایک نوجوان دوڑا ہوا شہر کی طرف گیا اور کچھ کھانا لا کر حضرت ابن مبارکؒ کے سامنے رکھا۔ وہ بوڑھی خاتون حضرت ابن مبارکؒ سے مخاطب ہو کر بولیں:

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِى الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ۝ (الحاقۃ: ۲۴)

(مزے کے ساتھ کھاؤ اور پیو، ان اعمال کے صلے میں، جو تم نے گزرے ہوئے دنوں میں کیے)

حضرت ابن مبارکؒ حیران تھے کہ اس ضعیفہ کو قرآن پر کس قدر عبور حاصل ہے۔ خاتون کے بیٹوں نے حضرت ابن مبارکؒ کو بتایا کہ گذشتہ چالیس برس سے ہماری ماں نے قرآنی آیات کے سوا اور کوئی بات نہیں کی، اس خوف کے مارے کہ منہ سے کوئی ایسا لفظ نہ نکل جائے جس کی قیامت کے دن باز پرس ہو۔

ظاہر ہے کہ زبان کی حفاظت کے معاملے میں یہ بلند معیار ہم عوام تو کیا خواص کے بھی بس کی بات نہیں۔ تاہم یہاں اس قصے کو بیان کرنے کا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ جن لوگوں کے دلوں میں اپنے آپ کو گناہوں سے بچانے کا جذبہ شدید ہوتا ہے۔ وہ اس حد تک بھی جا پہنچتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان جن گناہوں کا ارتکاب کرتا ہے، ان میں سے بہت سے گناہ ایسے ہیں جن کے لیے زبان ہی آلہ کار بنتی ہے۔

حضرت معاذؓ بن جبل سے روایت ہے کہ میں ایک سفر میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا۔ ایک دن جب ہم چل رہے تھے، میں حضورؐ کے قریب ہو گیا اور عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ مجھے کوئی ایسا عمل بتا دیجئے جو مجھے جنت میں داخل کر دے اور دوزخ سے دُور کر دے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ تو نے تو ایک بڑی بات پوچھی۔ یہ بات البتہ اس شخص کے لیے آسان ہے جس کے لیے خدا اسے آسان کر دے (پھر آپؐ نے فرمانا شروع کیا کہ) تو اللہ کی عبادت کر اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کر اور نماز قائم کر اور زکوٰۃ ادا کر اور رمضان کے روزے رکھ اور خانہ کعبہ کا حج کر۔

(اتنی باتیں بتا کر) پھر آپؐ نے فرمایا: ''کیا میں بھلائی کے دروازوں کی طرف تیری رہنمائی نہ کر دوں؟ (اچھا سن کہ) روزہ ڈھال ہے (یعنی گناہوں سے بچاتا ہے) اور خدا کی راہ میں خرچ کرنا (ایسا عمل ہے جو) گناہوں کو اس طرح بجھا دیتا ہے جیسے پانی آگ کو بجھاتا ہے اور یہی حال اس نماز کا ہے جو انسان رات کے وسطی حصے میں پڑھے۔ پھر حضورؐ نے یہ آیت تلاوت کی۔ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ ...... یہاں تک کہ آپؐ لفظ یَعْمَلُوْنَ تک پہنچے۔

(ترجمہ ان کے پہلو خواب گاہوں سے علیحدہ ہوتے ہیں اس طور پر کہ وہ لوگ خوف کھاتے ہوئے اور اُمید لیے ہوئے اپنے رب کو پکارتے ہیں اور ہماری دی ہوئی چیزوں میں سے خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ سو کسی شخص کو خبر نہیں جو جو آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ایسے لوگوں کے لیے خزانۂ غیب میں موجود ہے ان کے اعمال کے صلے کے طور پر)

پھر آپؐ نے فرمایا: ''کیا میں تمہیں پورے کے پورے امر (دین) کا سردار (عمل) اور اس کا ستون اور اس کے کوہان کی بلندی نہ بتا دوں۔''

میں نے عرض کیا: ''کیوں نہیں یا رسول اللہؐ (ضرور بتائیے۔)''

آپؐ نے فرمایا: ''امر (دین) کا سردار (عمل) اسلام ہے اور اس کا ستون نماز ہے اور اس کے کوہان کی بلندی جہاد ہے۔''

پھر آپؐ نے فرمایا: ''کیا میں تمہیں اس سارے معاملے کا سب سے اہم جُز نہ بتا دوں۔''

میں نے عرض کیا: ''کیوں نہیں یا رسول اللہؐ (ضرور بتائیے)''

آپؐ نے اپنی زبان (مبارک) کو پکڑا اور فرمایا: ''اس کو روکے رکھ۔''

میں نے عرض کیا کہ اے خدا کے نبیؐ کیا ہم پکڑے جائیں گے ان باتوں کے باعث جو ہم اس (زبان) سے کرتے ہیں۔ آپؐ نے (ازرہِ محبت) فرمایا:

"اے معاذ' تیری ماں تجھے روئے' یہ لوگوں کی زبانوں سے نکلی ہوئی باتیں ہی تو ہیں جو انہیں منہ کے بل یا ناک کے بل دوزخ میں ڈالیں گی۔" (ترمذی)

ان زبانوں سے نکلی ہوئی باتوں کی بھی ان گنت اقسام ہیں۔ غیبت' چغلی' بہتان' جھوٹ' بدزبانی' بے ہودہ گوئی' عیب جوئی' نکتہ چینی' لتراپن' طعن و تشنیع' غلط سلط افواہیں پھیلانا' لوگوں کا مضحکہ اڑانا' لوگوں کو عار دلانا' لوگوں کی آبروریزی کرنا' خوشامد کرنا' اترانا' لعنتیں بھیجنا' میت پر نوحہ کرنا' وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب گناہ ایسے ہیں جو زبان چلا کر ہی کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ حسد' کینہ' بغض' طیش' تکبر وغیرہ کئی روحانی امراض ایسے ہیں جن کا اظہار کرنے کے لیے زبان ہی کو استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر انسان حضورؐ کے ارشاد پر عمل کرتے ہوئے صرف زبان کو لگام دے لے تو ان تمام گناہوں سے بچا جا سکتا ہے۔ لہٰذا تزکیہِ نفس کی راہ کی ایک بہت بڑی رکاوٹ بے لگام زبان ہے' ذیل کی احادیث سے واضح ہو جاتا ہے کہ زبان کی حفاظت کرنا کتنا ضروری ہے۔

حضرت سفیانؓ بن عبداللہ ثقفی بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضورؐ کی خدمت میں عرض کیا کہ اے خدا کے رسولؐ مجھے کوئی ایسی بات بتا دیجیے جسے میں مضبوطی سے پکڑ لوں۔ آپؐ نے فرمایا کہ تم کہو کہ میرا پروردگار اللہ ہے پھر اس بات پر قائم رہو۔ میں نے عرض کیا کہ اے خدا کے رسولؐ آپؐ کے خیال میں کون سی چیز میرے لیے سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ آپؐ نے اپنی زبان (مبارک) کو پکڑا اور فرمایا کہ یہ۔ (ترمذی)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "انسان ایسا کلمہ کہہ جاتا ہے جس کے نقصان کو نہیں سمجھتا اور اس کی بنا پر دوزخ میں اتنی دور

جا گرتا ہے جتنی دُوری مشرق اور مغرب کے درمیان ہے۔" (مسلم)

حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے۔ وہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا کہ "جب صبح ہوتی ہے تو انسان کے سب اعضاء زبان کے آگے عاجزی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے معاملے میں خدا سے ڈر' کیونکہ ہم تیرے ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔ تو ٹھیک رہی تو ہم بھی ٹھیک رہیں گے اور اگر تو نے غلط روی اختیار کر لی تو ہم بھی غلط روی اختیار کر لیں گے (اور پھر اس کا خمیازہ بھگتیں گے)" (ترمذی)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ کچھ یہودی حضورؐ کے پاس آئے اور (السلام علیکم کہنے کے بجائے ازرہِ شرارت) السام علیکم کہا (جس کا مطلب ہے تم پر موت آئے نعوذ باللہ) اس پر حضرت عائشہؓ نے (غصے سے) کہا کہ تمہیں پر موت آئے اور تم پر خدا کی لعنت ہو اور تم پر خدا کا غضب ٹوٹے۔ (اس پر) حضورؐ نے فرمایا: "ٹھہرو ٹھہرو' اے عائشہؓ' نرمی کا رویہ اختیار کرو' اور سختی اور بدزبانی سے بچو۔" (بخاری)

حضرت ابو ایوبؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص حضورؐ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا کہ اے خدا کے رسولؐ مجھے کوئی بات سکھایئے مگر وہ ہو مختصر۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ جب تو نماز کے لیے کھڑا ہو تو ایسی نماز پڑھ گویا تو دنیا سے رخصت ہو رہا ہے اور کوئی ایسی بات نہ کر جس کے لیے بعد میں عذر پیش کرنا پڑے اور جو کچھ لوگوں کے پاس ہے اس سے مایوس ہو جا۔ (ابن ماجہ)

مفتی محمد شفیع صاحب لایعنی گفتگو کی مضرت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"انسان جتنے کام یا کلام کرتا ہے۔ بظاہر اس کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ مفید۔ جس میں دین یا دنیا کا کوئی فائدہ ہو۔

۲۔ مضر۔ جس میں دین یا دنیا کا کوئی نقصان ہو۔

۳۔ نہ مفید نہ مضر۔ جس میں کوئی فائدہ ہو نہ نقصان۔

اس تیسری قسم کو حدیث میں "لایعنی" کے لفظ سے تعبیر فرمایا گیا ہے لیکن جب ذرا غور سے کام لیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ یہ تیسری قسم بھی درحقیقت دوسری قسم یعنی مضر میں داخل ہے کیونکہ وہ وقت جو ایسے کام یا کلام میں صرف کیا گیا' اگر اس میں ایک دفعہ سبحان اللہ کہہ لیتا تو میزانِ عمل کا آدھا پلہ بھر جاتا۔ کوئی اور مفید کام کرتا تو گناہوں کا کفارہ اور نجاتِ آخرت کا ذریعہ یا کم از کم دنیا کی ضرورتوں سے بے فکری کا سبب بنتا۔ اس وقتِ عزیز کو بے فائدہ کام یا کلام میں خرچ کرنا ایسا ہے جیسے کسی کو اختیار دیا جائے کہ چاہے جواہرات اور سونے چاندی کا ایک خزانہ لے لو یا مٹی کا ایک ڈھیلا' وہ خزانہ کے بجائے مٹی کا ڈھیلا اٹھا لینے کو اختیار کرلے جس کا خسارۂ عظیمہ اور نقصان ہونا ظاہر ہے۔"

(گناہِ بے لذت' از مفتی محمد شفیع)

بے لگام زبان کی مضرتوں کے بارے میں سلف صالحین کے بہت سے اقوال روایت کیے گئے ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ فرماتے ہیں: "مصیبت کی جڑ (بنیاد) انسان کی گفتگو ہے۔"

آپ کے بارے میں روایت کیا گیا ہے کہ آپ اپنی زبان کو بار بار پکڑتے اور فرماتے:

"اس نے بہت جگہ پھنسایا ہے۔"

حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں: "زبان کی لغزش قدموں کی لغزش سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔"

حضرت علیؓ کا فرمان ہے: زبان وہ درندہ ہے کہ چھوڑ دو تو کاٹ کھائے۔"

نیز آپؓ فرماتے ہیں: "زبان کا حاوی ہونا نفس کی توہین ہے۔"

زبان کو بے پروائی سے چلاتے جانا دینی اور دنیاوی دونوں لحاظ سے مضر ثابت ہوتا ہے اور بسا اوقات غلط طریقے سے چلائی ہوئی زبان چلانے والے ہی پر مصائب لا نازل کرتی ہے یا جو نعمتیں اسے حاصل ہوتی ہیں یا حاصل ہونے والی ہوتی ہیں، ان کے چھن جانے کا ذریعہ ثابت ہوتی ہے۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں:

"بہت سے الفاظ نعمتیں چھین لیتے ہیں۔"

نیز آپؓ کا فرمان ہے کہ:

"جس شخص کی زبان اس پر حکمران ہو تو وہی اس کی ہلاکت اور موت کا فیصلہ کرتی ہے۔"

خواجہ حسن بصریؒ فرماتے ہیں: "عقلمند کی زبان قلب کے پیچھے ہے۔ جب وہ کچھ کہنا چاہتا ہے تو پہلے قلب کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اگر وہ بات اس کے فائدے کی ہوتی ہے تو کہتا ہے ورنہ رُک جاتا ہے اور جاہل کا قلب اس کی زبان کی نوک پر رہتا ہے۔ وہ قلب کی طرف رجوع نہیں کرتا۔ جو زبان پر آتا ہے بک جاتا ہے۔"

اگرچہ زبان سے کیے جانے والے سبھی گناہ خطرناک ہیں مگر جھوٹ اور غیبت کی مذمت خصوصی طور پر زیادہ ملتی ہے۔

غیبت اور چغلی: حضرت مطلبؒ بن عبداللہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ غیبت کیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: "یہ کہ تو کسی شخص کا ذکر اس طرح کرے کہ وہ سنے تو اُسے ناگوار ہو۔" اس نے عرض کیا یا رسولؐ اللہ، اگر (اس کے متعلق) میری بات سچی ہو (تو بھی یہ غیبت ہوگی؟) آپؐ نے فرمایا۔ اگر تیری بات سچی نہ ہو تو یہی چیز پھر بہتان ہے۔ (مؤطا)

اسی مضمون کی ایک روایت صحیح مسلم میں بھی ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے

ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے (صحابہ کرامؓ سے) فرمایا کہ کیا تم جانتے ہو کہ غیبت کیا ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ خدا اور اس کا رسولؐ زیادہ جانتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ (غیبت یہ ہے کہ) تو اپنے بھائی کا ذکر اس طریقے سے کرے جسے وہ ناپسند کرتا ہو۔ آپؐ سے عرض کیا گیا کہ اگر ہمارے بھائی میں وہ بات (واقعی) پائی جاتی ہو جو ہم نے کہی ہو (تو کیا پھر بھی یہ غیبت ہوگی) آپؐ نے فرمایا کہ اگر تمہاری کہی ہوئی بات اس میں پائی جاتی ہو تو تم نے اس کی غیبت کی اور اگر وہ اس میں نہ پائی جاتی ہو تو تم نے اس پر بہتان لگایا۔ (مسلم)

''......پیٹھ پیچھے کسی کی بدگوئی کرنا مطلقاً حرام ہے۔ یہ بدگوئی اگر سچی ہو تو غیبت ہے، جھوٹی ہو تو بہتان ہے اور دو آدمیوں کو لڑانے کے لیے ہو تو چغلی ہے۔'' (تفہیم القرآن، جلد پنجم، صفحہ ۹۳)

سورۃ الحجرات، آیت ۱۲ میں اللہ تعالیٰ نے غیبت سے منع کرتے ہوئے فرمایا ہے:

''......اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے۔ کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے۔ دیکھو تم خود اس سے گِھن کھاتے ہو اور اللہ سے ڈرو، اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحیم ہے۔''

غیبت کے بارے میں مندرجہ بالا دو احادیث واضح کر دیتی ہیں کہ غیبت نام ہی اس بدگوئی کا ہے جس میں کسی کا کوئی ایسا عیب بیان کیا جائے جو واقعی اس میں پایا جاتا ہو۔ اس توضیح کی روشنی میں ہم سمجھ سکتے ہیں کہ جو لوگ ایک دوسرے کی غیبت کرتے ہیں اور پھر اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسلی دے لیتے ہیں کہ ہم سچی بات کر رہے ہیں۔ ان کی یہ تسلی کس قدر جھوٹی ہوتی ہے۔ سچی بات ہی کا نام تو غیبت ہے اور اسی سچی بات کو اتنا گھناؤنا قرار دیا گیا ہے کہ اس سچی بات کو کرنا گویا اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا ہے۔

حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

کہ جب مجھے معراج ہوئی تو میرا گزر کچھ ایسے لوگوں پر ہوا جن کے ناخن تانبے کے تھے، جن سے وہ اپنے چہروں اور سینوں کو نوچ نوچ کر زخمی کر رہے تھے۔ میں نے کہا کہ اے جبرئیلؑ، یہ کون لوگ ہیں۔ جبرئیلؑ نے جواب دیا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھایا کرتے تھے (یعنی ان کی غیبت کیا کرتے تھے) اور اُن کی عزتوں سے کھیلا کرتے تھے۔ (ابوداؤد)

حضرت ابو برزہ اسلمیؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”اے وہ لوگو، جو زبان سے تو ایمان لائے ہو مگر ایمان ابھی تمہارے دلوں میں نہیں اترا، مسلمانوں کی غیبت نہ کیا کرو اور ان کے چھپے ہوئے عیبوں کی کھوج نہ کیا کرو کیونکہ جو ان کے چھپے ہوئے عیبوں کی کھوج کرے گا، اللہ خود اس کے چھپے ہوئے عیبوں کی کھوج کرے گا اور اللہ نے جس کے چھپے ہوئے عیوب کی کھوج کی اُسے وہ اس کے گھر میں رسوا کر دے گا۔ (ابوداؤد)

حضرت حذیفہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ چغل خور جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ (بخاری)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم دو قبروں کے پاس سے گزرے۔ آپؐ نے فرمایا کہ ان دونوں (قبروں والوں) پر عذاب ہو رہا ہے اور کسی بڑی بات پر نہیں ہو رہا۔ پھر آپؐ نے فرمایا: ہاں کیوں نہیں (ایک لحاظ سے وہ بات بڑی بھی ہے) ان میں ایک کا حال یہ ہے کہ وہ چغلی کھایا کرتا تھا اور دوسرا اپنے پیشاب (کے چھینٹوں) سے نہیں بچتا تھا......“ (بخاری)

حضرت عبدالرحمٰنؓ بن غنم اور حضرت اسماءؓ بنت یزید سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے بہترین بندے وہ ہیں کہ جب انہیں دیکھا جائے تو خدا یاد آئے، اور اللہ کے بدترین بندے وہ ہیں جو بہت چغلیاں کھاتے پھرتے ہیں، دوستوں

میں جدائی ڈلواتے ہیں اور اس بات کی تلاش میں رہتے ہیں کہ بے گناہ لوگوں کو آفت میں پھنسائیں۔ (مسند احمد)

حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے صحابہؓ میں سے کوئی ایک دوسرے کی بات مجھ تک نہ پہنچایا کرے کیونکہ میں یہ پسند کرتا ہوں کہ جب میں تم لوگوں کے پاس آؤں تو میرا دل (سب کی طرف سے صاف اور) بے روگ ہو۔ (ابوداؤد)

غیبت کرنے کا ایک بہت بڑا نقصان یہ ہے کہ جو شخص کسی کی غیبت کرتا ہے۔ اس کی نیکیاں اس شخص کو مل جاتی ہیں جس کی اس نے غیبت کی ہو۔ خواجہ حسن بصریؒ کو ایک دفعہ خبر پہنچی کہ فلاں شخص نے آپ کی غیبت کی ہے۔ آپ نے کھجوروں کا ایک طبق اس کے پاس بطور ہدیہ بھیجا اور ساتھ ہی یہ پیغام دیا کہ مجھ کو یہ خبر پہنچی ہے کہ آپ نے اپنی نیکیاں میرے نامۂ اعمال میں منتقل کر دی ہیں۔ اس احسان کا بدلہ دینے کی مجھ میں استطاعت نہیں ہے۔ اس لیے صرف یہ کھجوریں نذر کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ غرضکہ غیبت بڑا گھناؤنا گناہ ہے اور جو شخص اپنے نفس کو پاک کرنا چاہے اسے غیبت سے پرہیز لازمی ہے۔

یہاں یہ جان لینا ضروری ہے کہ پس پشت کی جانے والی ہر بات غیبت نہیں ہوتی۔ بعض صورتیں ایسی ہوتی ہیں کہ بات پس پشت ہی کی جاتی ہے مگر اسے غیبت شمار نہیں کیا جاتا، نہ اس کا گناہ ہوتا ہے کیونکہ اس خاص صورتِ حالات میں ویسا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ مثلاً کسی شخص نے کہیں رشتہ کرنا ہو اور اس کے بارے میں کسی سے مشورہ لے۔ جس سے مشورہ لیا جا رہا ہو، اسے اگر معلوم ہو کہ رشتے میں کوئی نقص ہے تو اسے بتا دینا چاہیے تاکہ رشتہ کرنے والا غلط جگہ رشتہ کرنے سے بچ جائے۔ ایسے ہی اگر کسی کی جان، مال، عزت یا دین کو کوئی خطرہ درپیش ہو تو اس کو اس خطرے سے بچانے کے لیے ظالم یا گمراہ کرنے والے

کے بارے میں جو کچھ کہا جائے گا، وہ چاہے پس پشت ہی ہو، غیبت شمار نہیں ہو گا۔

جھوٹ: سورہ الحج آیت ۳۰ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ۔

(تو تم لوگ گندگی سے یعنی بتوں سے کنارہ کش رہو اور جھوٹی بات سے کنارہ کش رہو۔)

سورۃ المومن، آیت ۲۸ میں فرمایا گیا ہے:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِیْ مَنْ ھُوَ مُسْرِفٌ کَذَّابٌ ۝

(اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو حد سے گزر جانے والا بہت جھوٹ بولنے والا ہو)

حضرت عبداللہؓ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا کہ سچائی نیکی کی طرف ہدایت دیتی ہے اور نیکی جنت کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور انسان سچ بولتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ صدیق (بہت سچا) ہو جاتا ہے اور بے شک جھوٹ بدکاری کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور بدکاری دوزخ کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور انسان جھوٹ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ خدا کے ہاں کذاب (بہت بڑا جھوٹا) لکھا جاتا ہے۔ (بخاری)

صحیح بخاری میں ایک قصہ بیان ہوا ہے جس کے راوی حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ ہیں۔ اس قصے کا تعلق زمانہ جاہلیت سے ہے، مگر اس سے واضح ہوتا ہے کہ جھوٹی قسم کس طرح زندگی ہی میں وبال لے آتی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ خاندان بنو ہاشم کے ایک آدمی کو قریش کے کسی اور خاندان سے تعلق رکھنے والے شخص نے مزدوری پر رکھا۔ وہ اس کے ساتھ اس کے اونٹوں میں جا رہا تھا کہ اس کے پاس سے ایک اور ہاشمی گزرا، جس نے اپنے ٹوکرے کا کنڈا باندھنے کے لیے اس ہاشمی مزدور سے ایک بندھن مانگا۔ ہاشمی

مزدور نے مالک سے پوچھے بغیر اسے اونٹ باندھنے کا ایک بندھن دے دیا۔ جب انہوں نے پڑاؤ کیا تو سب اونٹوں کو باندھ دیا گیا مگر ایک اونٹ نہ باندھا گیا۔ مالک نے پوچھا کہ اس اونٹ کو کیوں نہیں باندھا گیا، تو ہاشمی مزدور نے کہا کہ اس کی رسی نہیں ہے۔ مالک نے پوچھا کہ اس کی رسی کہاں گئی اور یہ معلوم ہونے پر کہ رسی دے دی گئی ہے، اُسے اتنا غصہ آیا کہ اس نے ہاشمی مزدور کے ایک لاٹھی ماری جو مہلک ثابت ہوئی۔

جب وہ مزدور زخمی پڑا تھا، اس کے پاس سے یمن کا کوئی شخص گزرا۔ ہاشمی مزدور نے اس سے پوچھا کہ کیا تم میرا ایک پیغام پہنچا دو گے۔ اس شخص نے ہامی بھر لی، تو ہاشمی مزدور نے کہا کہ جب تم حج کے لیے جاؤ تو وہاں پکارنا کہ اے آل قریش۔ جب وہ تمہیں جواب دیں تو پھر پکارنا کہ اے بنو ہاشم جب وہ بھی تمہیں جواب دیں تو پھر ابو طالب کا پوچھنا اور انہیں بتا دینا کہ اس شخص نے مجھے ایک رسی کے عوض قتل کر دیا ہے۔ اس کے بعد وہ ہاشمی مزدور مر گیا۔

جب اس کا مالک مکہ مکرمہ واپس گیا تو ابو طالب سے ملا۔ انہوں نے پوچھا کہ ہمارے آدمی کا کیا بنا۔ مالک نے کہا کہ وہ تو بیمار پڑ گیا تھا۔ میں نے اچھی طرح اس کی دیکھ بھال کی تھی مگر وہ مر گیا تو پھر میں نے اس کا کفن دفن کا بندوبست کر دیا---- کچھ دیر گزری تو وہی یمنی، جس کو ہاشمی مزدور نے پیغام دیا تھا، موسم حج میں وہاں آ گیا۔ اس نے آ کر پکارا کہ اے آلِ قریش۔ جواب ملا کہ یہ ہیں قریش پھر اس نے پکارا کہ اے بنو ہاشم۔ کہا گیا کہ یہ ہیں بنو ہاشم۔ پھر اس نے کہا کہ ابو طالب کہاں ہیں۔ لوگوں نے بتایا کہ یہ ہیں ابو طالب۔ یمنی نے ابو طالب کو بتایا کہ مجھے فلاں شخص نے کہا تھا کہ میں آپ کو یہ پیغام دوں کہ اسے اُونٹ باندھنے کی ایک رسی کے عوض قتل کر دیا گیا ہے۔

اب ابو طالب اس شخص کے پاس آئے جس نے ہاشمی مزدور کی جان لی تھی، اور

اس کے سامنے تین باتیں رکھیں کہ تینوں میں سے کوئی ایک منظور کرلو۔ ابو طالب نے کہا کہ یا تو تم خون بہا کے طور پر سو اونٹ دو کیونکہ تمہیں نے اسے قتل کیا ہے یا پھر تمہارے قبیلے کے پچاس آدمی قسم کھالیں کہ تم نے اُسے قتل نہیں کیا یا پھر ہم تمہیں اس کے عوض قتل کر دیں گے۔

وہ شخص پھر اپنے قبیلے والوں کے پاس آیا اور اُن سے بات کی تو وہ جھوٹی قسم کھانے کو تیار ہو گئے۔ پھر ابو طالب کے پاس ایک عورت آئی جو خود بنو ہاشم میں سے تھی، مگر اس کی شادی قاتل کے قبیلے کے کسی شخص سے ہوئی تھی۔ اور اس کا ایک بیٹا بھی تھا۔ اس نے ابو طالب سے درخواست کی کہ میرے اس بیٹے کو قسم لینے سے مستثنیٰ کر دیجئے۔ ابو طالب نے اس کی درخواست کو قبول کر لیا اور اس کے بیٹے کو مستثنیٰ کر دیا۔ پھر ایک اور شخص ابو طالب کے پاس آیا اور کہا کہ آپ نے سو اونٹوں کے مقابلے میں پچاس آدمیوں کی قسم رکھی ہے۔ تو گویا ایک شخص کی قسم کے مقابلے میں دو اونٹ ہوئے۔ تو آپ یہ دو اونٹ لے لیجئے اور مجھ سے قسم نہ لیجئے۔ ابو طالب نے اس کی بات مان لی۔ باقی اڑتالیس آدمیوں نے آکر جھوٹی قسم کھالی کہ ہمارے آدمی نے اس ہاشمی مزدور کو قتل نہیں کیا۔

حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ نے اس قصے کو بیان کر کے آخر میں فرمایا کہ قسم اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ ایک سال کے بعد اُن اڑتالیس آدمیوں میں سے ایک بھی زندہ نہ تھا۔

حضرت ابو بکرؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے کہ آپؐ نے تین مرتبہ فرمایا کہ کیا میں تمہیں بڑے بڑے گناہوں میں سے سب سے بڑے گناہ نہ بتا دوں؟ (پھر ان کی تفصیل بتائی کہ) خدا کے ساتھ کسی کو شریک کرنا اور والدین کی نافرمانی کرنا اور جھوٹی گواہی دینا یا جھوٹی بات کرنا (حضرت ابو بکرؓ کہتے ہیں کہ) حضورؐ ٹیک لگائے ہوئے تھے، پھر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور اس بات کو دہراتے رہے

یہاں تک کہ ہم نے اپنے جی میں کہا کہ کاش کہ آپ اب خاموش ہو جائیں۔ (مسلم)

معاشرے میں بہت سی غلط باتیں اس لیے بھی پھیل جاتی ہیں کہ لوگ جب کوئی بات سنتے ہیں تو یہ تحقیق کیے بغیر کہ یہ ٹھیک ہے یا غلط اسے آگے چلا دیتے ہیں۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدمی کے جھوٹا ہونے کے یے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ جو کچھ سنے اسے آگے نقل کر دے۔ (مسلم)

ابن وہب بیان کرتے ہیں کہ مجھ سے امام مالکؒ نے کہا کہ سنی سنائی بات کہ آگے نقل کر دینے والا آدمی (غلطی سے) نہیں بچ سکتا اور سنی سنائی بات کو آگے نقل کر دینے والا شخص کبھی امام بھی نہیں بن سکتا۔ (مسلم)

محمد بن المثنیٰ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عبدالرحمٰن بن مہدی کو فرماتے سنا کہ جب تک انسان بعض سنی سنائی باتوں سے زبان کو نہیں روکے گا' وہ قابلِ اقتداء امام نہیں بنے گا۔ (مسلم)

بعض لوگوں کو رونقِ محفل بننے کا اتنا شوق ہوتا ہے کہ وہ لوگ کو ہنسانے کے لیے غلط سلط باتیں گھڑ کر سناتے رہتے ہیں۔ ایسے اشخاص کے لیے سخت وعید ہے۔

بہزؒ بن حکیم بیان کرتے ہیں کہ میرے باپ نے میرے دادا سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا: "ہلاکت ہے اس کے لیے جو لوگ کو ہنسانے کے لیے کوئی بات کرتا ہے اور اس میں جھوٹ بولتا ہے' اس کے لیے ہلاکت ہے! اس کے لیے ہلاکت ہے!!" (ترمذی)

بسا اوقات بچے کو بہلانے کی خاطر یا اُسے کسی شرارت سے روکنے کے لیے یا ایسے ہی کسی اور مقصد کے لیے مائیں بچوں سے بے تکلف جھوٹ بول دیتی ہیں اور اسے جھوٹ شمار بھی نہیں کرتیں۔ حالانکہ جھوٹ بہرحال جھوٹ ہے چاہے بڑے سے بولا جائے

یا بچے سے۔

حضرت عبداللہؓ بن عامر سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن ہمارے گھر بیٹھے ہوئے تھے کہ میری ماں نے مجھے بلایا اور کہا کہ ادھر آئیں تجھے کوئی چیز دوں گی۔ اس پر حضورؐ نے پوچھا کہ تم نے اسے کیا دینے کا ارادہ کیا ہے۔ میری ماں نے عرض کیا کہ میں اسے ایک کھجور دوں گی۔ اس پر آپؐ نے میری ماں سے فرمایا کہ اگر تو (اسے کچھ دینے کا وعدہ کر کے پھر) اسے کچھ نہ دیتی تو تیرے خلاف ایک جھوٹ لکھ لیا جاتا۔ (ابوداؤد)

بعض اوقات سوکنیں ایک دوسری کے دل کو تکلف دینے کی خاطر ایک دوسری پر یہ ظاہر کرنا چاہتی ہیں کہ شوہر کی توجہ ہماری طرف زیادہ ہے اور وہ ہمیں زیادہ کچھ دیتا ہے۔

حضرت اسماءؓ روایت کرتی ہیں کہ ایک عورت نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: ”اے خدا کے رسولؐ، میری ایک سوکن ہے۔ اگر میں (اسے جلانے کی خاطر) جو کچھ میرا خاوند مجھے دیتا ہے اسے بڑھا کر ظاہر کروں تو کیا مجھے گناہ ہوگا۔“ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ نہ دی ہوئی چیز کو ظاہر کرنے والا اس شخص کی مانند ہے جس نے جھوٹ کے دو کپڑے پہنے ہوئے ہوں۔ (بخاری)

زبان کے دوسرے گناہ: سورۃ الحجرات، آیت گیارہ میں اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو مخاطب کر کے مختلف ہدایات فرمائی ہیں، جن کا تعلق زبان کی حفاظت سے ہے۔

”اے لوگو، جو ایمان لائے ہو، مرد (دوسرے) مردوں کا مذاق نہ اڑائیں، ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں، اور نہ عورتیں (دوسری) عورتوں کا مذاق اڑائیں، ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے یاد کرو۔ ایمان لانے کے بعد فسق میں نام پیدا کرنا بہت بری بات ہے اور جو لوگ اس روش سے باز نہ آئیں وہی ظالم ہیں۔“

سورۃ النور، آیات ۲۳، ۲۴، ۲۵ میں الزام طرازی کی عبرتناک سزا بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

"جو لوگ پاکدامن، بے خبر، مومن عورتوں پر تہمتیں لگاتے ہیں، اُن پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی گئی اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے (وہ اس دن کو بھول نہ جائیں) جس دن اُن کی اپنی زبانیں اور اُن کے اپنے ہاتھ پاؤں، اُن کے کرتوتوں کی گواہی دیں گے۔ اُس دن اللہ وہ بدلہ اُنہیں بھرپور دے گا، جس کے وہ مستحق ہیں اور انہیں معلوم ہو جائے گا کہ اللہ ہی حق ہے، سچ کو سچ کر دکھانے والا۔"

سورۃ لقمٰن، آیت ۱۸ میں تکبر اور فخر کی مذمت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے:

"اور لوگوں سے اپنا رُخ مت پھیر اور زمین پر اترا کر مت چل۔ بے شک خدا کسی تکبر کرنے والے، فخر کرنے والے کو پسند نہیں فرماتا۔"

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنے کی اجازت چاہی۔ آپؐ نے فرمایا کہ اچھا اسے آنے کی اجازت دے دو (مگر) وہ اپنے قبیلے کا ایک بُرا بیٹا ہے یا (آپؐ نے فرمایا کہ) وہ اپنے قبیلے کا ایک بُرا آدمی ہے۔ لیکن جب وہ شخص داخل ہوا تو آپؐ نے اس کے ساتھ نرمی سے گفتگو فرمائی۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے آپؐ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ! آپؐ نے اس کے بارے میں فرمایا جو کچھ کہ فرمایا، پھر آپؐ نے اس کے ساتھ نرمی سے گفتگو کی۔ آپؐ نے فرمایا: "اے عائشہؓ، قیامت کے دن اللہ کے نزدیک مرتبے میں سب سے برا آدمی وہ ہوگا، جس کی بدزبانی سے بچنے کے لیے لوگ اسے چھوڑ دیں۔" (مسلم)

حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چار چیزیں ایسی ہیں کہ جس میں پائی جائیں، وہ خالص منافق ہے اور جس میں ان چار

خصلتوں میں سے کوئی ایک خصلت ہو تو اس میں نفاق کی ایک خصلت ہے۔ یہاں تک کہ وہ اسے چھوڑ دے (وہ چار خصلتیں یہ ہیں کہ) جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے اور جب بات کرے تو جھوٹ بولے اور جب وعدہ کرے تو اُسے پورا نہ کرے اور جب جھگڑا کرے تو بیہودہ گوئی کرے۔ (بخاری)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولَ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب دو شخص آپس میں گالی گلوچ کریں تو گناہ آغاز کرنے والے پر ہوگا جب تک کہ مظلوم زیادتی نہ کرے۔ (مسلم)

حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ بن العاص سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ کبیرہ گناہوں میں سے ہے کہ کوئی شخص اپنے والدین کو گالی دے۔ لوگوں نے عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ' کیا کوئی شخص اپنے والدین کو بھی گالی دیتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ ہاں' ایک شخص کسی دوسرے شخص کے باپ کو گالی دیتا ہے تو وہ پھر اس کے باپ کو گالی دیتا ہے اور کوئی دوسرے کی ماں کو گالی دیتا ہے تو وہ پھر اس کی ماں کو گالی دیتا ہے (تو گویا اس نے اپنے والدین کو خود ہی گالی دی۔ نہ کسی کے والدین کو گالی دیتا نہ وہ اس کے والدین کو گالی دیتے) (مسلم)

صحیح بخاری میں حضرت عبید اللہؓ سے روایت ہے' وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ کو فرماتے سنا کہ کسی کے نسب میں طعن کرنا اور (میت پر) نوحہ کرنا جاہلیت کی خصلتوں میں سے ہیں اور (انہوں نے کوئی) تیسری بات (بھی بیان کی تھی جس) کو عبید اللہؓ بھول گئے۔ (بخاری)

حضرت ابوموسیٰؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی شخص کو سُنا کہ وہ کسی اور شخص کی تعریف کر رہا تھا اور تعریف میں مبالغہ کر رہا تھا۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ تم

نے (اس شخص کو) ہلاک کر دیا یا (یوں فرمایا کہ) تم نے اس شخص کی کمر توڑ ڈالی۔ (بخاری)

مراد یہ ہے کہ مبالغہ آمیز تعریف اس شخص کو غرور کا شکار بنا دے گی اور غرور پھر اس کی بربادی کا سامان کر دے گا۔

خاموشی کی فضیلت: چونکہ زبان کے قابو میں نہ ہونے کے باعث انسان طرح طرح کے گناہوں میں مبتلا ہو جاتا ہے اس لیے اربابِ عقل دانش نے جہاں ایک طرف زبان کی حفاظت کرنے کا حکم دیا ہے، وہاں دوسری طرف خاموشی کی فضیلت بھی بیان کر دی ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان جتنا کم بولے گا، غلط باتیں کر جانے کا امکان بھی اتنا ہی کم ہوگا۔ خاموشی کی فضیلت سے یہ مراد نہیں کہ انسان ضرورت کے وقت بھی نہ بولے، کیونکہ جیسے بہت سے گناہ کے کام زبان سے کیے جاتے ہیں، ایسے ہی بہت سے ثواب کے کام بھی تو زبان ہی سے سرانجام دیئے جاتے ہیں۔ مثلاً کسی کو سیدھی راہ دکھانا، کسی غمزدہ کی دلجوئی کرنا، قرآن پاک کی درس و تدریس کرنا، وغیرہ وغیرہ۔ خاموشی کی تعریف کرنے سے درحقیقت یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ زبان کو بے ضرورت نہ کھولنا بہت سے خطرات سے بچ جانے کا ذریعہ ہوتا ہے۔

حضرت عبداللہؓ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو خاموش رہا وہ نجات پا گیا۔ (ترمذی)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص خدا اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے، اسے چاہیے کہ اپنے ہمسائے کو تکلیف نہ دے، اور جو شخص خدا اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ اپنے مہمان کی خاطر داری کرے اور جو شخص خدا اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اسے چاہیے کہ بھلی بات کہے یا پھر خاموش رہے۔ (مسلم)

عمران بن حطّان بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت ابوذرؓ کے پاس آیا تو میں نے انہیں مسجد میں کالی کملی لپیٹے تنہا دیکھا۔ میں نے عرض کیا کہ اے ابوذرؓ ' یہ تنہائی کیسی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ برے ہم نشین سے تنہائی بہتر ہے اور نیک ہم نشین تنہائی سے بہتر ہے اور اچھی بات بتانا خاموشی سے بہتر ہے اور بُری بات بتانے سے خاموشی بہتر ہے۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

امام غزالیؒ خاموشی کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"خاموشی عبادت ہے بغیر محنت کے'
ہیبت ہے بغیر سلطنت کے'
قلعہ ہے بغیر دیوار کے'
فتح یابی ہے بغیر ہتھیار کے'
آرام ہے کراماً کاتبین کا'
شیوہ ہے عاجزوں کا'
دبدبہ ہے حاکموں کا'
مخزن ہے حکمتوں کا'
جواب ہے جاہلوں کا۔"

اس کے برعکس کثرتِ کلام کو ایک ناپسندیدہ فعل سمجھا گیا ہے۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے ذکر کے سوا کسی اور کلام کی کثرت نہ کرو کیونکہ اللہ کے ذکر کے سوا کسی اور کلام کی کثرت دل کو سخت کر دیتی ہے اور اللہ سے سب سے زیادہ دُور وہ شخص ہوتا ہے جو سخت دل ہو۔

(ترمذی)

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں: ”جو شخص سب و شتم اور دوسروں پر لعن طعن میں مصروف ہوگا، اس کو باطنی برکات کبھی حاصل نہ ہوں گی“ کیونکہ دوسروں کی عیب گوئی یا سب و شتم کا مشغلہ وہی اپنا سکتا ہے جو خود اپنے انجام سے بے خبر اور غافل ہو۔“

غرضکہ زبان کی حفاظت تزکیہ نفس کے سلسلے میں بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے اور نفس کا تزکیہ کرنے والے کے لیے ازحد ضروری ہے کہ اسے اپنی زبان پر اتنا قابو حاصل ہو کہ وہ بولنے کے وقت تو بولے مگر جب بولے بغیر بخوبی گزارا ہو سکتا ہو تو چپکا ہو رہے۔ اسی میں نجات ہے۔!

* * *

۵۔ نیک صحبت

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نیک ساتھی کی مثال کستوری بیچنے والے کی سی ہے اور بد ساتھی کی مثال بھٹی دھونکنے والے کی سی ہے۔ پس کستوری اٹھانے والا یا تو تجھے کستوری دے دے گا یا تو اُسے اس سے خرید لے گا (اور اگر یہ دونوں باتیں نہ ہوں گی تو کم از کم) تو کستوری کی خوشبو ہی کو حاصل کر لے گا' اور بھٹی دھونکنے والا یا تو تیرے کپڑے جلا دے گا (اور اگر یہ نہ ہو گا تو کم از کم) تو اس کی بدبو (تو ضرور) ہی محسوس کرے گا۔ (بخاری' مسلم)

نیک صحبت کے لازماً اچھے اثرات پیدا کرنے کی اس سے بہتر مثال شاید ہی بیان کی گئی ہو۔ کستوری کی خوشبو خود بخود ہی اردگرد پھیلتی اور لوگوں کے مشامِ جان کو معطر کرتی رہتی ہے۔ چاہے اردگرد کے لوگوں نے اس خوشبو کو سونگھنے کا ارادہ کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ ایسے ہی نیک صحبت لازماً اپنا اچھا اثر ڈالتی ہے چاہے نیک صحبت میں بیٹھنے والے لوگ اچھا اثر لینے کا قصد رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں۔

اپنے نفس کا تزکیہ کرنے کی راہ میں جو مشکلات آتی ہیں' نیک صحبت اُن میں آسانی پیدا کرتی ہے۔ آسانی اس طرح کہ اچھوں کی صحبت میں بیٹھنے سے انسان کے دل میں غیر ارادی طور پر اچھائی کی محبت پیدا ہو جاتی ہے اور جس شے کے لیے دل میں محبت پیدا ہو جائے' وہ اگر مشکل بھی ہو گی تو مشکل لگے گی نہیں۔ دوسرے یہ کہ اچھے ساتھی حاصل ہو

جانے کی باعث انسان اپنے دل میں بڑی قوت محسوس کرنے لگتا ہے۔ جیسے کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ اگر انسان اپنے احباب اور ملنے ملانے والوں کا حلقہ ایسا چنے جس میں نیکو کار لوگ ہوں اور خاص طور پر التزام سے ان سے میل ملاقات قائم رکھے، تو ان نیک خیال اور نیک عمل لوگوں کے اچھے اثرات پڑتے رہنے کے باعث انسان اُن خرابیوں سے بھی بہت حد تک محفوظ ہو جاتا ہے جو عالم گیر ہوتی ہیں اور ان سے بھی جو اس کے اپنے ملک میں خاص طور پر پائی جاتی ہیں یا جو اس کے اپنے کنبے کی خصوصیات ہوتی ہیں۔ نیک صحبت کے بے پناہ فوائد کے باعث صالحین نے اس کی فضیلت بھی بیان کی ہے اور اس کی تاکید بھی فرمائی ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انسان اپنے دوست کے دین پر ہوگا۔ پس تم میں سے (ہر) ایک دیکھ لے کہ وہ کس سے دوستی کر رہا ہے۔ (ابوداؤد)۔

حضرت ابوبکرؓ کا فرمان ہے: ”بروں کی ہم نشینی سے تنہائی بہتر ہے اور تنہائی سے نیک لوگوں کی صحبت بدرجہا بہتر ہے۔“

ایک دن حضرت عثمانؓ نے فرمایا: ”بظاہر ان چار چیزوں میں ایک ایک خوبی ہے مگر درحقیقت یہ چاروں چیزیں چار ضروری امر ہیں۔“

پھر آپؓ نے چاروں چیزوں کا ذکر فرمایا تو سب سے پہلے جس شے کا ذکر کیا وہ یہ تھی کہ:

”نیکوں سے ملنا ایک خوبی ہے کیونکہ اس کے بعد اُن کی پیروی کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔“

بقیہ تین چیزیں جو آپؓ نے بیان فرمائیں، وہ تلاوت قرآن، بیمار پرسی اور قبروں پر

جاتا تھا۔ جن کے بارے میں آپؐ نے فرمایا کہ ان تینوں چیزوں سے لازماً تین اثرات پیدا ہوتے ہیں۔ تلاوتِ قرآن سے عمل کی تاکید ہوتی ہے۔ بیمار پرسی سے نصیحت حاصل ہوتی ہے اور قبروں پر جانے سے عالمِ آخرت کی تیاری کا احساس ہوتا ہے اور مستعدی پیدا ہوتی ہے۔

مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے بھائی عتبہ کے پوتے عبیداللہ بن عبداللہؒ تابعین میں سے تھے۔ آپ کا گھرانہ علم و عمل کا گہوارہ تھا۔ فضل و کمال کے لحاظ سے آپ ممتاز تابعین میں شمار ہوتے تھے۔ حدیث، فقہ، شعر و شاعری اور دوسرے مروجہ علوم میں پورا درک تھا۔ آپ کی نمازیں بڑی طویل اور سکون و اطمینان والی ہوتی تھیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ جیسے مردِ صالح پر ان کے اخلاقی کمالات کا اتنا اثر تھا کہ وہ فرمایا کرتے تھے:

''عبیداللہ کی ایک صحبت اور تھوڑی دیر ان کے ساتھ ہم نشینی مجھے دنیا و مافیہا سے عزیز ہے۔ خدا کی قسم، ان کی ایک رات (کی صحبت) میں بیت المال کے ایک ہزار دینار سے خریدنے کو تیار ہوں۔''

چونکہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ بیت المال کی حفاظت کا بہت زیادہ اہتمام کرتے تھے اور بیت المال کے پیسے کو ذرا بھی فضول ضائع نہیں ہونے دیتے تھے۔ اس لیے لوگوں کو تعجب ہوا کہ آپ ایک انسان کی ایک رات کی صحبت کے لیے بیت المال کا ہزار دینار صرف کرنے کے لیے تیار ہیں۔ لوگوں نے عرض کیا: ''امیر المومنین، بیت المال کے تحفظ میں شدت اور اہتمام کے باوجود آپ ایسا فرماتے ہیں۔''

آپ نے جواب دیا: ''خدا کی قسم، میں عبیداللہ بن عبداللہ کی رائے، ان کی نصیحت کے وسیلے سے ایک ہزار کے بجائے بیت المال میں ہزاروں ہزار داخل کروں گا۔ باہمی گفتگو سے عقل میں تازگی پیدا ہوتی ہے، قلب کو راحت ملتی ہے، غم دُور ہوتا ہے اور ادب

سدھرتا ہے۔" (ابن خلکان)

مفتی محمد حسنؒ کا ایک مقولہ ہے۔ "نرا علم کافی نہیں ہوتا اور نری صحبت کافی ہو جاتی ہے۔"

آپ کی مراد یہ تھی کہ اگر کوئی شخص علم و اخلاق کی کتابیں تو پڑھ لے، مگر کسی عالم اور صالح انسان کی صحبت میں نہ بیٹھے تو صرف کتابیں اُسے ایک صالح اور عالم انسان بنانے کے لیے کافی ثابت نہیں ہوں گی، مگر اس کے برعکس اگر کسی شخص نے کتابیں تو نہ پڑھی ہوں مگر کسی نیک اور علم رکھنے والے انسان کی صحبت میں بیٹھا رہا ہو تو اس صالح شخص کا اثر قبول کرتے کرتے اور اس کے اعمال و افعال دیکھتے دیکھتے وہ اتنا علم و عمل حاصل کرے گا، جو اس کی نجات کے لیے کافی ہوگا۔

امام ابوحنیفہؒ کا بتایا ہوا ایک واقعہ اس مقولے کی بڑی خوبصورتی سے وضاحت کرتا ہے۔ حضرت عطاء بن ابی رباح اپنے فضل و کمال اور پرہیزگاری کے لحاظ سے جلیل القدر تابعین میں شمار ہوتے تھے۔ دوسرے کمالات کے علاوہ مناسکِ حج کے علم میں وہ خاص طور پر مشہور تھے۔ آپ نے بنو امیہ کا زمانہ پایا۔ بنو امیہ کے فرمانروا بھی اُن سے حج کے مناسک کی تعلیم حاصل کرتے تھے اور عہدِ اموی میں حج کے موقع پر منادی کر دی جاتی تھی کہ عطاء کے سوا اور کوئی حج کے مسائل کے بارے میں فتویٰ نہ دے۔

امام ابوحنیفہؒ بیان فرماتے ہیں کہ حج کے موقع پر ایک حجام نے مجھے پانچ موقعوں پر مناسک حج کی تعلیم دی۔

۱۔ بال ترشوانے سے پہلے میں نے اس سے حجامت کی بنوائی طے کرنا چاہی تو اس نے کہا کہ عبادت میں شرط نہیں کی جاتی، آپ بیٹھ جائیں حجامت بن جائے گی۔

۲۔ میں قبلہ رُخ سے ذرا ہٹ کر بیٹھا تھا، اس نے مجھے قبلہ رُخ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

۳۔ میں نے بائیں جانب سے سر منڈوانا چاہا تو اس نے کہا کہ دائیں جانب پھیریں۔ میں نے سر دائیں جانب پھیر دیا اور وہ سر مونڈنے لگا۔

۴۔ میں خاموش بیٹھا تھا کہ اس نے کہا کہ تکبیر کہتے جائیں۔

۵۔ حجامت بنوانے کے بعد جب میں جانے لگا، تو اس نے پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو۔ میں نے جواب دیا کہ اپنی قیام گاہ پر۔ اس نے کہا کہ پہلے دو رکعتیں پڑھ لیں۔

امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ مجھے خیال آیا کہ ایک حجام خود ایسے مسائل نہیں جان سکتا، جب تک اس نے کسی سے معلوم نہ کیا ہو۔ چنانچہ میں نے اس سے پوچھا کہ تم نے جن باتوں کی مجھے تعلیم دی ہے۔ وہ تمہیں کہاں سے معلوم ہوئیں، تو اس نے جواب دیا کہ میں نے عطاء بن ابی رباح کو ایسا کرتے دیکھا تھا۔ (ابن خلکان)

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے چونکہ سینکڑوں کتابیں لکھی تھیں ایک شخص نے آپ کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ نے اتنی تصنیفات فرمائی ہیں تو ہزاروں کتابیں دیکھی ہوں گی۔ اس پر آپ نے فرمایا: ”ہاں، چند کتابیں دیکھی ہیں، جن کے نام یہ ہیں: حاجی امداد اللہؒ، مولانا محمد یعقوب صاحبؒ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ ---- ان کتابوں نے مجھے سب دوسری کتابوں سے بے نیاز بنا دیا۔ شاید ایسے ہی حضرات کے متعلق کسی کا شعر ہے۔

وَاَنْتَ الْکِتَابُ الْمُبِیْنُ الَّذِیْ
بِاَحْرُفِہٖ یَظْھَرُ الْمُضْمَرُ

(تو وہ واضح کتاب ہے جس کے حروف سے مخفی مضامین ظاہر ہوتے ہیں“)

یہ جو حکیم الامت نے علمائے صالحین کو کتابیں کہا تو اُن کی مراد یہی تھی کہ اُن کی صحبت میں بیٹھ کر میں نے جو کچھ حاصل کیا، اسی کا نتیجہ ہے کہ میں اتنی کتابیں لکھنے کے قابل

ہو گیا ہوں۔

حضرت ابراہیم خواص کا فرمان ہے کہ امراضِ قلب کی دوا پانچ چیزیں ہیں:

☆ ''سب سے پہلے تلاوتِ قرآن' اس کے معانی پر غور و تدبر کے ساتھ'

☆ دوسرے پیٹ کو زائد از ضرورت غذا سے خالی رکھنا'

☆ تیسرے رات کی نماز یعنی تہجد'

☆ چوتھے آخر شب میں اللہ تعالیٰ کے حضور میں الحاح و زاری اور دعا'

☆ پانچویں نیک لوگوں کی صحبت۔''

خواجہ حسن بصریؒ کا فرمان ہے کہ: ''جو شخص خدا کی اطاعت کرتا ہے' اس سے دوستی رکھنا تم پر ضروری ہے۔ کیونکہ جو شخص صالح آدمی کو دوست رکھتا ہے' وہ گویا خدا کو دوست رکھتا ہے۔''

ایک دفعہ آپ کے پاس کوئی شخص آیا اور شکایت کی کہ میرا دل بہت سخت ہے۔ آپ نے فرمایا کہ: ''اسے ذکر و فکر کی جگہوں پر لے جایا کرو۔''

خواجہ معین الدین چشتیؒ کا ارشاد ہے: ''نیکوں کی صحبت نیک کام سے بہتر اور بروں کی صحبت بُرے کام سے بدتر ہے۔''

آپ نے نیکوں کی صحبت کو نیک کام سے اس لیے بہتر کہا کہ نیک صحبت کے باعث جب انسان کو نیکی سے محبت ہو جاتی ہے تو پھر اس کی نیکیوں کی تعداد بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ ایسے ہی برے کام کی نسبت بُری صحبت کا بدتر ہونا ایسے ہے کہ بُرا کام کر کے تو شاید انسان کو ندامت ہی ہو اور وہ توبہ کر کے اپنا گناہ بخشوا لے' مگر بُری صحبت تو دل کو اس طرح زنگ آلود کر دیتی ہے کہ بُرائی کی شناعت کا احساس ہی دل سے مٹ جاتا ہے۔

اردو کے مشہور صوفی شاعر مرزا مظہر جانجاناںؒ فرماتے تھے کہ اگر مجھے لیلۃ القدر

مل جائے تو یہی دعا کروں کہ نیک صحبت عطا فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ سے نیک صحبت مانگوں۔

مفتی محمد حسنؒ کا فرمان ہے کہ: ''اس راستے کے چور اور ڈاکو دو ہیں۔ ایک غفلت دوسرے معصیت۔ اس کا علاج یہ ہے کہ انسان کسی مرد صالح کی صحبت میں بیٹھا کرے۔''

نیک صحبت کا یہی فائدہ بہت بڑا ہے کہ زندگی میں ایسے ہمدرد اور فرض شناس ساتھی مل جاتے ہیں جو دنیوی زندگی کے دکھ سکھ میں شریک بھی ہوتے ہیں اور اپنے محبت آمیز سلوک سے دکھوں کے احساس کو بھی کم کرتے ہیں۔ جس ماحول میں لوگوں کو نیکی سے محبت اور اپنی اصلاح کا خیال رہے گا' وہاں اپنے سے زیادہ قوی ایمان والے تو فائدہ مند ہوتے ہی ہیں۔ اپنے سے کمزور ایمان والے بھی بہت فائدہ پہنچاتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ کبھی اپنے سے زیادہ قوی ایمان والے لوگ ہماری ہمت بندھاتے ہیں اور کبھی اپنے سے کمزور ایمان والے لوگوں کی ہمت ہم بندھاتے ہیں اور جس وقت ہم کسی کی ہمت بندھا رہے ہوتے ہیں تو ہماری اپنی ہمت خود بخود ہی بندھ جاتی ہے۔

نیکوں سے محبت رکھنا دنیا ہی میں نہیں بلکہ موت کے بعد بھی خیر و برکت کا باعث ہوگی۔ کیونکہ حضورؐ کا فرمان ہے کہ آخرت میں انسان اسی کے ساتھ ہوگا' جس سے اس نے زندگی میں محبت رکھی ہوگی۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک دیہاتی شخص حضورؐ کے پاس آیا اور پوچھا کہ یارسول اللہؐ قیامت کب ہوگی؟ آپؐ نے فرمایا: ''تیرا ناس ہو' تو نے اس کے لیے کیا تیاری کی ہے۔''

اس نے عرض کیا کہ میں نے اس کے لیے کوئی تیاری نہیں کی ہے سوائے اس کے کہ میں خدا اور اس کے رسولؐ سے محبت رکھتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا کہ بے شک تم اسی کے ساتھ ہوگے جس سے تم نے محبت کی۔ (حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ) ہم نے عرض کیا

کہ کیا ہم بھی ایسے ہی ہوں گے (کہ جس سے ہم نے محبت کی ہو گی اس کے ساتھ ہوں گے) حضورؐ نے فرمایا: ''ہاں۔'' (حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ) اُس دن ہم بہت ہی زیادہ خوش ہوئے۔ (بخاری)

حضرت عبداللہؓ بن صامت بتاتے ہیں کہ حضرت ابوذرؓ نے حضورؐ کی خدمت میں عرض کیا کہ اے خدا کے رسولؐ ایک شخص ہے جسے (بعض نیک) لوگوں سے محبت ہے مگر وہ اس بات سے عاجز ہے کہ ان کے اعمال جیسے (اچھے عمل) کر سکے (تو اس کا انجام کیا ہو گا) حضورؐ نے فرمایا: ''اے ابوذرؓ تو انہیں کے ساتھ ہو گا جن سے تو نے محبت کی۔'' حضرت ابوذرؓ نے عرض کیا کہ بے شک میں تو اللہ اور اُس کے رسولؐ سے محبت رکھتا ہوں۔ حضورؐ نے (پھر وہی جملہ) فرمایا کہ بے شک تو اُنہیں کے ساتھ ہو گا جن سے تو نے محبت کی۔ حضرت عبداللہؓ بن صامت کہتے ہیں کہ ابوذرؓ نے پھر اپنی بات دہرائی اور حضورؐ نے پھر وہی جواب دہرا دیا (کہ تو اُنہیں کے ساتھ ہو گا جن سے تو نے محبت کی) (ابوداؤد)

ابوخلادؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم کسی ایسے شخص کو دیکھو جسے دنیا سے بے رغبتی ہو اور وہ کم گو بھی ہو تو اس کی قربت اختیار کرو۔ بلاشبہ اُسے دانائی سکھائی جائے گی۔ (ابن ماجہ)

امام شعبیؒ فرماتے ہیں: ''عالموں کی صحبت میں بیٹھو، اچھائیاں دیکھیں گے تو خوش ہوں گے، برائیاں دیکھیں گے تو معاف کر دیں گے، غلطی کرو گے تو جھڑکی نہیں دیں گے، بے عقلی کے کام کرو گے تو علم سکھائیں گے اور اگر گواہی کا موقع آیا تو سچی گواہی دے کر فائدہ پہنچائیں گے۔''

حمدون قصار صوفی نصیحت کرتے ہیں: ''جس شخص میں تجھے خیر نظر آئے اس سے کبھی مفارقت اختیار نہ کر، کیونکہ اس سے تجھے خیر کی برکات ضرور حاصل ہوں گی۔''

٦۔ احساسِ جواب دہی

حضرت عمرؓ فرماتے تھے:

”کاش میں ایک دُنبہ ہوتا۔ میرا مالک میری پرورش خوب اچھی طرح کرتا تاکہ میں خوب موٹا تازہ ہو جاتا۔ لوگ دُور دُور سے مجھے دیکھنے کے لیے آتے۔ پھر مجھے ذبح کیا جاتا اور میرا تھوڑا گوشت بھونا جاتا اور تھوڑا سا خشک کر لیا جاتا۔ پھر مجھے کھا لیا جاتا۔ مجھے یہ سب کچھ منظور تھا، لیکن میں انسان نہ ہوتا!“

کبھی فرماتے:

”کاش میں ایک تنکا ہوتا، یا کچھ بھی نہ ہوتا اور خدا نے مجھے پیدا ہی نہ کیا ہوتا؟

آپ ایسا کیوں سوچتے تھے؟ اور زندگی میں اسلام جیسی نعمت پانے کے بعد اور بڑے دُور رس نتائج رکھنے والے اعمال نیک کرتے رہنے کے باوجود آپ کی یہ تمنا کیوں تھی کہ میں دنیا میں نہ آیا ہوتا۔

آپ کے حالاتِ زندگی اور سیرت و اخلاق کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ آپ مواخذۂ آخرت سے بہت ڈرتے تھے۔ یہ احساس کہ ایک دن خدا کے حضور میں حاضر ہو کر اپنے اعمال کا جواب دینا ہے، اتنا گہرا تھا کہ بعض اوقات آپ کے دل میں خواہش پیدا ہو جاتی کہ کاش کہ مجھے یہ زندگی نہ ملی ہوتی تاکہ میں آخرت کی جواب دہی سے بچ جاتا۔

حضرت عمرؓ کے علاوہ دوسرے صالحین کی زندگیوں کا مطالعہ بھی ہمیں بتاتا ہے کہ ان نیکوکاروں کو عمر بھر آخرت کی جواب دہی کا دھڑکا لگا رہا اور پھر اس احساس نے ان کی زندگیوں پر کیا اثر ڈالا، ان کے حالاتِ زندگی اُسے بھی واضح کیے دیتے ہیں۔ اس خوف کے مارے کہ خدا کو اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔ انہوں نے معاملاتِ زندگی میں انتہائی دیانتداری سے کام لیا، اپنے فرائض تندہی سے انجام دیے، حقداروں کو ان کے حقوق پہنچائے، ملت کی عزت، آبرو اور سربلندی کے لیے جانیں لڑا دیں۔ دنیا اور اہل دنیا سے کم سے کم لیا اور انہیں زیادہ سے زیادہ دینے کی کوشش کی اور قومی خزانوں کی اپنی جان سے بڑھ کر حفاظت کی۔ مختصر یہ کہ اُن کے اس احساس نے کہ ہم نے خدا کے آگے اپنے اعمال کا جواب دینا ہے، ان کی زندگیوں کو انتہائی مفید اور بنی نوع انسان کے لیے عمومی اور ملت کے لیے خصوصی طور پر خدا کی رحمت بنا دیا۔

تزکیۂ نفس کے سلسلے میں یہ احساس جواب دہی اتنی اہمیت رکھتا ہے کہ صرف اسی کے گہرا ہو جانے سے انسان خود بخود ہی سدھرتا چلا جاتا ہے اور صرف اسی سے غفلت برتنا انسان کو غیر شعوری طور پر شیطان کا آلہ کار بنا دیتا ہے۔ لہٰذا جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کرنا ہو اس کے لیے استحضارِ آخرت لازمی ہے۔ یہ

استحضارِ آخرت: کیا ہے؟ ----- موت اور موت کے بعد جو کچھ بھی انسان کو پیش آنا ہے، اُس کو وقتاً فوقتاً ذہن میں حاضر کرنا اور اس پر غور و فکر کرنا، اس طرح کہ وہ دل پر اثر ڈالے اور جب دل پر واقعی اثر ہو گا اور بار بار ہوتا رہے گا تو پھر اعمال کا متاثر ہو جانا بھی انشاء اللہ لازمی ہے۔ استحضارِ آخرت کے لیے موت اور موت کے بعد کے احوال کے بارے میں جتنا زیادہ غور و فکر کیا جائے گا، اتنا ہی دل غفلت کی تاریکیوں سے نکل کر پیش آ کر رہنے والے حقائق کے مقابلے کی تیاری کرنے کی طرف متوجہ ہو گا۔ جیسے کہ بیان کیا جا چکا

محاسبہ

ہے۔ ہماری بد اعمالیوں کی تہہ میں زیادہ تر غفلت ہی کارفرما ہے۔ جان بوجھ کر برائیاں کرنے والے بہت کم ہوتے ہیں۔ اکثر برائیاں صرف اس لیے ہوتی ہیں کہ کبھی بھولے سے بھی یاد نہیں آتا کہ کہیں جا کر اپنے اعمال کا جواب بھی دینا ہے۔ استحضارِ آخرت چونکہ اسی بات کو دل میں جاگزین کرتا ہے کہ ایک دن جا کر اپنے اعمال کا حساب دینا ہے، اس لیے یہ برائیوں کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

قرآن پاک اور احادیث نبویؐ میں آخرت کے بارے میں جتنا مواد ملتا ہے، وہ اصلاحِ نفس کی ضرورت کے لیے کافی و وافی ہے۔ اس مواد کو بار بار پڑھنا، اسے ذہن نشین کرنا، پھر یہ تصور کرنا کہ ہم وہاں پہنچ گئے ہیں اور ان حقیقتوں سے براہ راست دوچار ہو رہے ہیں۔ یہی استحضارِ آخرت ہے اور نفس کا تزکیہ کرنے والا اگر اس استحضارِ آخرت سے کام لے گا تو اس کا مشکل کام بہت حد تک آسان ہو جائے گا۔ صحیح بخاری میں ایک لمبی سی حدیث بیان ہوئی ہے جس میں آخرت کے احوال انتہائی دل نشین انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ لوگوں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یارسول اللہؐ کیا ہم قیامت کے دن اپنے رب کو دیکھیں گے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ کیا تمہیں چودھویں رات کے چاند کو دیکھنے میں کوئی شک ہوتا ہے جب کہ اس کے اُوپر ابر (بھی) نہ ہو۔ لوگوں نے کہا نہیں یارسول اللہؐ۔ آپؐ نے فرمایا کہ کیا تمہیں سورج کو دیکھنے میں کوئی شک ہوتا ہے جب کہ اس کے اُوپر ابر (بھی) نہ ہو۔ لوگوں نے عرض کیا کہ نہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ بے شک تم اپنے رب کو اسی طرح دیکھو گے۔

(اس کے بعد حضورؐ نے قیامت کے مزید احوال بیان فرمائے اور ارشاد فرمایا کہ) قیامت کے دن لوگوں کو جمع کیا جائے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ جو کوئی جس کی پرستش کرتا تھا، اس کے پیچھے ہو لے۔ پس اُن میں سے بعض سورج کے پیچھے ہو لیں گے اور

ان میں سے بعض چاند کے پیچھے ہو لیں گے اور اُن میں سے بعض بتوں کے پیچھے ہو لیں گے۔ بس یہ اُمت باقی رہ جائے گی اور اس میں اس کے منافق بھی ہوں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ (ایسی صورت میں جسے وہ نہیں پہچانتے ہوں گے) ان کے پاس آئے گا اور کہے گا کہ میں تمہارا رب ہوں۔ وہ کہیں گے (ہم تمہیں نہیں جانتے) ہم تو اسی جگہ کھڑے رہیں گے۔ یہاں تک کہ ہمارا رب ہمارے پاس آ جائے۔ جب ہمارا رب آ جائے گا تو ہم اسے پہچان لیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ (ایسی شکل میں جسے وہ پہچانتے ہوں گے) ان کے پاس آئے گا اور فرمائے گا کہ میں تمہارا رب ہوں۔ تو وہ جواب دیں گے (ہاں واقعی) تو ہمارا رب ہے۔ پھر خدا اُنہیں بلائے گا اور جہنم کی پشت کے اُوپر راستہ بنایا جائے گا (اور انبیاء اپنی امتوں کے ساتھ اس پر سے گزریں گے) اور میں (ان) انبیاء میں سے پہلا ہوں گا جو اپنی امت کے ساتھ اس پر سے گزروں گا۔ اُس دن انبیاء کے سوا کوئی بات نہیں کر سکے گا اور انبیاء کا کلام اُس دن ہوگا۔ اَللّٰھُمَّ سَلِّمْ سَلِّمْ (اے خدا سلامتی عطا کر' سلامتی عطا کر) اور جہنم میں سعدان کے کانٹوں کی طرح آنکڑے ہوں گے۔

(پھر حضورؐ نے صحابہؓ سے مخاطب ہو کر پوچھا کہ) کیا تم نے سعدان کے کانٹے دیکھے ہیں۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ جی ہاں۔ (آپؐ نے فرمایا کہ) پس وہ (آنکڑے) سعدان کے کانٹوں کی طرح ہوں گے۔ البتہ اُن کی بڑائی کا اندازہ کسی کو نہیں سوائے خدا کے۔ پس وہ آنکڑے لوگوں کے اعمال کے مطابق انہیں اُچکیں گے۔ پس اُن میں بعض ایسے ہوں گے جو اپنے اعمال کے باعث (جہنم میں گر کر) ہلاک ہو جائیں گے اور ان میں بعض ایسے ہوں گے جو (مارے زخموں کے) ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ پھر (اس کے بعد) نجات پائیں گے۔ یہاں تک کہ جب اللہ رحمت کرنے کا ارادہ کرے گا تو اہلِ دوزخ میں سے جن لوگوں کے بارے میں اس کا یہ ارادہ ہوگا ان کے بارے میں فرشتوں کو حکم دے

گا کہ انہیں (دوزخ سے) نکال لیں (یعنی اُن کو) جو اللہ کی عبادت کرتے رہے ہوں گے۔ پس فرشتے انہیں نکال لیں گے اور انہیں سجدوں کے نشانات سے پہچانیں گے اور (حضورؐ نے بتایا کہ) اللہ نے آگ پر یہ بات حرام کر دی ہے کہ وہ سجدوں کے نشانات کو کھائے۔ پس وہ (لوگ جنہیں خدا دوزخ سے نکالے جانے کا حکم دے گا) دوزخ سے نکلیں گے۔ جہنم کی آگ انسان کے تمام جسم کو کھائے گی سوائے سجدوں کے نشان کے۔ پس وہ آگ سے نکلیں گے تو بالکل جل چکے ہوں گے۔ پھر اُن پر آبِ حیات ڈالا جائے گا تو (اس کے ڈالے جانے سے) وہ ایسے (تروتازہ) نکل آئیں گے جیسے داخل کے لائے ہوئے کوڑے کچرے میں اُگتا ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ بندوں کے درمیان فیصلہ کرنے سے فارغ ہو جائے گا اور ایک شخص دوزخ اور جنت کے درمیان باقی رہ جائے گا اور وہ اہلِ دوزخ میں سے آخری شخص ہوگا جو جنت میں داخل ہوگا۔ اس کا منہ دوزخ کی طرف ہوگا۔ وہ کہے گا کہ اے میرے رب میرے چہرے کو دوزخ کی طرف سے پھیر دے کیونکہ اس کی ہوا نے مجھے زہر آلود کر دیا ہے اور اس کے شعلے نے مجھے جلا دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ کیا تو ایسا تو نہ کرے گا کہ اگر تیرے ساتھ یہ (احسان) کر دیا جائے تو تو اس کے علاوہ اور کچھ مانگے۔ تو وہ کہے گا کہ نہیں، تیری بزرگی کی قسم (میں اور کچھ نہیں مانگوں گا) پھر وہ (اس بات پر) اللہ تعالیٰ سے جتنا کہ وہ چاہے گا پختہ عہد و پیمان کرے گا تو خدا اس کے چہرے کو آگ کی طرف سے پھیر دے گا۔ پھر جب وہ جنت کی طرف منہ کر لے گا تو اس کی تروتازگی کو دیکھے گا (پھر) جتنی دیر خدا کو منظور ہوگا، خاموش رہے گا۔ پھر عرض کرے گا کہ اے میرے رب، مجھے جنت کے دروازے سے قریب کر دے۔ اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا کہ کیا تو نے قول و قرار نہیں کیے تھے کہ جو کچھ مانگ چکا ہے اس کے سوا اور کچھ نہیں مانگے گا۔ وہ عرض کرے گا کہ اے میرے پروردگار، مجھے تیری مخلوق میں سب سے زیادہ بدنصیب نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ

فرمائے گا کہ کہیں ایسے تو نہ ہو گا کہ اگر تجھے یہ (بھی) دے دیا جائے تو تو اس کے علاوہ کسی اور شے کا سوال کر دے۔ تو وہ عرض کرے گا کہ نہیں تیری بزرگی کی قسم' میں اس کے سوا کسی اور شے کا سوال نہیں کروں گا۔ پھر جتنا خدا کو منظور ہو گا' وہ اسے قول و قرار دے گا تو اللہ اُسے جنت کے دروازے کے قریب کر دے گا۔ پھر جب وہ جنت کے دروازے پر پہنچ جائے گا تو اس کی شگفتگی اور اس میں پائی جانے والی تروتازگی اور سرور کو دیکھے گا' تو پھر جتنی دیر خدا کو منظور ہو گا خاموش رہے گا۔ پھر عرض کرے گا کہ اے میرے پروردگار' مجھے جنت میں داخل کر دے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اے ابن آدمؑ تیری خرابی ہو' تو کس قدر عہد شکن واقع ہوا ہے۔ کیا تو نے یہ عہد و پیمان نہیں کیا تھا کہ جو کچھ تجھے دیا جا چکا ہے' اس کے سوا اور کچھ نہیں مانگے گا۔ تو وہ عرض کرے گا کہ اے میرے پروردگار' مجھے اپنی مخلوق میں سے سب سے زیادہ بدنصیب نہ بنا۔ پس اللہ تعالیٰ اس (کی باتوں) پر ہنس پڑے گا۔ پھر اسے جنت میں داخل ہونے کی اجازت دے دے گا۔ پھر اس سے فرمائے گا کہ تو آرزو کر۔ پس وہ آرزوئیں میں بیان کرنے لگے گا یہاں تک کہ اس کی آرزوئیں ختم ہو جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ یہ اور یہ چیز اور مانگ۔ اس کا پروردگار اُسے یاد دلانے لگے گا (کہ تو یہ بھی مانگ اور وہ بھی مانگ) یہاں تک کہ اس کی تمام خواہشیں ختم ہو جائیں گی (پھر) اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تجھے یہ (سب کچھ) بھی دیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ اتنا ہی اور بھی (بخاری)

موت کے مرحلے سے لے کر کوئی ابدی ٹھکانہ مل جانے تک انسانی روح جن جن مراحل میں سے گزرتی ہے اُنہیں وقتاً فوقتاً یاد کرتے رہنا دل کو صحت مند اور بیدار رکھتا ہے۔ روح کا جسم سے علیحدگی اختیار کرنا' پھر عالمِ برزخ کی زندگی گزارنا' پھر قیامت کا وقوع' انسان کا اپنے اعمال کا سامنا کرنا' ان اعمال کی جانچ پڑتال ہونا اور نتیجتاً جنت یا دوزخ میں ٹھکانہ بن جانا۔ یہ سب وہ احوال ہیں جن کا سامنا کیے بغیر چارہ نہیں اور جن احوال کا سامنے

کیے بغیر چارہ نہ ہو انہیں وقتاً فوقتاً یاد کرتے رہنا اور اُن پر غور و فکر کرنا ازبس ضروری ہے۔

صالحین ان تمام مراحل کو ذہن میں تازہ رکھتے تھے اور ان کی تیاری کی فکر میں رہتے تھے۔

حضرت عمرؓ کی انگوٹھی کا نقش تھا:

”کَفٰی بِالْمَوْتِ وَاعِظًا یَا عُمَرُ.“

(اے عمر، موت (تیرے لیے) کافی ناصح ہے)

حضرت سلمہ بن دینار کا فرمان ہے کہ ”وہ تمام اعمال جن کی وجہ سے موت کا آنا گراں گزرتا ہو انہیں چھوڑ دو، پھر جس وقت بھی موت آجائے تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔“

ایک شخص حضرت شقیق بلخیؒ کے پاس آیا اور درخواست کی کہ مجھے نصیحت کیجیے۔

آپ نے فرمایا:

”اگر دوست چاہتا ہے تو تجھے خدا عزوجل کافی ہے،

اگر ہمراہی چاہتا ہے تو کراماً کاتبین کافی ہیں،

اگر مونس چاہتا تو قرآن کافی ہے،

اگر کام چاہتا ہے تو عبادت کافی ہے،

اگر وعظ چاہتا ہے تو موت کافی ہے،“

اور آخر میں آپ نے فرمایا کہ:

”جو کچھ کہا گیا ہے اگر تجھے پسند نہیں تو تجھے دوزخ کافی ہے۔“

حضرت عمرؓ قبر کی زندگی سے اتنے خوفزدہ رہتے تھے کہ فرماتے تھے:

”اگر میرے پاس دنیا جہاں کی دولت و ثروت ہوتی تو اسے بھی اس دہشت و سراسیمگی سے بچنے کے لیے دے دیتا جو قبر میں عالمِ برزخ کی زندگی کے شروع میں طاری ہوگی۔“

اولیاء اللہؒ اور صوفیاء میں ایک اصطلاح رائج ہے "مراقبہ۔" عام سادے الفاظ میں اس کا مفہوم بیان کریں تو یہ ہوگا کہ کسی خاص خیال پر حضوریٔ دل کے ساتھ پوری پوری توجہ مرکوز کرنا۔ مفتی محمد حسنؒ فرماتے ہیں:

"یہ مراقبہ کرنا چاہیے کہ میرے تمام اعمال کو میرے تمام اعضاء میں جذب کیا جا رہا ہے یعنی جس عضو کا جو عمل ہے اس عضو میں وہ عمل جذب کیا جا رہا ہے، جیسے گراموفون کا ریکارڈ بنایا جاتا ہے اور قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ کے حکم کی سوئی اسے لگے گی تو ہر جوڑ بولنے لگے گا۔ آنکھ کہے گی میں نے بدنیتی سے دیکھا تھا۔ کان، ناک وغیرہ کہیں گے کہ ہم نے بدنیتی سے سنا اور سونگھا تھا۔ اسی طرح تمام اعضاء سے آواز نکلے گی۔ پھر اس آواز کو کوئی نہیں بند کرسکتا---- اس مراقبے سے عمل میں چستی اور گناہوں سے بچنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ مگر یہ کرنے کے کام ہیں۔ نرے دعوے سے کچھ نہیں ہوتا۔"

شاعرِ مشرق حضرت علامہ اقبالؒ نے "رموز بیخودی" میں اپنے بچپن کا ایک واقعہ نقل کیا ہے اور اسے بیان کرتے ہوئے روز قیامت کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار کے قائم ہونے اور اس میں ایک خطا کار کے خلاف ایک مظلوم کی فریاد کرنے کا اس طرح نقشہ کھینچا ہے کہ پڑھنے والے کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا وہ سب کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے۔ اصل اشعار فارسی میں ہیں یہاں ان کا ترجمہ نقل کیا جاتا ہے۔

"ایک فقیر نے، نہ ٹلنے والی قضا کی طرح، ہمارے دروازے پر مسلسل صدا لگانی شروع کردی۔ میں نے غصے کے مارے اس کے سر پر ایک لاٹھی ماری تو جو کچھ وہ مانگ کر لایا تھا اس کی جھولی سے نیچے گر گیا (یہ ناروا حرکت مجھ سے اس لیے سرزد ہوگئی کہ) عنفوانِ شباب میں انسان کی عقل صحیح اور غلط کے بارے میں کچھ نہیں سوچ سکتی۔

میری اس بدمزاجی کو دیکھ کر میرے والد سخت آزردہ ہوئے اور اُن کا سرخ وسفید

چہرہ افسردہ ہو گیا۔ ان کے ہونٹوں سے ایک جگر سوز آہ نکلی اور ان کا دل غم کے باعث سینے میں تڑپ اٹھا۔ ان کی آنکھ میں ایک آنسو پیدا ہوا جو ان کی پلکوں پر چمکا اور پھر نیچے گر گیا۔

(انہیں اتنا غمناک دیکھ کر) میرا غافل دل میرے سینے میں اس طرح لرزنے لگا جس طرح خزاں کے موسم میں پرندہ بادِ سحر کے خوف سے اپنے گھونسلے کے اندر بیٹھا لرزتا رہتا ہے۔

(پھر میرے والد نے مجھے مخاطب کر کے) فرمایا (کہ بیٹا ذرا خیال تو کرو کہ) کل قیامت کے دن جب خیر الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری اُمت آپؐ کے گرد جمع ہو گی، اُن میں آپؐ کی روشن ملت کے غازی بھی ہوں گے، اُن میں آپؐ کی دلکش شریعت کے فقہاء بھی ہوں گے، اُن میں وہ (عالی وقار) شہید بھی ہوں گے جو ملت کی فضاء میں ستاروں کی طرح روشن ہیں، ان میں عابد و زاہد لوگ بھی ہوں گے ---- عاشقانِ الٰہی بھی ہوں گے، عالمانِ دین بھی ہوں گے اور وہ گنہگار بھی ہوں گے، جو اپنے گناہوں پر نادم ہو چکے ہوں گے۔ پھر اس (عالی وقار) محفل میں یہ فقیر آ کر اپنی فریاد بلند کرے گا (اور تیرے اس ظلم کی حضورؐ سے شکایت کرے گا) اس پر حضورؐ مجھ سے مخاطب ہو کر فرمائیں گے کہ خدا نے ایک مسلمان جوان تیرے سپرد کیا تھا۔ تو اسے خلقِ محمدیؐ سے بہرہ ور نہ کر سکا؟ ---- کیا تجھ سے یہ آسان سا کام بھی نہ ہو سکا کہ مٹی کے ایک تودے کو (جو تیرے سپرد کیا گیا تھا) انسان بنا دیتا؟ ---- اے وہ کہ اعمال نیک نہ ہونے کے باعث تیرا پل صراط سے گزرنا مشکل ہے (مجھے بتا کہ جب حضورؐ اس بھرے مجمع میں مجھ سے یہ سوال فرمائیں گے تو) میں کیا جواب دوں گا...... اے بیٹے (قیامت کے دن) اُس خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے اُس اجتماع کا تصور کر اور پھر میری اس سفید ڈاڑھی کو دیکھ (اور خیال کر کہ تیری اس ناروا حرکت کے باعث اُس وقت میرا کیا حال ہو گا اور کس طرح) مجھ پر امید و بیم کا لرزہ طاری ہو گا۔ اے

بیٹے اپنے باپ پر یہ ظلم مت کر۔ اپنے آقا و مولا کے سامنے میری رسوائی کا سامان نہ کر۔“

کلام پاک اور احادیث نبویؐ دونوں میں ہمیں وہ مواد کافی و وافی مل جاتا ہے۔ جس میں آخرت کے مختلف مناظر کی انتہائی خوبصورتی سے عکاسی کی گئی ہے۔ ان عبارات کو پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا ہمیں برائی کا بُرا اور اچھائی کا اچھا انجام بچشم خود نظر آ رہا ہے۔ اس مواد کو وقتاً فوقتاً دیکھتے رہنا، اس پر غور و فکر کرنا، اپنے اُن احوال سے دوچار ہونے کو چشم تصور میں لاتے رہنا، دل میں وہ بیداری اور گداز پیدا کرتا ہے جس سے تزکیۂ نفس کی مہم آسان تر ہوتی چلی جاتی ہے۔

صحیح بخاری میں ایک لمبی سی حدیث بیان ہوئی ہے جس میں حضورؐ نے بیان فرمایا ہے کہ کس طرح آپؐ کو مختلف گناہوں کے اخروی عذاب دکھلائے گئے۔

حضرت سمرۃؓ بن جندب بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اکثر اپنے اصحابؓ سے فرمایا کرتے کہ کیا تم میں سے کسی نے کوئی خواب دیکھا ہے۔ پھر جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ چاہتا، وہ آپؐ کو اپنا خواب بتاتا۔ ایک صبح حضورؐ نے فرمایا کہ کل رات میرے پاس دو آنے والے آئے اور مجھے اٹھایا اور مجھ سے کہا کہ چلیے اور میں ان کے ساتھ چل پڑا۔ ہم ایک شخص کے پاس پہنچے جو لیٹا ہوا تھا اور ایک دوسرا شخص ایک پتھر پکڑے ہوئے اس کے پاس کھڑا تھا۔ وہ اس کے سر پر پتھر پھینک کر مارتا، جس سے اس کا سر پھٹ جاتا اور پتھر دُور لڑھک جاتا۔ پھر وہ شخص اس پتھر کے پیچھے جاتا اور اُسے پکڑ لیتا، اور ابھی وہ اس (لیٹے ہوئے شخص) کے پاس واپس نہ آیا ہوتا کہ اس کا سر ویسے ہی ٹھیک ہو جاتا جیسے پہلے ہوتا۔ پھر وہ (مارنے والا) اس کے پاس لوٹ کر آتا اور اس کے ساتھ اسی طرح کرتا جیسے پہلے کیا ہوتا۔

حضورؐ نے فرمایا کہ میں نے ان دونوں (ساتھیوں) سے کہا: ”سبحان اللہ! یہ دونوں کون ہیں؟“ تو انہوں نے مجھے (صرف یہی) کہا کہ (آگے) چلیے۔ پس ہم چل

پڑے اور ایک ایسے شخص کے پاس آئے جو پشت کے بل چت لیٹا ہوا تھا اور ایک دوسرا آدمی لوہے کا ایک آنکڑا لیے اس کے پاس کھڑا تھا۔ وہ اس کے چہرے کے ایک حصے کی طرف آتا اور (اس آنکڑے سے) اس کے چہرے کو گدی تک چیرتا اور اس کے نتھنے کو گدی تک چیرتا اور اس کی آنکھ کو گدی تک چیرتا۔

(اس حدیث کے ایک راوی) عوفؒ بیان کرتے ہیں کہ (اس حدیث کے ایک اور راوی) ابو رجاءؒ اکثر یوں کہا کرتے کہ وہ (آنکڑے والا شخص ایک طرف) چیر کر پھر (چہرے کی) دوسری جانب جاتا اور اس طرف بھی ویسے ہی کرتا جیسے پہلی جانب کیا ہوتا اور ابھی وہ اس جانب سے فارغ نہ ہوا ہوتا کہ وہ (پہلی) جانب ٹھیک ٹھاک ہو کر ویسی ہی ہو جاتی جیسی کہ (چیرے جانے سے) پہلے ہوتی۔ پھر وہ لوٹ کر اسی جانب آتا اور اس کے ساتھ ویسے ہی کرتا جیسے پہلی بار کیا ہوتا۔

حضورؐ نے فرمایا کہ میں نے کہا: ''میں اللہ کی پاکی بیان کرتا ہوں۔ یہ دونوں کون ہیں؟'' میرے ان دونوں ساتھیوں نے کہا کہ (آگے) چلیے۔ پس ہم چل پڑے۔

پھر ہم ایک تنور جیسے (گڑھے) کے پاس پہنچے...... ہم نے جھانک کر اس میں دیکھا تو اس میں کچھ مرد اور عورتیں برہنہ نظر آئے۔ ان کے نیچے سے ان کی طرف آگ کی لپٹ آتی تھی۔ جب وہ لپٹ ان تک پہنچتی تو وہ زور زور سے چیخنے لگتے۔

حضورؐ نے فرمایا کہ میں نے (پھر) ان دونوں (ساتھیوں) سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں تو انہوں نے مجھے (پھر ویسے ہی) کہا کہ (آگے) چلیے (آگے) چلیے۔ پس ہم چلے اور ایک نہر کے پاس پہنچے........... اس نہر میں ایک آدمی تیر رہا تھا اور نہر کے کنارے ایک (اور) آدمی تھا۔ جس کے پاس بہت سے پتھر جمع تھے۔ جب وہ تیرنے والا تیرتا تیرتا اس آدمی کے پاس آ جاتا، جس کے پاس پتھر جمع تھے تو اس کے سامنے اپنا منہ کھول دیتا تو وہ

اس کے منہ میں ایک پتھر ڈال دیتا۔ پھر وہ تیرتا ہوا چلا جاتا۔ پھر اس کی طرف لوٹتا۔ جب بھی وہ لوٹ کر اس کے پاس آتا، اس کے آگے منہ کھول دیتا اور وہ پھر اس کے منہ میں ایک پتھر ڈال دیتا۔

حضورؐ نے فرمایا کہ میں نے ان دونوں (ساتھیوں) سے کہا کہ یہ دونوں کون ہیں۔ تو انہوں نے (پھر اسی طرح) کہا کہ (آگے) چلیے (آگے) چلیے۔ اتنی حدیث بیان کرنے کے بعد حضورؐ نے اور بھی عجیب و غریب باتیں بیان کیں، جو آپؐ نے وہاں دیکھی تھیں اور آخر میں حضورؐ نے بتایا کہ میں نے اپنے ان ساتھیوں سے کہا کہ آج رات میں نے عجیب و غریب چیزیں دیکھی ہیں، تو تم مجھے بتاؤ کہ جو کچھ میں نے دیکھا ہے یہ سب کیا مطلب رکھتا ہے۔ اس پر ان دونوں نے حضورؐ کو بتایا کہ:

وہ پہلا آدمی جس کے پاس آپؐ پہنچے تھے، جس کا سر پتھر سے توڑا جا رہا تھا، یہ وہ ① آدمی تھا جس نے قرآن کا علم حاصل کیا اور پھر اُسے چھوڑ دیا اور فرض نماز سے غفلت برتی اور وہ آدمی جس کے پاس آپؐ پہنچے تو اس کا جبڑا گدی تک چیرا جا رہا تھا، اور اس کا نتھنا گدی تک چیرا جا رہا تھا اور اس کی آنکھ گدی تک چیری جا رہی تھی، ② تو یہ وہ شخص تھا جو صبح اپنے گھر سے نکل کر کوئی ایسی جھوٹی بات کرتا تھا جو ساری دنیا میں پھیل جاتی تھی، ③ اور وہ برہنہ مرد اور عورتیں جو تنور کی مانند جگہ میں تھیں تو یہ بدکار مرد اور عورتیں تھیں۔ اور وہ شخص جس کے پاس آپؐ پہنچے تو وہ نہر میں تیر رہا تھا اور اس کے منہ میں پتھر ڈالا جا رہا تھا، تو وہ سود خور ④ تھا۔۔۔۔۔۔ (بخاری)

جھوٹی افواہ
پھیلانا

دیکھے جانے کا احساس: استحضارِ آخرت کے علاوہ جو شے تزکیہ نفس کے سلسلے میں از حد مفید ہو سکتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ انسان کو یہ احساس رہے کہ اللہ تعالیٰ ہمہ وقت اسے دیکھ رہا ہے اور کراماً کاتبین یعنی وہ فرشتے جو اس کے اعمال لکھنے کے لیے ہمہ وقت اس کے ساتھ

رہتے ہیں، اس کی ایک ایک حرکت اور ایک ایک لفظ کو قلمبند کیے جا رہے ہیں۔ سورۃ ملک، آیات ۱۲، ۱۳ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

”جو لوگ بے دیکھے اپنے رب سے ڈرتے ہیں یقیناً اُن کے لیے مغفرت ہے اور بڑا اجر ہے۔ تم خواہ چپکے سے بات کرو یا اونچی آواز سے (اللہ کے لیے یکساں ہے) وہ تو دلوں کا حال تک جانتا ہے۔“

ان آیات کی تشریح کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے:

”یہ دین میں اخلاق کی اصل جڑ ہے۔ کسی کا برائی سے اس لیے بچنا کہ اس کی ذاتی رائے میں وہ برائی ہے یا دنیا اسے برا سمجھتی ہے یا اس کے ارتکاب سے دنیا میں کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے یا اس پر کسی دنیوی طاقت کی گرفت کا خطرہ ہے، یہ اخلاق کے لیے ایک بہت ہی ناپائدار بنیاد ہے۔ آدمی کی ذاتی رائے غلط بھی ہو سکتی ہے، وہ اپنے کسی فلسفے کی وجہ سے ایک اچھی چیز کو بُرا اور ایک بُری چیز کو اچھا سمجھ سکتا ہے۔ دنیا کے معیارِ خیر وشر اول تو یکساں نہیں ہیں، پھر وہ وقتاً فوقتاً بدلتے بھی رہتے ہیں۔ کوئی عالمگیر اور ازلی وابدی معیار دنیا کے اخلاقی فلسفوں میں نہ آج پایا جاتا ہے نہ کبھی پایا گیا ہے۔ دنیوی نقصان کا اندیشہ بھی اخلاق کے لیے کوئی مستقل بنیاد فراہم نہیں کرتا۔ جو شخص برائی سے اس لیے بچتا ہو کہ وہ دنیا میں اس کی ذات پر مترتب ہونے والے کسی نقصان سے ڈرتا ہے۔ وہ ایسی حالت میں اس کے ارتکاب سے باز نہیں رہ سکتا جب کہ اس سے کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو۔ اسی طرح کسی دنیوی طاقت کی گرفت کا خطرہ بھی وہ چیز نہیں ہے جو انسان کو ایک شریف انسان بنا سکتی ہو۔ ہر شخص جانتا ہے کہ کوئی دنیوی طاقت بھی عالم الغیب والشہادۃ نہیں ہے۔ بہت سے جرائم اس کی نگاہ سے بچ کر کیے جا سکتے ہیں اور ہر دنیوی طاقت سے بچنے کی بے شمار تدبیریں ممکن ہیں۔ پھر کسی دنیوی طاقت کے قوانین بھی تمام برائیوں کا احاطہ نہیں کرتے۔

بیشتر برائیاں ایسی ہیں جن پر دنیوی قوانین کوئی گرفت سرے سے کرتے ہی نہیں، حالانکہ وہ ان برائیوں سے قبیح تر ہیں جن پر وہ گرفت کرتے ہیں۔ اس لیے دینِ حق نے اخلاق کی پوری عمارت اس بنیاد پر کھڑی کی ہے کہ اُس ان دیکھے خدا سے ڈر کر برائی سے اجتناب کیا جائے جو ہر حال میں انسان کو دیکھ رہا ہے، جس کی گرفت سے انسان بچ کر کہیں جا نہیں سکتا، جس نے خیر و شر کا ایک ہمہ گیر، عالمگیر اور مستقل معیار انسان کو دیا ہے۔ اسی کے ڈر سے بدی کو چھوڑنا اور نیکی کو اختیار کرنا وہ اصل بھلائی ہے جو دین کی نگاہ میں قابلِ قدر ہے۔ اس کے سوا کسی دوسری وجہ سے اگر کوئی انسان بدی نہیں کرتا یا اپنی ظاہری شکل کے اعتبار سے جو افعال نیکی میں شمار ہوتے ہیں، اُن کو اختیار کرتا ہے تو آخرت میں اس کے یہ اخلاق کسی قدر اور وزن کے مستحق نہ ہوں گے، کیونکہ اُن کی مثال اس عمارت کی سی ہے جو ریت پر تعمیر ہوئی ہو۔“

(تفہیم القرآن، جلد ۶، صفحہ ۴۶، ۴۸)

سورۂ یونس، آیت ۲۱ میں کراماً کاتبین کے بارے میں ارشاد ہوا ہے:

اِنَّ رُسُلَنَا یَکْتُبُوْنَ مَا تَمْکُرُوْنَ ○ (بلاشبہ ہمارے فرشتے تمہاری سب مکاریوں کو قلم بند کر رہے ہیں)

انسان بالکل ہی شیطان نہ بن جائے، ورنہ دل میں اس احساس کا موجود رہنا کہ ہم جو کچھ بھی کہہ رہے ہیں یا کر رہے ہیں، برابر سنا جا رہا ہے اور لکھ کر محفوظ کیا جا رہا ہے، انسان کو اپنے اقوال و افعال کے بارے میں بہت محتاط کر دیتا ہے۔

سورۂ یونس، آیت ۶۱ میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

”(اے نبیؐ) تم جس حال میں بھی ہوتے ہو اور قرآن میں سے جو کچھ بھی سناتے ہو اور (اے لوگو) تم بھی جو کچھ کرتے ہو، اس سب کے دوران میں ہم تم کو دیکھتے رہتے ہیں۔ کوئی ذرہ برابر چیز آسمان اور زمین میں ایسی نہیں ہے، نہ چھوٹی نہ بڑی، جو (ا

نبیؐ) تیرے رب کی نظر سے پوشیدہ ہو اور ایک صاف دفتر میں درج نہ ہو۔"

"......اللہ ان کے چھپے کو بھی جانتا ہے اور کھلے کو بھی، وہ تو اُن بھیدوں سے بھی واقف ہے جو سینوں میں ہیں۔" (ہود: ۵)

حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں: "ایمان کا افضل ترین درجہ یہ ہے کہ تم ہر وقت خدا کو اپنے ساتھ سمجھتے رہو۔"

اس کا درجہ افضل ترین اس لیے ہے کہ جو شخص ہر وقت خدا کو اپنے ساتھ سمجھے گا اُسے برائی کرتے شرم آئے گی اور یہ شرم اُسے ان اعمال بد سے بچالے گی جو ایمان کے افضل ترین درجے کی راہ کی رکاوٹ ہیں۔ انسان کی فطرت ہے کہ وہ انسانوں میں سے بھی جس شخص کو اچھا اور محترم سمجھتا ہو، اس کے سامنے برائی کرتے اُسے شرم آتی ہے۔ کجا وہ ہستی جو تمام اقسام کی اچھائیوں کی خالق ہے، اگر اس کے بارے میں یہ احساس رہے گا کہ وہ ہر وقت ساتھ ہے اور ہر عمل کو دیکھ رہی ہے تو انسان خود بخود ہی برائی سے رُکے گا۔ انسان کا دھڑلے سے برائی کرتے رہنا اس لیے ہے کہ وہ خدا کو بصیر مان کر بھی یہ بھولا رہتا ہے کہ وہ بصیر اسے دیکھ رہا ہے۔

سید عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں:

"جب انسان گناہ کرتے وقت اپنے دروازوں کو بند کر لیتا ہے، پردے ڈال دیتا ہے اور مخلوق سے چھپ جاتا ہے اور تنہائی میں خدا کی نافرمانی کرتا ہے تو حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے آدمؑ کے بیٹے، تو نے اپنی طرف دیکھنے والوں میں سب سے زیادہ مجھی کو کمتر سمجھا ہے کہ سب سے پردہ کرنا ضروری سمجھتا ہے اور مجھ سے مخلوق کے برابر بھی شرم نہیں کرتا۔"

نیز آپؒ فرماتے ہیں: "اے ابن آدمؑ، خدا سے اتنا تو شرما جتنا تو اپنے دیندار پڑوسی سے شرماتا ہے۔"

فرصتِ حیات غنیمت ہے: حضرت علیؓ نے فرمایا: ''دنیا پشت پھیر کر جا رہی ہے اور آخرت منہ سامنے کر کے آ رہی ہے اور ان دونوں میں سے ہر ایک کے فرزند (یعنی چاہنے والے) ہیں۔ پس تم آخرت کے فرزند بنو اور دنیا کے فرزند نہ بنو۔ اس لیے کہ آج عمل کا دن ہے اور حساب نہیں اور کل حساب کا دن ہو گا اور عمل نہیں ہو گا۔'' (بخاری)

چونکہ یہ ''آج'' بڑا ہی مختصر ہے اس لیے عمل کی مدت بہت کم ہے اور جس ''کل'' میں اس عمل کے نتائج ظاہر ہونے ہیں، اس کی تو کوئی انتہا ہی نہیں ہے۔ تو پھر انسان کو کیا ہو گیا ہے کہ اس مختصر سی مدت کو ضائع کر رہا ہے اور اس لامتناہی مدت کے فوائد سے مجرمانہ غفلت برت رہا ہے! اگر کسی مزدور سے کہا جائے کہ ایک گھنٹہ محنت سے کام کر لو، پھر پورا سال آرام کرنا، مگر تمہاری مزدوری تمہیں باقاعدہ ملتی رہے گی، تو وہ اسے انتہائی نفع کا سودا سمجھے گا اور اس ایک گھنٹے کے ایک سیکنڈ کو بھی ضائع نہیں کرنا چاہے گا۔ گھنٹے اور سال کا تو آپس میں پھر بھی کچھ تناسب بنتا ہے مگر دنیوی زندگی اور اخروی زندگی کا تو آپس میں کوئی تناسب ہی نہیں ہے کیونکہ اخروی زندگی کا کوئی دوسرا کنارہ نہیں ہے کہ اس کی مدت کو ناپا جا سکے، تو پھر اللہ تعالیٰ اگر تھوڑی سی مدت کی محنت کے عوض بے پایاں انعامات دینا چاہ رہے ہیں تو کیا انسان پاگل ہے کہ اس پیش کش سے احمقانہ غفلت برتتے جا رہا ہے۔

اصل میں بات یہ ہے کہ کسی چیز کو جاننے کی حد تک جاننا اور بات ہے اور اُس پر ایسا سچا قلبی یقین ہونا کہ انسان اس کی روشنی میں عمل کرنے پر مجبور ہو جائے ایک بالکل دوسری بات ہے۔ جاننے کی حد تک تو ہم جانتے ہیں کہ زندگی بے ثبات اور آخرت بے کنارہ ہے اور اس بے ثبات کے دوران کیا ہوا کام لازماً اس بے کنارہ میں فائدہ دے گا، مگر اس جاننے کو اس سچے قلبی یقین کی حیثیت حاصل نہیں ہے کہ یہ ہمیں نیک عملی پر مجبور بھی کر دے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دنیوی اعمال کے اخروی فوائد پر ایمان رکھتے ہوئے بھی بے عمل بلکہ بدعمل بنے

رہتے ہیں۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں: ”جو ایمان رکھتا ہے کہ آخرت دنیا سے بہتر ہے، وہ سب احتیاطیں کرسکتا ہے۔“

حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا شانہ پکڑ کر فرمایا کہ دنیا میں اس طرح رہو گویا کہ تم اجنبی یا مسافر ہو۔ (اس کے بعد) حضرت ابن عمرؓ (کا یہ حال تھا کہ وہ) فرمایا کرتے تھے کہ جب شام ہو جائے تو صبح کا انتظار نہ کر، اور جب صبح ہو جائے تو شام کا منتظر نہ رہ۔ اپنے صحت کے زمانے سے اپنے مرض کے زمانے کے لیے حصہ لے لے اور اپنی زندگی سے اپنی موت کے لیے حصہ لے لے۔ (بخاری)

صحت کے زمانے سے مرض کے زمانے کے لیے حصہ لینا اور زندگی سے موت کے لیے حصہ لینا یہی ہے کہ صحت کو غنیمت جانتے ہوئے اتنا عمل کرلے کہ بیماری کے دوران جب کچھ نہ کرسکے گا تو نقصان نہ ہو اور زندگی کے دوران اتنا عمل کرلے کہ آخرت میں جہاں عمل کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہوگی، اس زندگی میں کیے ہوئے اعمال تیرے کام آئیں۔

عام طور پر تو ہم یہی سمجھتے ہیں کہ جس انسان کے دل میں آخرت کی محبت ہوگی وہ نیک اعمال کرے گا۔ مگر حضرت مجدد الف ثانی فرماتے ہیں:

”دنیا کی محبت آخرت کی رغبت سے دُور ہوتی ہے اور آخرت کی رغبت اعمالِ صالحہ بجالانے پر منحصر ہے۔“

اس سے واضح ہوتا ہے کہ نیک اعمال کرنے سے دل میں آخرت کی رغبت پیدا ہوگی اور پھر جب آخرت کی رغبت پیدا ہو جائے گی تو وہ دنیا کی محبت کو ختم کردے گی۔ تو گویا کہ دل میں آخرت کی رغبت محسوس نہیں ہو رہی تو نیک اعمال کی طرف توجہ دی جائے تاکہ دل میں آخرت کی رغبت پیدا ہو۔ کیونکہ آخرت کی کامیابی ہی اصل فیصلہ کن چیز ہے۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں: ”تیرے نفس کی قیمت جنت ہے۔ پس تو اسے جنت ہی کے عوض بیچ!“

۷۔ تبلیغِ دین

تزکیۂ نفس کے سلسلے میں آخری مگر از حد اہم بات یہ ہے کہ اپنے نفس کے تزکیہ کے ساتھ ساتھ دوسروں کے نفوس کے تزکیے کی کوشش بھی جاری رکھی جائے، یعنی دین کی تبلیغ کا کام بھی ساتھ ساتھ کیا جاتا رہے۔ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اپنے نفس کا تزکیہ کرنا اور دین کی تبلیغ کرنا، دو علیحدہ علیحدہ کام ہیں۔ مگر درحقیقت یہ دونوں چیزیں ایک ہی کام کے دو حصے ہیں۔ سورۂ آل عمران، آیت ۱۱۰ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ .... بِاللّٰهِ.

(اب دنیا میں وہ) بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں (کی ہدایت اور اصلاح) کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور خدا پر ایمان رکھتے ہو۔)

اب اگر مسلمانوں نے لوگوں کو نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کا فریضہ سرانجام دینا ہے تو اس کے لیے ناگزیر ہے کہ پہلے وہ خود نیکی کے عامل بنیں اور برائی سے رُک جائیں، کیونکہ جب تک وہ خود ایسا نہ کریں گے دُوسروں پر اُن کی تبلیغ کچھ اثر نہیں کرے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک تو بے عمل انسان کی زبان میں اثر نہیں ہوتا، دوسرے جب لوگ دیکھیں گے کہ نیکی کی طرف دعوت دینے والے کی اپنی زندگی نیکیوں سے خالی ہے

تو وہ کاہے، کے لیے اس کی نصائح پر کان دھریں گے۔ گویا تزکیہ نفس تبلیغِ دین ہی کا ایک حصہ ہے۔

اب دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اپنے نفس کا تزکیہ کرنے والا وہی نیک صفات جنہیں وہ اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہے، اگر دوسروں کے سامنے بھی پیش کرتا رہے تو وہ چیزیں اس کے اپنے دل میں زیادہ اچھی طرح نقش ہو جاتی ہیں۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں:

"تبلیغ کرنے سے وہ بات اپنے دل میں پختہ ہو جاتی ہے۔ دوسرے کو تسلی دینے سے اپنے دل کو تسلی آجاتی ہے، دوسرے کی ہمت بندھانے سے اپنی ہمت بندھ جاتی ہے۔"

گویا تبلیغِ دین تزکیہ نفس ہی کا ایک حصہ ہے۔!

اس طرح یہ دونوں عمل یعنی اپنے نفس کو پاک کرنے کی کوشش اور دین کی تبلیغ کرنے کی سعی ایک دوسری کی تقویت کا باعث بنتے ہیں، اور دونوں مل کر مسلمان کے عظیم مقصدِ زندگی کے دو حصے بن جاتے ہیں، اور وہ مقصدِ زندگی کیا ہے؟ خدا کی مخلوق کو خدا کے احکام کی پابند بنانے کی سعی۔

پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ انسان اپنے ماحول سے بہت متاثر ہوتا ہے۔ محسوس یہ کیا گیا ہے کہ ماحول کی اچھائیوں کی بہ نسبت اس کی برائیاں زیادہ جلدی اثر انداز ہوتی ہیں۔ الا ماشاءاللہ۔ لہٰذا جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کرنا ہے، اسے ساتھ ساتھ اس ماحول کو بھی پاک کرنے کی سعی جاری رکھنی چاہیے جس میں وہ رہ رہا ہے۔ ورنہ ماحول کا اثر اس کی تزکیہ نفس کی بہت سی کوششوں کو ساتھ ساتھ ضائع کرتا رہے گا۔ اب یہ کوئی ضروری نہیں کہ اس کی ماحول کو درست کرنے کی کوشش سو فیصد کامیاب ہی ہو جائے۔ مگر یہ بھی یقین رکھنا چاہیے کہ وہ سو فیصد ناکام بھی نہیں رہے گی۔ خلوصِ دل سے کی ہوئی کوشش ضرور نتائج پیدا

کرتی ہے اور ان نتائج میں سے ایک اہم نتیجہ یہ ہے کہ ماحول کی اصلاح کی کوشش کرنے والا شخص اپنی اس کوشش کی برکت سے خود ماحول کے برے اثرات سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جو عبادات ہم پر فرض کی ہیں اور جو بڑے بڑے حکم دیے ہیں وہ صرف ثواب ہی نہیں لاتے بلکہ اصلاحِ نفس پر بھی براہ راست اثر ڈالتے ہیں۔ مثلاً

☆ نماز غفلت کو دُور کرتی ہے،

☆ روزہ خواہشات کا زور توڑتا ہے،

☆ زکوٰۃ دولت کی حرص اور لالچ کو ختم کرتی ہے،

☆ حج ان تینوں اقسام کے نتائج پیدا کرتا ہے، اور

☆ تبلیغِ دین ماحول کے بُرے اثرات سے بچاتی ہے۔

دین کی تبلیغ تزکیہِ نفس کی جدوجہد پر ایک اور طریقے سے بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ وہ اس طرح کہ جب انسان بیک وقت دو مشکل کام شروع کرتا ہے تو دونوں میں سے جو مشکل تر ہوگا، اس کے مقابلے میں نسبتاً کم مشکل کام آسان لگنے لگے گا۔ چاہے فی نفسہ وہ کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو۔ اب تزکیہِ نفس اور تبلیغِ دین دونوں ہی مشکل کام ہیں لیکن اگر اُن کا آپس میں مقابلہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ تبلیغِ دین مشکل تر ہے۔ اس کی وجہ جیسے کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے یہی ہے کہ تزکیہِ نفس میں انسان کا معاملہ اپنے آپ کے ساتھ ہوتا ہے مگر تبلیغِ دین میں اُسے دوسروں کے ساتھ معاملہ کرنا پڑتا ہے۔ اب جب انسان کا اپنا آپ بھی اس کی بات آسانی سے نہیں مانتا تو دوسرے تو پھر دوسرے ہی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ آپ کی بات پر کان دھریں اور اصلاح کی طرف مائل ہو جائیں مگر یہ بھی عین ممکن ہے کہ وہ آپ کی بات سننے کے بھی روادار نہ ہوں۔ اب اگر اپنا دل نیکی کی طرف نہ آتا ہو تو انسان اسے مجبور بھی کرسکتا ہے مگر دوسروں پر انسان کا کوئی زور نہیں ہوتا کہ وہ انہیں مجبور کر کے نیکی کی طرف

ا سکے۔ اُن کا جی چاہے گا تو وہ آپ کی بات مانیں گے، نہیں چاہے گا تو نہیں مانیں گے۔

ایسی صورت میں پھر انسان کو اس بات کا گہرا احساس ہوتا ہے کہ تزکیۂ نفس فی نفسہٖ چاہے کتنا ہی مشکل کام کیوں نہ ہو، لیکن تبلیغِ دین کے مقابلے میں بے حد آسان ہے۔ مثال کے طور پر آپ نے کسی شخص کے ساتھ جد و جہد شروع کر رکھی ہے کہ کسی طرح وہ اپنے پیسے کی زکوٰۃ ادا کرتے رہنے کی فرضیت کو سمجھ لے اور زکوٰۃ ادا کیا کرے۔ مگر وہ ہے کہ بہانوں پر بہانے اور کٹ حجتیوں پر کٹ حجتیاں کیے چلا جا رہا ہے اور کسی طرح بھی زکوٰۃ کی ادائیگی کی طرف نہیں آتا---- اس وقت آپ کو احساس ہو گا کہ خود زکوٰۃ ادا کرنا کتنا آسان کام ہے۔!

یہی حال دین کے دوسرے اوامر اور نواہی کا سمجھ لیں۔ اُن پر عمل کروانے کی کوشش میں مصروف ہو کر پتہ چلتا ہے کہ خود اُن پر عمل کرنا نسبتاً کتنا سہل ہے۔ اب جو شخص صرف اصلاحِ نفس ہی کو مقصد بنائے رکھے گا اور دوسرے انسانوں کی اصلاح کو اپنی ذمہ داریوں سے خارج سمجھے گا، اس کے لیے پھر اصلاحِ نفس ہی بہت بڑا مشکل کام بن جائے گا۔ مگر جو اس مشکل کام کے ساتھ مشکل تر کام کو بھی شامل رکھے گا، اُسے اپنے اس مشکل تر کام کے مقابلے میں اصلاحِ نفس کا کام آسان معلوم ہو گا۔ دوسروں کے ساتھ جد و جہد کرنے والوں کو پتہ چل جاتا ہے کہ اپنے آپ کے ساتھ جد و جہد کرنا اتنا مشکل کام نہیں جتنا یہ اس وقت محسوس ہوتا ہے جب ہم صرف یہی کام کر رہے ہوں---- ظاہر ہے کہ یہ احساس کہ اصلاحِ نفس تو ایک آسان کام ہے اصلاحِ نفس کی رفتار کو تیز کرتا ہے۔

خدا کے دین کو خدا کی مخلوق تک پہنچاتے رہنا وہ ضروری کام ہے جس سے غفلت برت کر مسلمانوں نے ہمیشہ عذاب سہے ہیں اور انواع و اقسام کی الجھنوں اور پریشانیوں کا سامنا کیا ہے۔

اُم المومنین حضرت اُم حبیبہؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابن آدمؑ کا کلام اس کے خلاف ہی جاتا ہے، اس کے حق میں نہیں جاتا۔ سوائے اس کے کہ (وہ کلام یہ ہو کہ) نیکی کا حکم دیا جائے، برائی سے روکا جائے اور اللہ عزوجل کا ذکر کیا جائے۔ (ابن ماجہ)

آخر میں اس ساری بحث کے خلاصے کے طور پر اس بات کو ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ تزکیہ نفس کے سلسلے میں یہ سات امور ایسے ہیں کہ جو شخص بھی ان پر کماحقہ، عمل کرے گا اس کے لیے یہ کٹھن کام بہت حد تک سہل ہو جائے گا۔

یعنی جو شخص

☆ اپنے نفس کا محاسبہ کرتا رہے گا،
☆ جو اپنے کیے پر شرمسار ہو کر توبہ اور استغفار کرتا رہے گا،
☆ جو نفس کا ڈٹ کر مقابلہ کرے گا اور اس کو قابو میں رکھے گا،
☆ جو نیک صحبت میں بیٹھے گا،
☆ جو اپنی زبان کی حفاظت کرے گا،
☆ جو آخرت کی جواب دہی کا گہرا احساس رکھے گا،
☆ اور جو دین کی تبلیغ کرتا رہے گا،

اس کی تزکیہ نفس کی راہیں اس کی توقع سے زیادہ ہموار اور آسان ہو جائیں گی!

* * *

متفرقات

احتیاطیں

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"کیا تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہے؟"

صحابہؓ نے عرض کیا کہ ہم میں تو مفلس وہ ہوتا ہے جس کے پاس نہ روپیہ پیسہ ہو اور نہ سامان و متاع۔

آپؐ نے فرمایا کہ میری اُمت میں مفلس وہ ہے جو قیامت کے دن نمازیں اور روزے اور زکوٰۃ لے کر آئے گا مگر ساتھ ہی اس نے کسی کو گالی دی ہو گی اور کسی پر تہمت لگائی ہو گی اور کسی کا مال کھایا ہو گا اور کسی کا خون بہایا ہو گا اور کسی کو مارا ہو گا۔ پھر اُس کی نیکیاں لے کر اُن مظلوموں کو دے دی جائیں گی۔ پھر اگر اس کی نیکیاں اس کے مظالم کا بدلہ ادا کرنے سے پہلے ہی ختم ہو گئیں تو پھر ان مظلوموں کی خطائیں لے لی جائیں گی اور اس ظالم پر ڈال دی جائیں گی۔ پھر اسے دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔ (مسلم)

اس حدیث میں جو کچھ بیان فرمایا گیا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ عین ممکن ہے کہ انسان نیکیاں کرتے ہوئے غیر ارادی طور پر ساتھ ساتھ ایسی حرکات بھی کرتا جائے جن کے باعث اس کا کیا دھرا سب ضائع ہو جائے اور وہ کوشش کرتے رہنے کے باوجود آخر میں تہی دست و تہی دامان ہو کر رہ جائے۔!

تزکیہ نفس کے سلسلے میں بھی یہ خدشہ پورے طور پر موجود ہے کہ اس مہم کو سر کرتے ہوئے ساتھ ساتھ انسان سے ایسی غلطیاں بھی ہوتی جائیں جن کے باعث یا تو اس کا یہ کام

ادھورا ہی رہ جائے یا اگر وہ بزعم خود اسے مکمل کر بھی لے، تو ساتھ ایسے اعمال بھی کر چکا ہو کہ انجام کار وہ اپنی اس جد و جہد کی خیر و برکت سے محروم ہی رہ جائے۔

اس مہم کی راہ میں کئی اقسام کے خطرات ہیں۔ ان خطروں کو پہچاننے اور ان سے بچنے کے لیے ایمانِ محکم اور عقل سے کام لینا لازمی ہے۔ جب ہم اپنے آپ کو بری عادات سے پاک اور پاک عادات سے مزین کرنے کی کوشش شروع کرتے ہیں تو عموماً ایک عرصے تک مقصد کا حصول بہت دُور نظر آتا رہتا ہے کیونکہ پختہ عادات کو دُور کرنا، نئی عادات کو اختیار کرنا اور دل کو اس حالت پر لانا کہ وہ برائی کی کشش سے متاثر نہ ہو، کوئی ایسا کام نہیں ہے کہ انسان اُسے جھٹ پٹ سر انجام دے کر خوش و خرم ہو جائے۔ اس کے لیے تو ایک لمبے عرصے تک اپنے نفس کے خلاف جدوجہد کرنی پڑتی ہے جس کے دوران بار بار ناکامی کا منہ بھی دیکھنا پڑتا ہے۔ لہٰذا تزکیۂ نفس کے سلسلے میں پہلی احتیاط یہ ہے کہ

دل شکستگی: سے بچا جائے۔

صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے ایک حدیث بیان ہوئی ہے جس میں حضورؐ نے ایک ایسے شخص کا ذکر کیا ہے جس سے گناہ کا ارتکاب ہو گیا، پھر اس نے اللہ تعالیٰ کے حضور میں درخواست کی کہ خدایا مجھ سے گناہ ہو گیا، پس آپ مجھے بخش دیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرے بندے کو معلوم ہے کہ میرا کوئی رب ہے جو گناہ کو بخشتا ہے اور اس پر مواخذہ بھی کرتا ہے۔ پس میں نے اپنے بندے کو بخش دیا۔ پھر کچھ عرصہ گزرنے کے بعد اس شخص سے پھر گناہ ہو گیا تو اس نے پھر اسی طرح خدا کے حضور میں گناہ کا اعتراف کیا اور استغفار کیا تو اللہ تعالیٰ نے پھر ویسے ہی فرمایا کہ میرے بندے کو معلوم ہے کہ اس کا کوئی رب ہے جو گناہ کو بخشتا ہے اور اس پر مواخذہ بھی کرتا ہے لہٰذا میں نے اپنے بندے کو بخش دیا۔ پھر کچھ عرصہ گزرنے کے بعد اس انسان سے پھر گناہ ہو گیا اور پھر اس نے خدا کے حضور

میں اپنے گناہ کا اعتراف کر کے اس سے اسے بخش دینے کی درخواست کی تو اللہ تعالیٰ نے پھر وہی فرمایا کہ میرے بندے کو معلوم ہے کہ اس کا کوئی رب ہے جو گناہ کو بخشتا ہے اور اس پر مواخذہ بھی کرتا ہے، میں نے اپنے بندے کو بخش دیا۔

اب اگر کوئی اس حدیث سے یہ مطلب نکالے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو کھلی چھٹی دے دی ہے کہ وہ بار بار گناہ کرے اور بار بار توبہ کرے تو ایسا سمجھنا نادانی ہوگا۔ حدیث میں اس شخص کا ذکر نہیں جو بار بار جان بوجھ کر گناہ کرتا ہے اور جس نے اس بات کو عادت ہی بنا لیا ہے کہ گناہ کیا اور پھر توبہ کی اور پھر گناہ کر لیا اور پھر توبہ کر لی بلکہ یہاں تو اس شخص کا ذکر ہے جس سے بار بار گناہ ہو جاتا ہے اور پھر وہ سچے دل سے توبہ کر لیتا ہے مگر سچے دل سے توبہ کر لینے کے بعد پھر بتقاضائے بشریت اس سے دوبارہ گناہ ہو جاتا ہے تو پھر وہ سچے دل سے شرمسار ہوتا ہے اور اپنے گناہ کی بخشش مانگتا ہے۔ ایسے انسان کو اللہ تعالیٰ بخشتا چلا جائے گا چاہے اس سے کتنی ہی دفعہ یہ غلطی کیوں نہ ہو۔ بار بار گناہ ہو جانا ایک بات ہے اور ارادتاً جان بوجھ کر بار بار گناہ کرنا اور گناہ اور توبہ کو کھیل بنا لینا بالکل دوسری بات ہے۔ اس حدیث میں اس انسان کے لیے تو بخشش کا وعدہ ہے جس سے بار بار گناہ ہو جاتا ہے مگر ارادتاً، جان بوجھ کر، ڈھٹائی سے بار بار گناہ کرنے والوں کے لیے اس میں سے مغفرت کا وعدہ نکالنا نری زیادتی ہے۔

بشر سے بار بار گناہ ہو جانا بالکل قرین قیاس ہے کیونکہ جو عادات پختہ ہو چکی ہوتی ہیں، ان سے خلاصی حاصل کرنا آسان کام نہیں۔ انسان اپنے آپ سے بڑے پکے پکے عہد و پیمان کرتا ہے کہ اب یہ خرابی نہیں کروں گا، مگر پھر کسی وقت اُسے پتہ بھی نہیں چلتا کہ اس سے پھر وہی غلطی ہو جاتی ہے۔ ایسے اوقات میں عموماً انسان سخت پریشان ہوتا ہے اور چند بار جب وہ بچنے کی کوشش کرنے کے باوجود وہی خطا کر لیتا ہے تو اس کی خود اعتمادی

بالکل ختم ہو جاتی ہے اور وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اب تو خدا مجھے کبھی بخشے گا ہی نہیں۔ اتنی بار تو میں نے اپنے عہد کو توڑا ہے تو آخر وہ کب تک مجھے بخشا چلا جائے گا!

اب جتنا انسان زیادہ خدا ترس ہو گا اور اصلاح کا زیادہ خواہشمند ہو گا' اتنی ہی ایسے اوقات میں اس کی بے قراری زیادہ ہو گی اور عجب نہیں کہ یہ بے قراری اُسے بالکل ہی دل شکستہ کر دے اور وہ سمجھ بیٹھے کہ اب تو میری اصلاح ہو ہی نہیں سکتی اور پھر جب انسان ایک دفعہ یہ سمجھ لیتا ہے کہ میرے لیے تو بس اب جہنم ہی ہے تو پھر عجب نہیں کہ وہ برائی کی راہ پر زیادہ تیزی سے چلنا شروع کر دے کہ چلو چار دن کی زندگی ہی میں عیش کر لو مر کر تو دوزخ ہی میں جانا ہے۔

انسان کو اس کافرانہ مایوسی سے بچانے کے لیے اسے اچھی طرح کھول کھول کر بتا دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بخشش انسان کے گناہوں سے بہت زیادہ وسیع ہے اور یہ کہ چاہے انسان کتنی ہی بار گناہ کیوں نہ کر چکا ہو' جب بھی وہ سچے دل سے توبہ کرے گا اللہ تعالیٰ بخوشی اسے بخش دے گا اور اُسے ازسرِ نو ایک پاک زندگی گزارنے کا موقع بہم پہنچا دے گا۔

لٰہذا تزکیہِ نفس کرنے والے کو کبھی بھی دل شکستگی کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ اسے اپنے ارادوں میں بار بار شکست ہو' تاہم اسے اپنے دل کو شکستہ ہو جانے کی اجازت نہیں دینی چاہیے، بسا اوقات ایسے ہوتا ہے کہ دو لشکروں کی لڑائی میں کوئی ایک لشکر کچھ عرصے کے لیے چھوٹی چھوٹی جھڑپوں میں شکست کھاتا چلا جاتا ہے مگر انجام کار جنگ جیت لیتا ہے۔ دوسری عالمی جنگ میں اتحادیوں نے جرمن کے مقابلے میں مدتوں شکستیں کھائی تھیں اور بہت سا علاقہ بھی کھو بیٹھے تھے مگر چھ سال کے بعد جب یہ جنگ ختم ہوئی تو فاتح اتحادی ہی تھے۔

ہم خود اپنی روزمرہ کی زندگی ہی پر نگاہ ڈالیں' کوئی خاص دنیاوی فائدہ حاصل

کرنے کی راہ میں بسا اوقات ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے مگر دل میں اس کے حصول کی جو تڑپ ہوتی ہے وہ بار بار کوشش کرواتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ چیز حاصل ہو ہی جاتی ہے۔ اگر عام فوائد حاصل کرنے میں ہم اتنے ثابت قدم رہ سکتے ہیں تو پھر تزکیہ نفس کا فائدہ تو بڑا عظیم فائدہ ہے۔ اس کے حصول کی راہ میں انسان دل شکستہ کیوں ہو خصوصاً جب اللہ غفور و رحیم واضح الفاظ میں ہمت افزائی بھی کر رہے ہوں۔

کسی غلطی سے توبہ کر لینے کے بعد دوبارہ اگر وہی غلطی ہو جائے تو اس سے دل میں جو ندامت اور غم والم پیدا ہوتا ہے، وہ ایمان کا تقاضا ہے اور اُسے پیدا ہونا ہی چاہیے لیکن اگر یہ اذیت دل میں نا اُمیدی اور یاس کی کیفیت پیدا کر دے اور انسان یہ سمجھ لے کہ میری اصلاح تو اب ہو ہی نہیں سکتی اور مجھے تو خدا بخشے گا ہی نہیں، تو پھر فوراً سمجھ جانا چاہیے کہ یہ شیطان کا وسوسہ ہے۔ کیونکہ شیطان کو جیسے یہ پسند ہے کہ انسان خدا کا نافرمان بنے، اسی طرح یہ بھی پسند ہے کہ وہ اس کی رحمت سے مایوس ہو جائے۔ کیونکہ مایوس انسان کو اپنے ڈھب پر لانا اس کے لیے زیادہ آسان ہوتا ہے۔ ایسے نازک وقت میں انسان کو خدا کی رحمت و رافت پر پورا پورا یقین رکھنا چاہیے اس کی مغفرت پر بھروسہ کر کے اپنے عزمِ اصلاح پر ثابت قدم رہنا چاہیے۔ ایسے اوقات میں اس کے لیے وہ دعا بہت بڑا سہارا ہے جس میں واضح کر دیا گیا ہے کہ انسان کے گناہ چاہے کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں، وہ خدا کی رحمت سے بہر حال کم ہی ہوتے ہیں۔

اَللّٰھُمَّ مَغْفِرَتُکَ اَوْسَعُ مِنْ ذُنُوْبِیْ وَرَحْمَتُکَ اَرْجٰی عِنْدِیْ مِنْ عَمَلِیْ۔

(خدایا، تیری بخشش میری گناہوں سے زیادہ وسعت رکھنے والی ہے اور مجھے تیری رحمت کی بناء پر زیادہ نجات کی امید ہے بہ نسبت اپنے عمل کے)

بار بار جان بوجھ کر گناہ کرنا خدا کے غضب کو دعوت دینا ہے مگر غیر ارادی طور پر سہواً‘ مجبوراً بار بار غلطی ہو جانا کوئی ایسی بات نہیں جس کے باعث انسان ناامید ہو جائے۔ کیونکہ جس برتر ہستی نے گناہوں کو بخشنا ہے اس نے بنفسِ نفیس تسلی دے دی ہے کہ یاس کا شکار ہو جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ میں اپنے بندے کے گمان کے موافق ہوں (یعنی جیسا وہ مجھ سے گمان رکھے گا ویسا ہی معاملہ کروں گا) اور جس جگہ بھی وہ مجھے یاد کرتا ہے‘ میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔ خدا کی قسم‘ اللہ اپنے بندے کی توبہ سے اس شخص سے بھی زیادہ خوش ہوتا ہے جو اپنی گمشدہ چیز کو بیابان میں پا کر خوش ہوتا ہے۔ (اللہ تعالیٰ فرماتا ہے) اور جو شخص مجھ سے بالشت بھر قریب ہوتا ہے‘ میں اس سے ہاتھ بھر قریب ہوتا ہوں‘ اور جو کوئی مجھ سے ہاتھ بھر قریب ہوتا ہے‘ میں دونوں ہاتھوں کے پھیلاؤ کے برابر اس کے قریب ہوتا ہے اور جب وہ چل کر میرے قریب آتا ہے تو میں دوڑ کر اس کی طرف جاتا ہوں۔ (بخاری‘ مسلم)

یہ دل شکستگی کا خطرہ تو اس صورت کا ہے جب انسان کو بار بار اپنے عزم میں ناکامی ہوتی ہے۔ اب دوسرا خطرہ اس وقت شروع ہوتا ہے جب انسان کامیابیاں حاصل کرنا شروع کر دیتا ہے اور بہت حد تک یا کسی حد تک اپنی اصلاح کر لیتا ہے اس سٹیج پر اب اُسے **غرور:** کا خطرہ درپیش ہوتا ہے اور غرور جتنا دنیوی امور میں ہلاک کرنے والا ہے اس سے بدرجہا زیادہ دینی امور میں مہلک ہے۔

لفظ ”غرور“ کا مطلب ہے ”دھوکا“۔ مغرور انسان کو دھوکا لگ جاتا ہے کہ میں بہت کچھ ہوں حالانکہ وہ کچھ نہیں ہوتا‘ جو وہ اپنے آپ کو سمجھے بیٹھا ہوتا ہے۔ پھر یہ غرور اگر شکل و صورت‘ مال و دولت اور عزت و جاہ پر ہو‘ تو بھی اس کا اظہار کرنے سے انسان بڑا گھٹیا

لگنا شروع ہو جاتا ہے۔ کجا یہ کہ یہ دینداری اور پرہیزگاری پر ہو۔ اگر کسی انسان نے اپنی ساری کی ساری خرابیوں کی بھی اصلاح کر لی ہو، جو کہ ممکن نہیں، تو بھی اگر اس اصلاح نے اُسے مغرور کر دیا ہے تو وہ ہنوز اسی طرح تزکیہِ نفس کا محتاج ہے جس طرح پہلے تھا بلکہ اس سے بھی زیادہ ہے۔ کیونکہ پہلے تو وہ ایسی خطاؤں میں مبتلا ہو جاتا تھا جن کا اُسے احساس بھی ہو جاتا تھا اور وُہ توبہ بھی کر لیتا تھا مگر اب تو وہ ایسی خرابی میں مبتلا ہو گیا ہے جس کا اسے احساس ہی نہیں کہ وہ توبہ کرے یا بخشش مانگے۔

غرور کی مذمت میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اُسے اگر پیشِ نظر رکھا جائے تو شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جس شخص کو اپنی دینداری اور پاکیزہ اطواری کا غرور ہو، وہ درحقیقت دیندار اور پاکیزہ اطوار ہے ہی نہیں۔ اللہ کی معرفت کا تقاضا انکسار اور خاکساری ہے نہ کہ غرور اور خود بینی۔ انسان کی زندگی کے نشیب و فراز اور خدا کی خلق کی ہوئی اس کائنات کے نظام پر غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ اس میں تین چیزوں کی بالکل گنجائش نہیں۔

ایک شرک کی،

دوسرے یاس کی،

اور تیسرے غرور کی۔

یہی وجہ ہے کہ جو واقعی عقل مند تھے، وہ ان تینوں چیزوں سے مجتنب رہتے تھے۔

دین کی خدمت کے سلسلے میں حضرت عمر فاروق ؓ کے کارہائے نمایاں کو کون نہیں جانتا۔ آپ کا دینی مرتبہ اتنا بلند تھا کہ ایک دفعہ قریش کی کچھ خواتین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں اور کچھ سوال پوچھ رہی تھیں۔ خواتین بہت زیادہ سوال کر رہی تھیں اور خوب بلند آواز سے بول رہی تھیں کہ اتنے میں حضرت عمر ؓ آ گئے اور حضورؐ سے اندر آنے کی اجازت مانگی۔ جونہی قریش خواتین نے حضرت عمرؓ کی آواز سنی، جلدی سے پردے میں چلی گئیں۔

حضورؐ نے حضرت عمرؓ کو اندر آنے کی اجازت فرمائی اور جب وہ داخل ہوئے تو دیکھا کہ حضورؐ مسکرا رہے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، خدا آپؐ کو مسکراتا رکھے مگر آپؐ کس بات پر مسکرائے تو حضورؐ نے فرمایا کہ مجھے ان عورتوں پر تعجب ہوا ہے کہ تمہاری آواز سنتے ہی پردے میں چلی گئیں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ آپؐ اس کے زیادہ حقدار تھے کہ یہ آپؐ سے ڈرتیں، اور پھر انہوں نے عورتوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اے اپنی جان کی دشمنو! مجھ سے ڈرتی ہو، اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ڈرتیں۔ عورتوں نے کہا کہ آپؓ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ سخت مزاج ہیں۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا:

اے ابن خطابؓ، ادھر سنو! قسم اس ذات کی، جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ جب کبھی شیطان راہ چلتے ہوئے تمہیں ملتا ہے تو تمہاری راہ چھوڑ کر کسی اور راہ پر ہو لیتا ہے۔ (بخاری)

یہ تو تھا اُن کا مرتبہ، مگر ان کے انکسار کا یہ عالم تھا کہ تمنا کیا کرتے تھے کہ نہ مجھے عذاب ملے نہ ثواب، بس میں برابر برابر چھوٹ جاؤں۔

دینداری اور پاکیزہ اطواری کا غرور ضروری نہیں کہ خودستائی ہی کی شکل میں ظاہر ہو بلکہ مغرور انسان اپنی عام گفتگو اور اپنے رویے ہی سے اپنے دل کی کیفیت کو ظاہر کر دیتا ہے۔ دوسروں پر بڑھ بڑھ کر اعتراضات اور نکتہ چینیاں کرنا، ذرا ذرا سی بات پر بے تکلف کسی کو ”بدعتی“ اور کسی کو ”مشرک“ کے خطاب دے ڈالنا، لوگوں کے چھپے عیبوں کو الم نشرح کرنا، لوگوں کی کمزوریوں کا حقارت سے ذکر کرنا اور لوگوں کی غلطیاں معاف کرنے میں سخت دلی کا ثبوت دینا، یہ سب کچھ عموماً اسی چھپے ہوئے جذبہ غرور ہی کا اظہار ہوتا ہے۔ پھر اس کے ساتھ اگر اپنی پاکیزہ اطواری کی تعریف و توصیف بھی شروع ہو جائے تو پھر تو معاملہ

بہت ہی زیادہ اصلاح طلب ہو جاتا ہے۔

بات یہ ہے کہ جس شخص نے اپنے نفس کی واقعی اصلاح کر لی ہو، اس نے درحقیقت شیطان کو بہت بڑی شکست دی ہوتی ہے۔ شیطان بے چین ہوتا ہے کہ اس شکست کا بدلہ لے۔ اب اگر وہ شخص اتنا نیکی پسند اور باعزم ہے کہ اس نے اپنی بُری عادات دُور کر لی ہیں تو پھر اسے فسق و فجور کی طرف لے جا کر شکست دینا بھی آسان نہیں ہوتا۔ لہٰذا شیطان اسے دوسرے ذرائع سے ہرانے کی کوشش کرتا ہے جن میں سے ایک ذریعہ یہ ہے کہ اس کے دل میں غرور خود پسندی پیدا کر کے اس کے کیے دھرے کو ضائع کیا جائے۔

لہٰذا انسان کے لیے ضروری ہے کہ اپنی جدوجہد کو ضائع ہو جانے سے بچائے اور اپنی اصلاح کرتے ہوئے اس بات کا خیال رکھے کہ ناکامیاں اسے دل شکستہ نہ کرنے پائیں اور کامیابیاں اسے غرور کا شکار نہ بنا دیں۔ خدا کے رسولؐ سے بڑھ کر پاک نفس اور کون تھا، مگر آپؐ کے انکسار کا یہ عالم تھا کہ:

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی شخص ایسا نہیں جس کا عمل اسے جنت میں داخل کر سکے۔ آپؐ سے عرض کیا گیا کہ یارسول اللہؐ کیا آپ بھی نہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں بھی نہیں سوائے اس کے کہ خدا مجھے اپنی رحمت سے ڈھانپ دے۔ (مسلم)

صحابہ کرامؓ سے زیادہ کس نے نفس کے تزکیے کی کوشش کی تھی، مگر اپنے اعمال پر فخر کرنا تو درکنار آخرت کی جواب دہی سے لرزاں و ترساں رہتے تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ کا جب آخری وقت آیا تو آپؓ کی زبان پر یہ الفاظ تھے۔

”اگر خدا نے مجھے نہ بخشا تو میرے لیے اور میری ماں کے لیے وبال ہی وبال ہے۔“

جب حضرت عائشہؓ کا آخری وقت آیا تو حضرت ابن عباسؓ نے آپ کے پاس آنے کی اجازت چاہی۔ حضرت عائشہؓ کو تامل ہوا کہ کہیں وہ آ کر تعریف نہ کرنے لگیں۔ اُن کے بھانجوں نے سفارش کی تو پھر اُنہوں نے اجازت دے دی۔ حضرت ابن عباسؓ نے اندر آ کر واقعی اُن کی تعریف شروع کر دی اور کہا کہ آپ کا نام ازل سے اُم المومنین تھا۔ آپ حضورؐ کی سب سے زیادہ محبوب بیوی تھیں۔ رفقاء سے ملنے میں آپ کو اب اتنا ہی وقفہ باقی ہے کہ روح بدن سے پرواز کر جائے۔ خدا نے آپ ہی کے ذریعے تیمّم کی اجازت عطا فرمائی۔ آپ کی شان میں قرآن کی آیات نازل ہوئیں جواب ہر محراب و مسجد میں شب و روز پڑھی جاتی ہیں۔

اس پر حضرت عائشہؓ نے فرمایا: ''ابن عباسؓ مجھے اپنی اس تعریف سے معاف رکھو۔ مجھے تو یہ پسند تھا کہ میں معدوم محض ہوتی۔'' (سیرت العائشہؓ)

دینداری کا غرور اسی دل میں آئے گا، جس میں دینداری بڑی ہی کمزوری کی حالت میں ہو۔ ورنہ جس دل میں خدا کی معرفت ہو اس میں خدا کی محبت اور خدا کا خوف فخر کے لیے کوئی جگہ نہیں چھوڑتا۔

کسی شخص نے حضرت معروف کرخیؒ سے درخواست کی کہ مجھے نصیحت کیجئے۔ انہوں نے فرمایا کہ اس بات سے ہمیشہ ڈرتا رہ کر اللہ تعالیٰ تیری طرف دیکھ رہا ہو اور تو غرور اور تکبر کے مظاہرے میں مصروف ہو۔

حضرت ایوب بن ابی تمیمہ سختیانیؒ مشہور تابعی تھے۔ اپنے علم، زہد اور عبادت کے باعث لوگوں میں بہت مقبول تھے مگر انہیں شہرت سے سخت نفرت تھی۔ لوگوں کی نظروں سے بچنے کے لیے عام راستوں کو چھوڑ کر نامانوس اور دُور دراز راستوں سے نکلتے۔ تاہم جب کسی کا سامنا ہو جاتا تو خود پیش قدمی کر کے سلام کرتے۔ لوگ ان کے سلام کے جواب میں

بہت کچھ اضافہ کرتے۔ اس پر وہ اپنے خدا کو مخاطب کر کے عرض کرتے۔ ”الٰہی تجھ کو معلوم ہے کہ میری یہ خواہش نہیں ہے۔“ اس جملے کو بار بار دہراتے۔

حضرت بایزید بسطامیؒ کا فرمان ہے۔ ”نیک بخت وہ ہے جو نیکی کرے اور ڈرے اور بد بخت وہ ہے جو بدی کرے اور مقبولیت کی اُمید رکھے۔“

جب حضرت بایزید بسطامیؒ کی وفات کا وقت آیا تو آپ اللہ تعالیٰ کے سامنے اس طرح زاری کر رہے تھے:

”میں نے تجھے یاد نہیں کیا، مگر غفلت سے اور میں نے تیری خدمت نہیں کی مگر سستی سے۔“

دل کو قلب کہتے ہیں اور قلب کا مطلب ہے بدل جانا۔ چونکہ دل کی کیفیات بدلتی رہتی ہیں، اس لیے یہ قلب کہلاتا ہے اور اس قلب کا کیا پتہ کہ سیدھی راہ پر چلتے چلتے کب یہ ٹیڑھی راہ کا رُخ کر لے۔ لہٰذا جب تک سانس کی آمد و رفت جاری ہے فخر کے لیے کوئی گنجائش موجود نہیں ہے۔ ایسے لوگ بھی گزرے ہیں جنہیں زندگی میں تو نیکی کی توفیق نہ ہوئی مگر موت سے کچھ ہی دیر پہلے دل ایسا بدلا کہ شہادت حاصل کر کے ہمیشہ کے لیے کامیاب و کامران ہو گئے۔ اور ایسے بھی گزرے ہیں کہ اچھی بھلی دیندارانہ زندگی گزاری مگر مرتے وقت کوئی ایسی حرکت کر گئے کہ جہنم کے مستحق ہو گئے۔

جنگ اُحد کے دن جب لڑائی زوروں پر تھی۔ ایک نوجوان حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ کیا میں اسلام لاؤں یا قتال کروں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ پہلے اسلام لا پھر قتال کر۔ چنانچہ وہ عین میدانِ جنگ میں مسلمان ہوا اور تلوار سونت کر میدان میں گھس گیا۔ جنگ ختم ہوئی تو دیکھا گیا کہ شہیدوں میں وہ بھی تھا۔ صحابہؓ اس بے مثال شہادت پر رشک کیا کرتے تھے۔ حضرت ابو ہریرہؓ اپنے شاگردوں سے پوچھا

کرتے کہ بتاؤ وہ کون سا شخص ہے کہ جس نے ایک نماز بھی نہیں پڑھی اور سیدھا جنت میں چلا گیا۔ پھر خود ہی فرمایا کرتے کہ وہ اُصیرم عبدالاشہل ہے۔ ان شہید کا نام عمروؓ بن ثابت تھا اور لقب اُحیرم تھا اور عبدالاشہل اُن کے قبیلے کا نام تھا۔

اس کے برعکس مثال ایک اور صحابی کی ہے۔

حضرت سہلؓ بن ساعد ساعدی بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم (کی فوج) اور کافروں کی مڈبھیڑ ہوئی اور باہم جنگ ہوئی۔ پھر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اپنے لشکر میں واپس آ گئے اور دوسرے لوگ اپنے لشکر میں چلے گئے۔ حضورؐ کے اصحابؓ میں ایک شخص تھا جو اکیلے وکیلے کافر کے پیچھے لگ جاتا اور اسے تلوار کے گھاٹ اتار دیتا۔ لوگوں نے کہا کہ آج ہم میں سے کسی سے وہ کام نہیں ہو سکا جو فلاں نے کیا۔ اس پر حضورؐ نے کہا کہ وہ تو دوزخی ہے۔ لوگوں میں سے ایک شخص نے کہا کہ میں اس کے ساتھ لگا رہوں گا (تا کہ دیکھوں کہ وہ کون سا ایسا کام کرتا ہے جو اسے دوزخ کا مستحق بنا دے گا) پس وہ اس کے ساتھ نکل کھڑا ہوا۔ جہاں وہ کھڑا ہوتا یہ بھی کھڑا ہوتا۔ جہاں وہ دوڑتا یہ بھی دوڑتا۔ وہ بیان کرتا ہے کہ وہ شخص شدید طور پر زخمی ہو گیا تو اس نے موت کے معاملے میں جلدی کی۔ اُس نے تلوار کے قبضے کو زمین پر رکھا اور اس کی نوک کو اپنی دونوں چھاتیوں کے درمیان رکھ کر خود کو اُوپر زور دے کر خودکشی کر لی۔ پھر وہ (دیکھنے والا) شخص رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا اور کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپؐ اللہ کے رسولؐ ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ کیا بات ہے۔ اس نے عرض کیا۔ جس شخص کے بارے میں آپؐ نے ابھی ابھی فرمایا تھا کہ وہ دوزخی ہے تو لوگوں کو اس پر تعجب ہوا تھا تو میں نے کہا تھا کہ میں تمہارے لیے اس بات کی ذمہ داری لیتا ہوں (کہ دیکھوں گا کہ وہ کیسے دوزخی ہوتا ہے) پھر میں اس کی طلب میں نکل پڑا یہاں تک کہ (میں نے دیکھا کہ) وہ شدید طور پر زخمی ہو گیا اور جلد از جلد موت کا طالب

ہوا اور اس نے تلوار کے قبضے کو زمین پر رکھا اور اس کی نوک کو اپنی چھاتیوں کے درمیان ٹکایا اور پھر اس پر زور دے کر خودکشی کر لی...... (مسلم)

غرض کہ مغرور ہو جانے کے لیے کوئی جواز نہیں ہے۔ اگر ہم کسی بُری عادت کو دُور کر کے یا کوئی اچھی عادت پیدا کر کے یا کسی آزمائش میں کامیاب ہو کر اس خیال میں پڑ جائیں کہ ہم نے کوئی کارنامہ سرانجام دے لیا ہے تو پھر فوراً لاحول پڑھ لینا چاہیے اور سمجھ جانا چاہیے کہ شیطان اس عمل کو بُرباد کرنے پر تلا کھڑا ہے۔ حضرت علیؓ کا فرمان ہے کہ ”گناہوں پر نادم ہونا گناہوں کو مٹا دیتا ہے اور نیکیوں پر مغرور ہونا نیکیوں کو برباد کر دیتا ہے۔“

تزکیۂ نفس کے سلسلے میں تیسری احتیاط یہ ہے کہ انسان **ریا** سے بچے۔ ریا کا خطرہ یوں پیدا ہوتا ہے کہ بُرائی سے بچنے کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ انسان بُرا نمونہ بننے سے بھی بچے تا کہ وہ دوسروں کی گمراہی کا باعث نہ بنے۔ ایسے ہی اچھا کرنے کے علاوہ یہ بھی پسندیدہ ہے کہ انسان اچھا نمونہ بننے کی کوشش کرے تا کہ لوگ اسے دیکھ دیکھ کر اچھائی اختیار کریں۔ اب اس شے یعنی لوگوں کے لیے اچھا نمونہ بننے کی کوشش کرنے میں یہ خطرہ بہر حال موجود ہے کہ انسان اچھا نمونہ بنتے بنتے ریا کار ہی نہ بن جائے۔

ریا کا مطلب ہے دکھانا، اب یہ دکھانا بھی ایک سے زیادہ مقاصد کی خاطر ہو سکتا ہے۔ بعض اوقات انسان کوئی اچھا کام لوگوں کے سامنے اس لیے کرتا ہے کہ اسے دیکھ کر وہ بھی اچھا کام کریں اور کبھی وہ اپنا عمل لوگوں کو اس لیے دکھاتا ہے کہ لوگ اس کی تعریف و توصیف کریں۔ اس دکھانے کا شرعی لحاظ سے ریا ہونا یا نہ ہونا منحصر ہے اس بات پر کہ دکھانے والے کی نیت کیا ہے۔ اگر وہ شخص اپنا عمل لوگوں کو اس لیے دکھا رہا ہے کہ لوگوں کے دل میں بھی یہ کام کرنے کا جذبہ پیدا ہو تو پھر یہ ہرگز ریا نہیں ہے کیونکہ اَلْاَعْمَالُ بِالنِّیَّات

(اعمال نیتوں پر منحصر ہیں) اس کی نیت لوگوں کی تعریف حاصل کرنا نہیں بلکہ لوگوں کو ان اعمال کی طرف لانا ہے جو خدا کو پسند ہیں۔ البتہ اگر وہ اپنا یہ اچھا کام لوگوں کو اس لیے دکھا رہا ہے کہ اس کی تعریف و توصیف کی جائے تو پھر البتہ یہ سیدھی سیدھی ریا ہے۔ مختصر یہ کہ کسی عمل کا ریا ہونا یا نہ ہونا پورے طور پر اس عمل کو کرنے والے کی نیت پر منحصر ہے۔ لہٰذا یہ ایک ایسا معاملہ ہے جو صرف انسان اور اس کے خالق کے درمیان ہے۔ اس لیے کوئی شخص بھی کسی دوسرے شخص کو ریا کار کہنے میں حق بجانب نہیں کیونکہ کسی کے پاس بھی وہ ذرائع نہیں جن سے وہ کسی دوسرے انسان کی نیت کا حال معلوم کر سکے۔ ہو سکتا ہے کہ جس کام کو ہم ریا سمجھ رہے ہوں، وہ کرنے والے نے صرف اس نیت سے کیا ہو کہ اسے دیکھ کر لوگ اچھائی کی طرف آئیں۔

تاہم جہاں دوسروں کو ریا کار کہنے سے پرہیز لازمی ہے وہاں اپنے معاملے میں از حد چوکنا رہنے کی ضرورت ہے کہ کہیں اپنے چاہنے والوں کی تعریف و توصیف دل میں تعریف و توصیف حاصل کرنے کی خواہش نہ پیدا کر دے۔ نفس کا تزکیہ کرنے والوں کے لیے لازمی ہے کہ اس معاملے میں بڑی احتیاط سے کام لیں اور نیت کے خلوص کا ہمیشہ دھیان رکھیں۔ انہیں اپنے طرزِ عمل سے لوگوں کے سامنے اچھا نمونہ ہی پیش کرنا چاہیے مگر اس بات کی پوری پوری احتیاط برتنی چاہیے کہ کہیں لوگوں کے سامنے اچھا نمونہ پیش کرتے کرتے وہ اپنی بربادی کا بندوبست نہ کر لیں کیونکہ جن نیک اعمال میں ریا داخل ہو جائے، وہ اللہ کے حضور میں بالکل بے وزن ہو جاتے ہیں۔

ہمارے صوفیاء میں بعض لوگ ایسے بھی ہوئے جنھوں نے اپنے زُہد میں یہاں تک مبالغہ کیا کہ خدا کی حلال کردہ چیزوں کو بھی اپنے اُوپر حرام کر لیا۔ ایسے ہی ایک گروہ کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ وہ جیبوں میں شراب کی بوتلیں رکھتے اور طوائفوں کے محلوں کے چکر

لگاتے تھے۔ حالانکہ درحقیقت وہ اس فسق و فجور سے بہت دُور ہوتے تھے۔ سوال یہ ہے کہ وہ ایسا کیوں کرتے تھے اور نیک ہونے کے باوجود لوگوں کو یہ تاثر کیوں دیتے تھے کہ وہ بد ہیں---- اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ وہ لوگوں کی تعریف سے بچنے کے لیے ایسا کرتے تھے تاکہ وہ ریا کا شکار ہونے سے محفوظ رہیں۔

یہ مقصد تو واقعی بہت اچھا تھا مگر اس کے لیے جو طریقہ اختیار کیا جاتا تھا اسے پسندیدہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ وہ لوگ ریا سے بچے یا نہ بچے' مگر انہوں نے دوسروں لوگوں کے سامنے بُرے نمونے ضرور پیش کر دیے۔ اگر ان کے دلوں میں لوگوں کی اچھی رائے کے معاملے میں اتنی بے نیازی موجود تھی کہ وہ ان کی ملامت سہنے کے لیے تیار تھے' تو پھر اُن میں اتنا حوصلہ کیوں نہیں تھا کہ وہ سرے سے لوگوں کی رائے ہی سے بے نیاز ہو جاتے'' بُرائی سے بھی اور اچھی سے بھی۔ کیونکہ ایک اچھے مسلمان کا یہ کام نہیں کہ ریا سے بچنے کے زعم میں وہ معاشرے کے سامنے خدا کی نافرمانی کے کچھ اور مناظر پیش کر دے۔ اسے حتی الامکان لوگوں کے سامنے خدا کی اطاعت اور فرمانبرداری ہی کے مناظر پیش کرنے چاہئیں مگر ساتھ ہی نیت کے خلوص کا پورا دھیان رکھنا چاہیے تاکہ جو اعمال بھی کیے جائیں وہ ضائع ہونے سے بچے رہیں۔

- حضرت علیؓ کا فرمان ہے: ''ریا کاری چاہے کتنی ہی خفیف کیوں نہ ہو' ایک قسم کا شرک ہے۔''

نیز آپؓ ارشاد فرماتے ہیں: ''بہترین زُہد یہ ہے کہ زُہد کو چھپایا جائے۔''

حضرت عثمانؓ کا ارشاد ہے: ''وہ زُہد جس میں خواہشِ دنیا کا لگاؤ ہو' ضائع ہو جانے والا ہے۔''

جس وقت مادہ پرستی کا اتنا زور ہو' جتنا کہ اس وقت ہے' اُس وقت اپنے آپ کو

اُن روحانی اقدار کے مطابق ڈھالنا، جو زمانے کا چلتا سکہ نہ ہوں، ہاتھ میں انگارہ پکڑنے کے مترادف ہے۔ جو شخص یہ انگارہ بھی پکڑے اور ساتھ ہی ریا کا شکار ہو جانے کے باعث اللہ تعالیٰ کی رضا جیسی نعمت بھی حاصل نہ کر سکے تو پھر اس نے آخر کا ہے کے لیے یہ انگارہ پکڑا؟

ایک کی رضا حاصل کرنے کے لیے یکسو ہو جانے میں جو ذہنی اور قلبی سکون ہے وہ جگہ جگہ خوشنودی کی بھیک مانگنے میں کہاں! ---- اور ریا کار انسان کی حالت یہی ہوتی ہے کہ وہ گویا ایک ایک دروازے پر تعریف و توصیف کی بھیک مانگتا پھرتا ہے۔ کوئی اسے یہ بھیک دیتا ہے کہ کوئی نہیں بھی دیتا، مگر وہ ہر ایک کے آگے ہاتھ ضرور پھیلاتا ہے۔

اس کے برعکس جو ایک ہی کی رضا حاصل کرنے پر یکسو ہو گیا، وہ عالی ظرف بھی ہے اور سیر چشم بھی اور کامیابی بھی درحقیقت اسی کے حصے میں آتی ہے اور دل بھی اسی کا مطمئن رہتا ہے کیوں کہ جس کی خاطر وہ مشقت کرتا ہے، وہ ہمہ وقت اسے دیکھ رہا ہوتا ہے اور جنہیں تکلف سے اور طرح طرح کے طریقے اختیار کر کر دکھانے کی ضرورت ہوتی ہے، انہیں دکھانے کی اسے پروا نہیں ہوتی۔

* * *

مومن

مومن کون ہے؟

کلام پاک: ''مومن تو وہ لوگ ہیں جن کے دل اللہ کا ذکر سُن کر لرز جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیات اُن کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے رب پر اعتماد رکھتے ہیں۔ جو نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے اُن کو دیا ہے اس میں سے (ہماری راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ حقیقی مومن ہیں......'' (الانفال' آیات ۲' ۳' ۴)

''مومن تو اصل میں وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کو دل سے مانیں اور جب کسی اجتماعی کام کے موقع پر رسولؐ کے ساتھ ہوں تو اس سے اجازت لیے بغیر نہ جائیں...... (النور' آیت ۶۲)

''مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں......'' (الحجرات: ۱۰)

''کسی مومن کا یہ کام نہیں کہ دوسرے مومن کو قتل کرے۔ الا یہ کہ اس سے چوک ہو جائے......'' (النساء: ۹۲)

''مومن مرد اور مومن عورتیں' یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور بُرائی سے روکتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے ہیں......'' (التوبہ: ۷۱)

''بھلا کہیں یہ ہوسکتا ہے کہ جو شخص مومن ہو وہ اس شخص کی طرح ہو جائے جو

فاسق ہو؟ یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔" (السجدہ:۱۸)

"یقیناً کامیاب ہو گئے وہ مومن جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں اور لغویات سے دُور رہتے ہیں، اور زکوٰۃ کے طریقے پر عامل ہوتے ہیں، اور اپنی شرم کی جگہوں کی حفاظت کرتے ہیں......" (المومنون، آیات ۱ تا ۵)

"مومنوں کا کام تو یہ ہے کہ جب وہ اللہ اور رسولؐ کی طرف بلائے جائیں تاکہ رسولؐ ان کے مقدمے کا فیصلہ کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سُنا اور اطاعت کی اور ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔" (النور:۱۵)

"کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسولؐ کسی معاملے کا فیصلہ کر دیں تو پھر اسے اپنے اس معاملے میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار رہے......" (الاحزاب:۳۶)

"حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے عوض خرید لیے ہیں وہ اللہ کی راہ میں لڑتے اور مارتے ہیں اور مرتے ہیں۔ اُن سے (جنت کا وعدہ) اللہ کے ذمے ایک پختہ وعدہ ہے۔ تورات اور انجیل اور قرآن میں اور کون ہے جو اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کا پورا کرنے والا ہو۔ پس (اے مومنو) خوشیاں مناؤ اپنے اس سودے پر جو تم نے خدا سے چکا لیا ہے۔ یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ (ان مومنوں کی صفات یہ ہیں کہ یہ) اللہ کی طرف بار بار پلٹنے والے، اس کی بندگی بجالانے والے، اس کی تعریف کے گن گانے والے، اس کی خاطر زمین میں گردش کرنے والے، اس کے آگے رکوع اور سجدے کرنے والے، نیکی کا حکم دینے والے، بدی سے روکنے والے اور اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے (ہیں) اور (اے نبیؐ ان) مومنوں کو خوشخبری دے دو۔"

(التوبہ، آیات ۱۱۱، ۱۱۲)

احادیثِ نبویؐ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلم وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں اور مومن وہ ہے جس سے لوگوں کے خون اور مال امن میں رہیں:.....“ (ترمذی)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن کی مثال ایسے ہے جیسے کھیت میں اُگا ہوا نیا پودا کہ ہوا اسے جس طرف جھکاتی ہے اس کے پتے اسی طرف جھک جاتے ہیں اور جب ہوا ٹھہر جاتی ہے تو پودا پھر سیدھا کھڑا ہو جاتا ہے اور کافر کی مثال ایسی ہے جیسے شمشاد کا سخت سیدھا درخت کہ جب خدا چاہتا ہے اسے جڑ سے اکھاڑ دیتا ہے۔ (بخاری)

لغات الحدیث جلد چہارم صفحہ ۱۲۲ میں اس حدیث کے مفہوم کی اس طرح وضاحت کی گئی ہے۔ ”مومن کی مثال اس پودے کی سی ہے جو تازہ ہرا بھرا کھیتی سے نکلا ہو جدھر سے ہوا آئی اُدھر سے مڑ گیا۔ ہوا اس کو دائیں بائیں ہر طرف جھکاتی رہتی ہے لیکن وہ پھر سیدھا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مومن پر ہزاروں مصیبتیں آتی ہیں لیکن وہ صبر کر کے پھر مضبوط اور درست ہو جاتا ہے۔ برخلاف کافر اور منافق کے کہ وہ دنیا میں بڑے آرام سے رہتا ہے لیکن جب مصیبت آتی ہے تو ایمان نہ ہونے کے باعث اس پر صبر نہیں کرتا اور جان کھو بیٹھتا ہے۔“

حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی (اس وقت تک) مومن نہیں ہو سکتا، جب تک وہ اپنے (مسلمانِ) بھائی کے لیے وہی شے پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔ (بخاری)

حضرت انسؓ ہی سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم

میں سے کوئی (اس وقت تک) مومن نہیں ہو سکتا، جب تک میں اس کے نزدیک اس کے ماں باپ اور اس کی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔ (بخاری)

حضرت علیؓ: ☆ "مومن زیرک اور صاحب دانش ہوتا ہے۔

- ☆ چہرہ (اطاعت الٰہی کی وجہ سے) بشاش اور دل (خوف آخرت سے) حزیں،
- ☆ وہ وسیع القلب ہوتا ہے،
- ☆ ہر فانی شے کو حقیر سمجھتا ہے،
- ☆ ہر قسم کی نیکی کا طالب ہوتا ہے،
- ☆ نہ کینہ پرور، نہ حاسد، نہ جھگڑالو، نہ گالی دینے والا، نہ عیب جو، نہ غیبت گو،
- ☆ خاموش زیادہ رہتا ہے،
- ☆ صاحبِ وقار ہوتا ہے،
- ☆ ذکرِ الٰہی کرنے والا،
- ☆ صبر و شکر کرتا ہے،
- ☆ اپنے فقر میں خوش رہتا ہے،
- ☆ طبیعت میں خشونت نہیں،
- ☆ وفا شعار نرم خو ہوتا ہے،
- ☆ کسی کو آزار نہیں پہنچاتا، تہمت تراشی نہیں کرتا، کسی کی ہتک نہیں کرتا،
- ☆ ہنستا ہے تو گلا نہیں پھاڑتا، غصے میں آتا ہے تو خفیف الحرکات نہیں بنتا،
- ☆ اس کا سوال علم حاصل کرنا ہے،
- ☆ اس کا رجوع کرنا سمجھنے کے لیے ہوتا ہے،
- ☆ زیادہ علم اور عظیم الشان حلم والا ہے،

☆ رحم زیادہ کرتا ہے'

☆ بخل سے دُور رہتا ہے'

☆ کام میں جلدی نہیں کرتا' نہ کسی بات سے تنگ دل ہوتا ہے' نہ اتراتا ہے' مصائب کی برداشت میں اس کا نفس چٹان کی طرح سخت ہوتا ہے اور معاش کی سعی میں شہد کی طرح شیریں یعنی کسی کو آزار دینے کا باعث نہیں بنتا' نہ دوسروں کا حق مارتا ہے'

☆ نہ سخت مزاج نہ شیخی باز'

☆ بزرگ طینت ہوتا ہے'

☆ اگر غصہ آئے تو عدل سے کام لیتا ہے'

☆ کچھ مانگا جائے تو نرمی سے کام لیتا ہے'

☆ ہتک نہیں کرتا'

☆ سچی محبت کرتا ہے'

☆ میانہ روی اس کا لباس ہے اور تواضع اس کی رفتار ہے'

☆ عجز و نیاز بندگی اس کا شعار ہے'

☆ ہر حالت میں راضی برضا ہے'

☆ اس کی نیت خالص ہوتی ہے' اس کے عمل میں نہ ریا کاری ہے نہ فریب'

☆ اس کی نگاہ عبرت کی نگاہ ہے'

☆ ظاہر باطن ہر حالت میں ناصح ہے'

☆ علم اس کا دوست' عقل اس کی وزیر' صبر اس کی فوجوں کا سپہ سالار اور عمل منتظم ہے

☆ لغزش اس سے کم ہوگی'

- ☆ اپنی موت کا یقین رکھتا ہے،
- ☆ نفس قناعت خواہ رکھتا ہے،
- ☆ جہالت کا سدِ باب کرتا ہے،
- ☆ اس کا امرِ آخرت آسان ہے،
- ☆ اپنے گناہوں کے تصور سے رنجیدہ ہوتا ہے،
- ☆ اُس کا امرِ دین مستحکم ہوتا ہے،
- ☆ وہ خود رنج اٹھاتا ہے اور لوگ اس سے راحت میں رہتے ہیں،
- ☆ اس کا دُور رہنا محض دین کی مخالفت میں ہوتا ہے اور نزدیکی نرمی اور راحت کے لیئے،
- ☆ وہ پیروی کرتا ہے اُن اصحاب خیر کی، جو اس سے پہلے تھے، لہٰذا وہ پیشوا ہوتا ہے اُپنے بعد آنے والے نیکو کاروں کا۔"

اقبالؒ

کل ساحلِ دریا پہ کہا مجھ سے خضر نے
تو ڈھونڈھ رہا ہے سمِ افرنگ کا تریاق؟
اک نکتہ میرے پاس ہے شمشیر کی مانند
برندہ و صیقل زدہ و روشن و براق
کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق
------------- (ضربِ کلیم)

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن!

افلاک سے ہے اس کی حریفانہ کشاکش
خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن!
جچتے نہیں کنجشک و حمام اس کی نظر میں
جبریل و سرافیل کا صیّاد ہے مومن!
------------ (ضرب کلیم)

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان!
قہّاری و غفّاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان!
ہمسایۂ جبریل امیں بندۂ خاکی
ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشاں!
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن!
قدرت کے مقاصد کا عیار اُس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان!
جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان!
فطرت کا سرودِ ازلی اس کے شب و روز
آہنگ میں یکتا صفتِ سورۂ رحمٰن!
--------------- (ضربِ کلیم)

حرفِ آخر

حضرت علیؓ کا فرمان ہے: ’’اہلِ دنیا کی مثال ایسی ہے کہ قافلہ ابھی اُترا ہی تھا کہ ہنکوے نے چلو چلو کی صدا بلند کر دی۔‘‘

امام غزالیؒ فرماتے ہیں: ’’تو اس دنیا میں آخرت کی طرف چلنے والا ایک مسافر ہے، تیرے سفر کی ابتداء مہد اور انتہا لحد ہے۔ تیری عمر کا ہر برس منزل ہے، ہر مہینہ فرسنگ ہے، ہر دن میل ہے اور ہر سانس قدم ہے۔‘‘

اور یہ منزلیں، یہ فرسنگ، یہ میل اور یہ قدم اتنی جلدی جلدی لپٹتے چلے جاتے ہیں کہ انسان کو پتہ بھی نہیں چلتا اور وہ بڑھاپے کی دہلیز پر آ کھڑا ہوتا ہے جس کے آگے بس موت ہے؟ ---- اور یہ بھی بس اس صورت میں کہ انسان بڑھاپے تک پہنچے ورنہ بسا اوقات اس سے پہلے ہی رختِ سفر باندھ لیا جاتا ہے۔ سید عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں: ’’کیا عجب کہ کل کا دن ایسی حالت میں آئے کہ تو سطحِ زمین سے گم اور قبر کے اندر موجود ہو یا اگلی ساعت ہی میں ایسا ہو جائے!‘‘

سورۂ ملک کی ابتدا میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

’’نہایت بزرگ و برتر ہے وہ جس کے ہاتھ میں کائنات کی سلطنت ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے، جس نے موت اور زندگی کو ایجاد کیا تا کہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔‘‘

ان آیات کی تشریح یوں کی گئی ہے:

"یعنی دنیا میں انسانوں کے مرنے اور جینے کا یہ سلسلہ اُس نے اس لیے شروع کیا ہے کہ اُن کا امتحان لے اور یہ دیکھے کہ کس انسان کا عمل زیادہ بہتر ہے۔ اس مختصر سے فقرے میں بہت سی حقیقتوں کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔

اوّل یہ کہ موت اور حیات اسی کی طرف سے ہے۔ کوئی دوسرا زندگی بخشنے والا ہے نہ موت دینے والا۔

دوسرے یہ کہ انسان جیسی ایک مخلوق، جسے نیکی اور بدی کرنے کی قدرت عطا کی گئی ہے، اس کی نہ زندگی بے مقصد ہے نہ موت۔ خالق نے اسے یہاں امتحان کے لیے پیدا کیا ہے۔ زندگی اس کے لیے امتحان کی مہلت ہے اور موت کے معنی یہ ہیں کہ اس کے امتحان کا وقت ختم ہو گیا۔

تیسرے یہ کہ اسی امتحان کی غرض سے خالق نے ہر ایک کو عمل کا موقع دیا ہے تاکہ وہ دنیا میں کام کر کے اپنی اچھائی یا برائی کا اظہار کر سکے اور عملاً یہ دکھا دے کہ وہ کیسا انسان ہے۔

چوتھے یہ کہ خالق ہی دراصل اس بات کا فیصلہ کرنے والا ہے کہ کس کا عمل اچھا ہے اور کس کا بُرا۔ اعمال کی اچھائی اور بُرائی کا معیار تجویز کرنا امتحان دینے والوں کا کام نہیں بلکہ امتحان لینے والوں کا کام ہے۔ لہٰذا جو بھی امتحان میں کامیاب ہونا چاہے اُسے یہ معلوم کرنا ہوگا کہ ممتحن کے نزدیک حسنِ عمل کیا ہے۔

پانچواں نکتہ خود امتحان کے مفہوم میں پوشیدہ ہے اور وہ یہ کہ جس شخص کا جیسا عمل ہوگا، اس کے مطابق اس کی جزا دی جائے گی کیونکہ اگر جزاء نہ ہو تو سرے سے امتحان لینے کے کوئی معنی ہی نہیں رہتے۔ (تفہیم القرآن، جلد ۶، صفحہ ۴۲، ۴۳)

ایک عقل مند طالب علم کبھی امتحان کے کمرے میں بیٹھ کر اور پرچہ سامنے رکھ کر سونے کی یا دوسرے طالب علموں سے باتیں کرنے کی یا میز بجا بجا کر گانے کی کوشش نہیں کرے گا۔ پرچہ کرنے کے لیے جو وقت اسے ملا ہے وہ اتنا تھوڑا ہے اور اس امتحان کے نتیجے میں جو ڈگری اسے ملنی ہے، وہ اتنی بڑی ہے کہ وہ اس مختصر سے وقت کا ایک ثانیہ بھی ضائع نہیں کر سکتا!

مگر انسان ایسا احمق طالب علم ہے کہ پرچہ سامنے کھلا ہے مگر وہ کبھی غفلت کی گہری نیند میں خراٹے لینے لگتا ہے، کبھی بے کار لایعنی مصروفیات میں وقت کا خون کرتا ہے اور کبھی لہو ولعب میں غرق ہو کر سب کچھ بھول جاتا ہے۔ اب پرچہ کرنے کی مہلت تو اتنی ہی ہے جتنی معین ہو چکی۔ اگر یہ امتحان دینے والا اپنا وقت بے کار ضائع کر دے گا تو وہ خود ہی نقصان اُٹھائے گا، کیونکہ نگران تو عین وقت پر ان سے پرچہ چھین لے گا چاہے اس میں ایک لفظ بھی نہ لکھا گیا ہو۔ پھر اس لاپروا اور نالائق طالب علم کا جو انجام ہوگا، وہ ظاہر ہے۔

انسان کو اس نقصان دہ انجام سے بچانے کے لیے اسے بار بار تنبیہہ کی گئی ہے کہ وہ اس وقفۂ زندگی کو غنیمت جانے اور جتنی بھی نیکی سمیٹ سکتا ہے سمیٹ لے۔ خصوصاً جب زندگی میں تندرستی اور فرصت حاصل ہو اس وقت تو اور بھی زیادہ نیک اعمال کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ کیا پتہ کب بیماری آ دبوچے یا کوئی مصروفیت اس طرح اپنے آپ میں الجھا لے کہ انسان بے بس ہو کر رہ جائے۔

حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دو نعمتیں ایسی ہیں جن میں اکثر لوگ فریب کھاتے ہیں (اور نتیجتاً نقصان اٹھاتے ہیں) ایک صحت اور دوسری فراغت۔ (ترمذی)

تندرستی اور فرصت کی طرح راحت اور عافیت بھی انسان کو نیک اعمال کے لیے

مواقع بہم پہنچاتی ہیں، مگر افسوس کہ انہیں دو کو لوگ زیادہ تر بدکرداریوں کا سبب بنا لیتے ہیں۔

سورۂ یونس آیت ۲۱ میں ارشاد ہوا ہے:

"(لوگوں کا حال یہ ہے کہ) مصیبت کے بعد جب ہم اُن کو رحمت کا مزا چکھاتے ہیں تو فوراً ہی وہ ہماری نشانیوں کے معاملے میں چالبازیاں شروع کر دیتے ہیں......"

عموماً دیکھا جاتا ہے کہ مصیبت کے وقت انسان نیکوکاری کی طرف زیادہ مائل ہو جاتا ہے مگر جیسے ہی راحت نصیب ہوئی سب کچھ بھولا بسرا ہو گیا۔ حضرت علیؑ کا فرمان ہے:

"بہت سے لوگ تو وہ ہیں جو احسان اور نعمتوں کی وجہ سے جہنم کے قریب ہو رہے ہیں۔ بہت سے وہ ہیں جو گناہوں کے پوشیدہ رہنے سے جری ہو گئے ہیں، اور بہت سے وہ ہیں جو نیک نامی کے سہارے فتنہ و فساد کر رہے ہیں۔"

نیز آپؑ کا فرمان ہے کہ: "بہت سے دولت مند اور قسمت والے ایسے ہیں جو آہستہ آہستہ عذاب کی طرف بڑھ رہے ہیں۔"

یہ تنبیہات انسان کو ہدایت دے رہی ہیں کہ وہ صحت، فرصت، راحت اور امن کو غنیمت سمجھے اور اپنے لیے زیادہ سے زیادہ بھلائی سمیٹ لے حضرت علیؑ ہی کا فرمان ہے کہ:

"راحت کے زمانے میں اسی طرح عمل کرو جس طرح انسان خوف اور دہشت کے زمانے میں کرتا ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے انبیاء بھی اسی لیے بھیجے تھے کہ وہ انسانوں کو خدا کا پیغام دیں اور اُن کے نفوس کا تزکیہ کریں۔

سورۃ البقرہ میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ خانہ کعبہ کی دیواریں اُٹھا رہے تھے تو ساتھ ساتھ خدا سے دعائیں بھی کرتے جا رہے تھے،

جن میں ایک دعا یہ تھی:

"اے ہمارے رب، ان لوگوں میں خود انہی کی قوم سے ایک رسول اُٹھائیو جو انہیں تیری آیات سنائے، ان کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دے اور ان (کے نفوس) کا تزکیہ کرے۔ بے شک تو بڑا زبردست، بڑا دانا ہے۔" (البقرہ:۱۲۹)

اسی سورہ کی آیات ۱۵۰، ۱۵۱ میں بیان ہوا ہے:

"...... میرے اس حکم کی پیروی سے تم اسی طرح فلاح کا راستہ پاؤ گے جس طرح (تمہیں اس چیز سے فلاح نصیب ہوئی کہ) ہم نے تمہارے درمیان خود تم میں سے ایک رسول بھیجا جو تمہیں ہماری آیات سناتا ہے، تمہارا تزکیہ کرتا ہے، تمہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم نہ جانتے تھے۔"

حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں: "میں چار چیزوں میں خدا کی بندگی کا لطف اٹھاتا ہوں۔

۱۔ خدا کے عائد کردہ فرائض کی ادائیگی میں،
۲۔ اُن چیزوں سے بچنے میں جنہیں خدا نے حرام قرار دیا ہے،
۳۔ اس اُمید پر نیک کام کرنے میں کہ خدا تعالیٰ اس کا اجر دے گا،
۴۔ خدا کی ناراضگی سے بچ کر بُرے کام ترک کرنے میں۔"

ابوتراب بخشیؒ فرماتے ہیں: "گناہ کرنے سے انسان کا دل سیاہ ہو جاتا ہے دل کی سیاہی کی تین علامتیں ہیں:

۱۔ گناہ سے دل نہ گھبرائے،
۲۔ اطاعت کی طرف دل مائل نہ ہو،
۳۔ دل پر نصیحت کا اثر نہ ہو۔"

سید عبدالقادر جیلانیؒ ارشاد فرماتے ہیں: ''مخلوق تین قسم کی ہے۔ فرشتہ، شیطان، انسان۔ فرشتہ تو سرتاپا خیر ہے اور شیطان سرتاپا شر اور انسان مخلوط ہے، کہ خیر بھی رکھتا ہے اور شر بھی، پھر جس پر خیر غالب ہو وہ فرشتوں سے جا ملتا ہے اور جس پر شر غالب ہو، وہ شیطان سے۔''

تزکیۂ نفس کے سلسلے میں ایک خاص بات کو یاد رکھنا مفید ہوگا کہ اگر کسی وقت انسان اپنی کسی اصلاحی کوشش میں ناکام بھی رہ جائے تو بھی اس عمل نیک کو کرنے کی نیت دل میں ضرور رکھے۔ یہ نیک نیتی خود باعثِ ثواب ہوگی۔ بعض اوقات انسان کسی عمل نیک کے کرنے کا بہت اشتیاق رکھتا ہے مگر حالات کی سختی اُسے اجازت نہیں دیتی، تاہم اگر وہ دل میں اس کی نیت رکھے گا کہ یہ کام کرنا ہے تو خدا اسے اس نیت ہی کی بناء پر ثواب عطا کر دے گا۔ بخاری میں ایک حدیث بیان ہوئی ہے کہ ایک دفعہ حضورؐ کو عشاء کی نماز کے لیے آنے میں اتنی دیر ہوگئی کہ نصف شب آ گئی۔ پھر آپؐ تشریف لائے اور نماز پڑھائی اور ساتھ ہی صحابہ کرامؓ کو یہ خوش خبری بھی سنائی کہ تم جتنی دیر یہاں بیٹھے نماز کا انتظار کرتے رہے تمہیں نماز ہی میں سمجھا گیا۔

اسی بناء پر خواجہ حسن بصریؒ فرماتے تھے: ''جب تک لوگ نیکی کرنے کے منتظر رہتے ہیں، وہ اس نیکی کو کرنے کا ثواب پاتے رہتے ہیں۔''

انسان کے گناہ ہوں یا ثواب، اپنے پیچھے اثرات ضرور چھوڑ جاتے ہیں۔ پھر اس کے دنیا سے چلے کے جانے کے بعد بھی اس کے اچھے اثرات اس کی بخشش اور اس کے درجات کی بلندی کا بندوبست کرتے رہتے ہیں اور اس کے بُرے اثرات اس کے لیے گناہ اور عذاب اکٹھا کرتے رہتے ہیں۔

حضرت ابوبکرؓ کا فرمان ہے کہ: ''بدبخت ہے وہ شخص جو خود مر جائے مگر اُس کا

گناہ نہ مرے۔‘‘

مرے ہوئے شخص کے گناہ زندہ رہنے کی یہی صورت ہوتی ہے کہ وہ کوئی ایسا بُرا عمل کر گیا ہوتا ہے جس سے لوگ بُرائی سیکھتے چلے جاتے ہیں اور ہر سیکھنے والے کے گناہ میں سے اُس آغاز کرنے والے کو حصہ ملتا رہتا ہے۔

مثال کے طور پر کوئی مصنف کوئی گمراہ کُن کتاب لکھ جائے۔ اب وہ خود تو مر جائے گا مگر جب تک کتاب موجود رہے گی اور لوگ اُسے پڑھ پڑھ کر گمراہی سیکھتے رہیں گے، مصنف کو اس کے حصے کا گناہ پہنچتا رہے گا۔

بہت سے تن آسان لوگ نیکی سے اس لیے گھبراتے ہیں کہ اس میں مشقت اٹھانی پڑتی ہے اور اکثر بُرائی پسند برائی کا ارتکاب اس لیے کرتے ہیں کہ اس میں انہیں ایک ناپاک لذت ملتی ہے۔ حالانکہ اوّل الذکر کی مشقت بھی ختم ہو جاتی ہے مگر ثواب ہمیشہ کے لیے باقی رہ جاتا ہے اور آخر الذکر کی لذت بھی فنا ہو جاتی ہے مگر گناہ ہمیشہ کے لیے روح کو چمٹ جاتا ہے۔

حضرت علیؓ کا فرمان ہے: ’’ایسے دو عملوں میں کتنا فرق ہے، ایک وہ عمل جس کی لذت تو ختم ہو جائے گی مگر بھگتنا باقی رہے گا اور دوسرا وہ عمل جس کی زحمت تو ختم ہو جائے گی مگر ثواب باقی رہے گا۔‘‘

آخر میں اس بات کو ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ اس دنیوی زندگی میں انسان محسوس ہونے والی چیزوں سے اس بُری طرح گھرا ہوا ہے کہ بہت سے لوگوں کو تو غیر محسوس آخرت کے بارے میں سوچنے کی فرصت بھی نہیں ملتی۔ اس خرابی کو رفع کرنے کے لیے ذکر و دعا کا شغل حتی الامکان جاری رہنا چاہیے اور ذکر بھی حتی الامکان اس طرح کیا جائے جس طرح کہ ذکر کرنے کا حق ہے یعنی خشوع و خضوع کے ساتھ پوری توجہ کو مرکوز کر کے۔ یہ توجہ بھی

پورے طور پر انسان کے بس میں آجانے والی شے نہیں ہے۔ تاہم جتنا ہو سکے عبادت میں دل لگایا جائے اور اپنی راہ کی مشکلات کی آسانی کے لیے التجائیں کی جاتی رہیں۔ جناب حسن البناء شہیدؒ اپنے ساتھیوں کو تلقین کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”اللہ کی الوہیت ہر وقت آپ کے ذہن پر چھائی رہنی چاہیے۔ آخرت کو یاد رکھیے اور اس کے لیے تیاری کیجئے۔ رضائے الٰہی کے حصول کی خاطر سلوک کے مراحل ہمت واستقلال سے طے کیجئے۔ نفل عبادات کے ذریعے خدا کا قرب حاصل کیجئے۔ رات کے وقت نفل پڑھیے۔ ہر مہینے میں کم از کم تین روزے رکھیے۔ دل اور زبان سے اللہ کا ذکر کرتے رہیے اور منقولہ دعائیں ہر وقت نوک زبان رکھیے۔“

❁ ❁ ❁

تزکیۂ نفس کے لیے دُعائیں

(۱)

☆ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ج اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ○

”اے ہمارے رب، ہمارے دلوں کو ہدایت دینے کے بعد گمراہی کی طرف نہ پھیر دینا اور ہمیں اپنے ہاں سے رحمت عطا کرنا، بے شک تو ہی ہے بہت بڑا عطا کرنے والا۔“

(۲)

☆ رَبَّنَا اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ○

”اے ہمارے رب ہم پر صبر انڈیل دے اور ہمارے قدم جمائے رکھ اور ہمیں کافر لوگوں پر غلبہ عطا کر۔“

(۳)

☆ رَبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا○

”اے میرے رب مجھے زیادہ علم عطا فرما۔“

(۴)

☆ رَبِّ اَعُوْذُبِکَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّیٰطِیْنِ o وَاَعُوْذُبِکَ رَبِّ اَنْ یَحْضُرُوْنِ o

”اے میرے رب میں تیری پناہ چاہتا ہوں شیطانوں کی چھیڑ سے اور تیری پناہ چاہتا ہوں، اے میرے رب، اس سے کہ وہ میرے پاس آئیں۔“

(۵)

☆ اَللّٰهُمَّ اٰتِ نَفْسِیْ تَقْوٰهَا وَزَكِّهَآ اَنْتَ خَیْرُ مَنْ زَكّٰهَا اَنْتَ وَلِیُّهَا وَمَوْلٰاهَا o

”اے اللہ، میرے نفس کو پرہیزگاری دے اور اُسے پاک کر۔ تو ہی اُسے سب سے بہتر پاک کرنے والا ہے۔ تو ہی اس کا مالک اور اس کا آقا ہے۔“

(٦)

☆ اَللّٰهُمَّ اهْدِنِیْ وَسَدِّدْنِیْ o

”یا اللہ مجھ کو ہدایت دے اور مجھے استوار رکھ۔“

(۷)

☆ اَللّٰهُمَّ مُصَرِّفَ الْقُلُوْبِ صَرِّفْ قُلُوْبَنَا عَلٰی طَاعَتِکَ o

”اے اللہ، دلوں کو پھیرنے والے، پھیر دے ہمارے دل اپنی طاعت کی طرف۔“

(۸)

☆ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ الْھُدٰی وَالتُّقٰی وَالْعَفَافَ وَالْغِنٰیO

''اے اللہ' میں مانگتا ہوں تجھ سے ہدایت اور پرہیزگاری اور پارسائی اور سیر چشمی۔''

(۹)

☆ رَبِّ اجْعَلْنِیْ لَکَ ذَکَّارًا لَّکَ شَکَّارًا لَّکَ رَھَّابًا لَّکَ مِطْوَاعًا لَّکَ مُطِیْعًا اِلَیْکَ مُخْبِتًا اِلَیْکَ اَوَّاھًا مُّنِیْبًاO

''اے میرے رب' مجھے ایسا کر دے کہ میں تجھے بہت یاد کیا کروں' تجھ سے بہت ڈرا کروں' تیری بہت فرمانبرداری کیا کروں' تیرا بہت مطیع رہوں' تجھی سے سکون پاؤں' تیری ہی طرف توجہ کروں (تیری ہی طرف) راجع رہوں۔''

(۱۰)

☆ رَبِّ تَقَبَّلْ تَوْبَتِیْ وَاغْسِلْ حَوْبَتِیْ وَاَجِبْ دَعْوَتِیْ وَثَبِّتْ حُجَّتِیْ وَسَدِّدْ لِسَانِیْ وَاھْدِ قَلْبِیْ وَاسْلُلْ سَخِیْمَةَ صَدْرِیْO

''اے میرے رب' میری توبہ قبول کر اور میرے گناہ کو دھو دے اور میری دعا قبول کر اور میری حجت کو قائم رکھ اور میری زبان کو راست رکھ اور میرے دل کو ہدایت دے اور میرے سینے کی کدورت کو نکال دے۔''

(۱۱)

☆ اَللّٰھُمَّ قِنِیْ شَرَّ نَفْسِیْ وَاعْزِمْ مُرْلِیْ عَلٰی رُشْدِ اَمْرِیْO

''اے اللہ محفوظ رکھ مجھے میرے نفس کی برائی سے اور ہمت دے مجھے اپنے کام کی

اصلاح پر۔"

(۱۲)

☆ اَللّٰھُمَّ اَلْھِمْنِیْ رُشْدِیْ o "اے اللہ! ڈال دے میرے دل میں میری ہدایت۔"

(۱۳)

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ فِیْ قَلْبِیْ نُوْرًا وَّفِیْ بَصَرِیْ نُوْرًا وَّفِیْ سَمْعِیْ نُوْرًا وَّعَنْ یَّمِیْنِیْ نُوْرًا وَّعَنْ شِمَالِیْ نُوْرًا وَّخَلْفِیْ نُوْرًا وَ مِنْ اَمَامِیْ نُوْرًا وَّاجْعَلْ لِّیْ نُوْرًا وَّفِیْ عَصَبِیْ نُوْرًا وَّفِیْ لَحْمِیْ نُوْرًا لاَّ فِیْ دَمِیْ نُوْرًا وَّفِیْ شَعْرِیْ نُوْرًا وَّفِیْ بَشَرِیْ نُوْرًا وَّفِیْ لِسَانِیْ نُوْرًا وَاجْعَلْ فِیْ نَفْسِیْ نُوْرًا وَّاَعْظِمْ لِیْ نُوْرًا وَّاجْعَلْنِیْ نُوْرًا وَّاجْعَلْ مِنْ فَوْقِیْ نُوْرًا وَّمِنْ تَحْتِیْ نُوْرًا اَللّٰھُمَّ اَعْطِنِیْ نُوْرًا o

"اے اللہ! کر دے میرے دل میں نور اور میری بینائی میں نور اور میری شنوائی میں نور اور میری داہنی طرف نور اور میری بائیں طرف نور اور میرے پیچھے نور اور میرے آگے نور اور کر دے میرے لیے ایک خاص نور، اور (کر دے) میرے پٹھوں میں نور اور میرے گوشت میں نور اور میرے خون میں نور اور میرے بالوں میں نور اور میرے پوست میں نور اور میری زبان میں نور اور کر دے میری جان میں نور اور دے مجھے نور عظیم اور کر دے مجھے سراپا نور اور کر دے میرے اُوپر نور اور میرے نیچے نور، یا اللہ عطا کر مجھے نور۔"

* * *

1 - کیا ہماری زندگی میں اچھے اور صالح لوگوں کی صحبت کی ضرورت

2. تزکیہ نفس کیلئے احساس جوابدہی کیا اہمیت رکھتی ہے ؟

3. اگر مسلمان تبلیغ دین کے سلسلے میں لوگوں کو نیکی کا حکم
نہ دینگے اور برائی سے نہیں روکیں گے تو دنیا میں اسکے اثرات
4 . کیا ہونگے ؟ اور اُخروی اثرات کیا ہونگے ۔

[illegible] Asghar
9[illegible]3024

حضرت علی رض کا قول۔ تیرے نفس کی قیمت جنت ہے
پس تو اسے جنت کے عوض بیچ دے